URDU MAIN SALAAM GOYI KI RIWAYATH

BY

SYEDA ZAHRA BEGUM

Indira Gandhi Memorial Library
Acc. No.....
Dated .. ...
University of Hyderabad-134.

THESIS SUBMITTED TO UNIVERSITY OF HYDERABAD
FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. MOHD. ANWARUDDIN
HEAD
DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD

URDU MAIN SALAAM GOYI KI RIWAYATH

BY

SYEDA ZAHRA BEGUM

Indira Gandhi Memorial Library
Acc. No.....
Dated .. ...
University of Hyderabad-134.

THESIS SUBMITTED TO UNIVERSITY OF HYDERABAD
FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. MOHD. ANWARUDDIN
HEAD
DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD

Name of the Research Scholar :: SYEDA ZAHRA BEGUM
M.A.,M.Phil.

Department/Centre :: Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad

This is to certify that I, SYEDA ZAHRA BEGUM have carried out the Research embodied in the present thesis entitled : URDU MAIN SALAAM GOYI KI RIWAYAT' for the full period prescribed under the Ph.D. ordinances of the University.

I declare that no part of this thesis was earlier submitted for the award of any Research Degree or Diploma to any University.

Hyderabad:
Date 21-11-1994.

Zahra
(Research Scholar)
SYEDA ZAHRA BEGUM

M. Anwar
(Research Supervisor)
Dr. MOHD. ANWARUDDIN
Head Dept. of Urdu
University of Hyderabad
HYDERABAD-500 134.

Head
Department of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad 500 001.

M. Anwar
(Head of the Dept.)
Dr. MOHD. ANWARUDDIN
Head
Department of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad 500 001.

(Dean of the School 0
SCHOOL OF HUMANITIES
DEAN
SCHOOL OF HUMANITIES,
University of Hyderabad,
Hyderabad-500 134

اردو فہرست

سلام کوئی کی روایت

مقالہ

برائے پی ایچ ڈی اردو

مقالہ نگار

سیدہ زہرا بیگم

یونیورسٹی آف حیدرآباد

ڈاکٹر محمد انور الدین

صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

فہرست

ابتدائیہ ۱۔ ح

باب اوّل :۔ ۱ — ۴۹

اردو کی شعری اصناف :۔ صنفی خصوصیات
محرکات و موضوعات ۔ سلام کی تعریف ۔ سلام کے موضوعات
دوسری زبانوں کے ادب میں سلام سے مماثل اصناف ۔
اردو میں سلام کی امتیازی خصوصیات

باب دوّم :۔ ۵۰ — ۱۰۸

سلام کے ابتدائی نمونے ۔ دکنی سلام سترھویں صدی تک
سلام کی زمرہ بندی ۔ نعتیہ سلام ۔ منقبتی سلام ۔ کربلائی سلام
امتیازی خصوصیات

باب سوّم :۔ ۱۰۹ — ۱۹۴

سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک دکن
میں سلام گوئی کی روایت ۔ دہلی پر دکن کے اثرات ۔ درگاہ قلی کے سلام
دہلی میں سلام کی نوعیت ۔ یکرنگ ۔ مسکین ، ضاحک ، سکندر
سودا ، میر وغیرہ کی سلام گوئی ۔ دور تشکیل ۔ ایک جائزہ

باب چہارم :۔ ۱۹۵ — ۲۶۹

انیسویں صدی میں سلام گوئی ۔ دور تعمیر
حیدری ، گدا ، افسردہ ، خلیق ، فصیح ، ضمیر اور دلگیر کے سلام
ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کے سلام

باب پنجم :— ۲۷۰ - ۳۷۲

دور عروج :- انیس، دبیر، مونس، میر انس
نفیس، عشق، تعشق، پیارے صاحب رشید، میاں مشیر
مداح، کامل اور وحید کے سلام - ایک جائزہ -

باب ششم :— ۳۷۳ - ۴۲۴

بیسویں صدی میں سلام گوئی -

نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کا احیاء - اسیر، داغ، امیر کے سلام کی روایت
اقبال کا انداز ایک اجتہاد
مسرور، شہید یار جنگ شہید اور آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں عثمان کے سلام

باب ہفتم :— ۴۲۵ - ۵۳۰

دور جدید کے شعراء
نجم آفندی، جوش، آل رضا، جمیل مظہری، احسان دانش
ماہر القادری، برق موسوی، شاہد صدیقی، شجیع، باقر امانت خانی
وحید اختر اور احمد فراز کے سلام
غزل پر اثرات

اختتامیہ ۵۳۱ - ۵۳۷

کتابیات ۵۳۸ - ۵۴۷

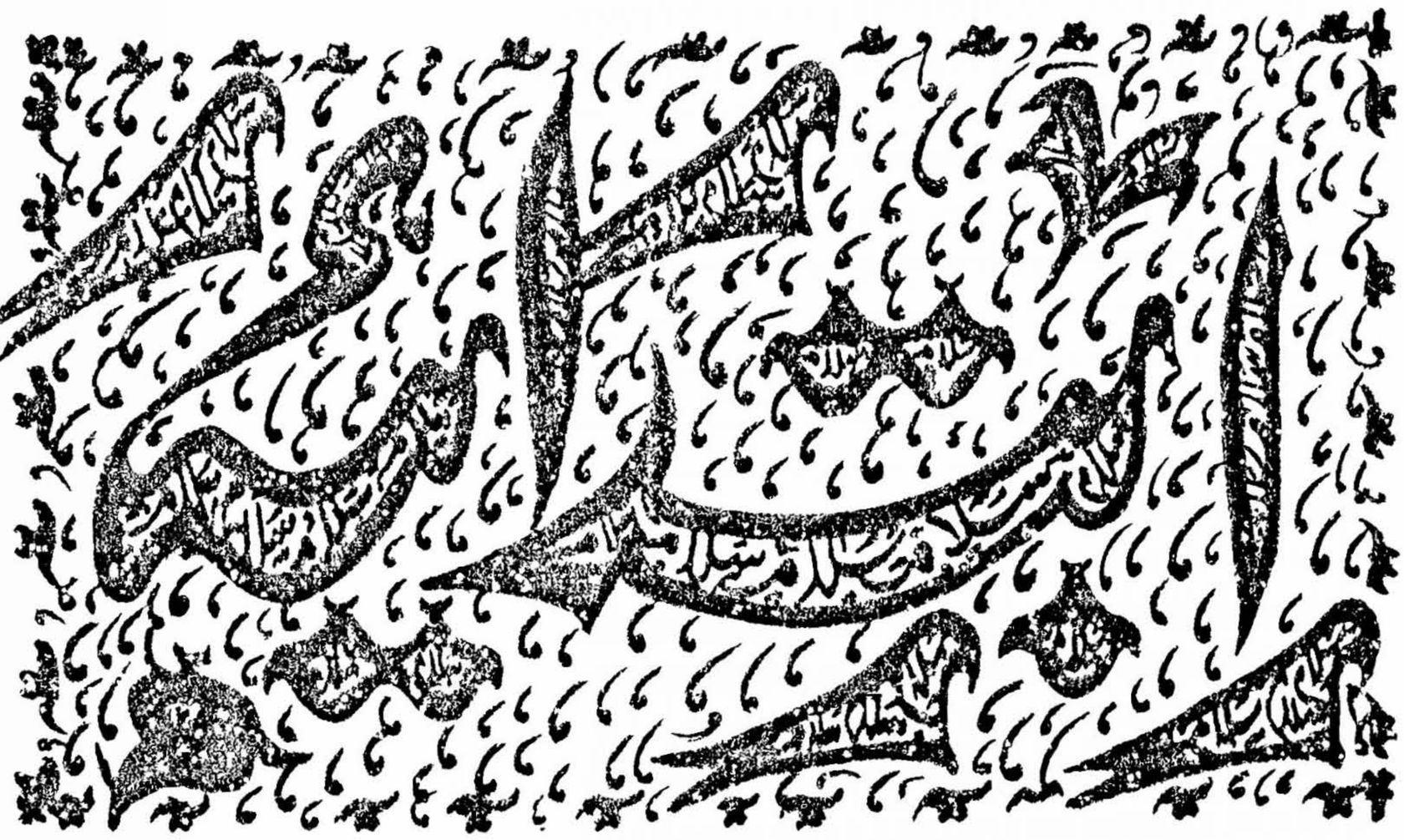

۱۹۹۴ء

اردو میں رثائی شاعری کے عنوان سے کافی مواد ملتا ہے جس کا دامن کافی وسیع ہے۔ رثائی شاعری میں سلام، مرثیہ اور نوحہ جیسی اصناف شامل ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ صنفِ مرثیہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں اور یہ ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن صنفِ سلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی سوائے چند چیدہ چیدہ مضامین کے اور علی جواد زیدی کا مقدمہ "انیس کے سلام" میں ملتا ہے۔ اگر یہ مقدمہ ہی مستقل اور جامع ہوتا جیسے حالی کا 'مقدمۂ شعر و شاعری' تو اردو ادب میں ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا اس کمی کو راقمۃ الحروف نے اس وقت محسوس کیا جبکہ وہ اپنا ایم۔فل کا تحقیقی مقالہ "حیدر آباد میں مرثیہ آزادی کے بعد" کے عنوان سے لکھ رہی تھی۔ دورانِ تحقیق یہی اندازہ قائم کیا گیا کہ بہت سارے سلام ملتے ہیں۔ جسے ابتدائی دور میں مرثیے کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ سلام کو کوئی ایسا نقاد نہ ملا جو صنف کی حیثیت سے اسے اردو ادب میں شناخت کرواتا۔ نہ ہی کوئی محمد حسین آزاد جیسا نقاد میسّر ہوا جو سلام کا کسی حد تک جائزہ لیتا، اور نہ ہی حالی جیسا صالح نقاد ملا جو ادبی صنف کی حیثیت سے متعارف کرواتا۔ یہ اردو سلام کی نہیں بلکہ ان نقادوں کی محرومی ہے کہ وہ ایسی پاک و پاکیزہ صنف تک نہ پہنچ پائے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس صنف تک پہنچنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن انھیں منزلِ مقصود نہ ملی اور وہ سنگِ میل کو ہی منزل سمجھ بیٹھے اور سلام جیسی پاک و مقدس صنف

کے سلسلے میں خلطِ مبحث کیا۔ اسے صنفِ غزل سے متاثر قرار دیا۔ جبکہ مولانا شبلی نعمانی کی عبارت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سلام گویا مرثیے کی ذیلی قسم ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا اہلِ لکھنؤ کے سر ہے۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ درست نہیں۔

پدم شری علی جواد زیدی نے بھی انیسؔ کے سلام کے مقدمہ میں سرزمینِ دکن کی طرف توجہ ہی نہیں کی جب کہ دکن کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اردو شعر و ادب کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اور یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اردو سلام گوئی کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ مرثیہ ہو یا سلام میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے ان اصناف میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ ان اصناف کا اور انیسؔ و دبیرؔ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا جانے لگا اور یہ سحر تا حال سر بر قرار ہے چنانچہ صنفِ سلام پر جو چیدہ چیدہ مضامین لکھے گئے اس میں اسی نظریئے کو پیشِ نظر رکھا گیا۔

شیخ چاند نے اپنے گراں قدر تحقیقی مقالے میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ سلام صرف واقعاتِ کربلا یا اخلاقی مضامین تک کبھی محدود نہیں رہا۔ سلام کا تعلق بے شک مذہب سے ہے اور اس کا نقطۂ آغاز سرکارِ ختمی مرتبت کی ذاتِ گرامی کے حضور میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہے۔ دوسرے بزرگانِ دین کی شان میں بھی سلام لکھے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ابتداء میں بھی ان کی ہیئت متعین نہیں تھی اور نہ ابھی تک ہو سکی۔

بے شک شیخ چاند کے نظریات حقیقت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے شبلی نعمانی کے بیان کی تردید کی ہے کہ سلام کا آغاز غزل کے زیرِ اثر نہیں ہوا لیکن اس کے

آغاز سے متعلق کوئی قیاس آرائی نہیں کرتے اور نہ ہی شبلی نعمانی کے ان خیالات کی تردید کرتے ہیں کہ سلام کا آغاز لکھنو کے مرثیہ گو شعراء کے ہاتھوں ہوا۔ لہذا تشنگی برقرار رہی۔

امداد امام اثر بھی صنف سلام کی تعریف اور اس کے موضوعات کی وضاحت کرنے کے لئے غزل کا سہارا لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سلام میں وہی غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین باندھے جاتے ہیں لیکن اس میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔

امداد امام اثر کا نظریہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن انھوں نے سلام کی تعریف اور موضوعات پر جامع بحث نہیں کی۔ علی جواد زیدی نے صنف سلام پر اپنے مقدمہ "انیس کے سلام" میں مختصر اور جامع بحث کی ہے لیکن موصوف نے بھی سلام کے آغاز کے سلسلے میں سرزمین دکن کا کوئی ذکر نہیں کیا اور جو سلام کے نمونے پیش کئے وہ شمالی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعد ازاں رسالہ "العلم" کے مرثیہ و سلام نمبر میں انھوں نے صرف ایک دکنی شاعر دردی کا تذکرہ کیا جو دسویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں "انیس کے سلام" کا مقدمہ ہونے کی وجہ موصوف نے صرف رثائی سلاموں کو ہی موضوع بحث قرار دیا۔

ان حقائق کی روشنی میں راقمۃ الحروف نے یہ ضروری سمجھا کہ دکن میں بھی سلام گوئی کا جائزہ لیا جائے اور رثائی سلام کے علاوہ نعتیہ اور منقبتی سلام کا بھی تحقیقی جائزہ لیا جائے اور سلام کی شناخت اردو ادب میں بحیثیت صنف کروائی جائے۔ اور اس پاک و پاکیزہ صنف کی روایت پر روشنی ڈالی جائے۔

چنانچہ ابتداء سے دور حافر تک اس صنف کی مستحکم روایت کو پیش کرنا

راقمۃ الحروف کا مقصود تھا۔ زیر نظر مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے

پہلے باب میں اردو کی شعری اصناف اور صنفی خصوصیات و موضوعات کا جائزہ لیتے ہوئے صنف سلام کا تفصیلی تعارف کروایا گیا ہے اور اس کے موضوعات کی وضاحت کرتے ہوئے سلام کو موضوعی صنف قرار دیا گیا۔

دوسرے باب میں سلام کے ابتدائی نمونے پیش کئے گئے جو دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان نمونوں میں ہر قسم کے سلام دستیاب ہوئے چنانچہ سلام کی زمرہ بندی کرتے ہوئے انھیں نعتیہ، منقبتی اور کربلائی سلام کے نام دیئے گئے جو سترھویں صدی تک احاطہ کرتے ہیں۔

مقالے کے تیسرے باب میں سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک دکن میں سلام گوئی کی روایت کو پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں دہلی پر دکن کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دمگاہ قلی کے سلام پیش کئے گئے۔ بعد ازاں مسکین، ضاحک، سکندر، میر اور سودا کی سلام گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے اس عہد کو سلام گوئی کا تشکیلی دور قرار دیا گیا۔

چوتھے باب میں سلام گوئی کے دور تعمیر کا جائزہ لیتے ہوئے گدا، حیدری، فصیح، دلگیر، ضمیر کو معمار قرار دیا گیا۔ اس ضمن میں ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کے بھی سلام پیش کئے گئے۔

پانچویں باب میں انیس، دبیر، مونس، آتش، نفیس اور دبستان عشق کے شعراء عشق، اور تعشق اور پیارے صاحب رشید کی سلام گوئی کا جائزہ لیا گیا لہذا یہ دور سلام گوئی کا دور عروج قرار پایا۔

چھٹے باب میں بیسویں صدی میں سلام گوئی کا احیاء کرتے ہوئے اسیر، داغ، اور امیر کے سلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور علامہ اقبال کے انداز پر روشنی ڈالی گئی۔ مسرور اور شہید، عثمان کے سلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں

ساتویں اور آخری باب میں دور جدید کی سلام گوئی کے رجحان کو پیش کرتے ہوئے طرز جدید کے شعراء نجم آفندی، جوش، آل رضا، جمیل مظہری احسان دانش، ماہر القادری، برق موسوی، شاہد صدیقی اور شجیع کے سلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

عصر حاضر میں سلام گوئی کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے باقر امانت خانی، ڈاکٹر وحید اختر اور احمد فراز کی سلام گوئی کا جائزہ لیا گیا اور غزل پر سلام کے اثرات کی نشاندہی کی گئی۔

مقالے کے سلسلے میں سب سے پہلے تو میں ذات باری کا شکر ادا کرتی ہوں جو احسن الخالقین ہے اور جس نے جہاں تمام مومنین کو سرکار دو عالم اور ان کی آل پر سلام بھیجنے کا حکم دیا ہے اور وہیں پر مجھے یہ توفیق عطا فرمائی۔ پھر ذوات مقدسہ کی خدمت میں خلوص دل کے ساتھ نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہوں جن سے صنف سلام وابستہ ہے۔

میرے والدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت میں اس کا خیال رکھا کہ عقائد کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی بھی آبیاری ہوتی رہے۔ میں ان کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ الفاظ میں وہ قوت نہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔

میرا گھر جو دوسروں کی نظر میں میرا سسرال ہے لیکن درحقیقت میرے لئے میکہ۔ اس گھر کے تمام افراد کے برتاؤ بالخصوص رونق بھائی کی ہمت افزائی اور ہمدردانہ مشورے، ریاض بھابی کی علمی رہنمائی اور مفید مشوروں کی وجہ سے میرے مقالے کا کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ میں ان تمام کی ممنون ہوں۔ اس سلسلے میں بچوں کی شخصیت کو بھی بھلا! نہیں جا سکتا کہ جنھوں نے مجھے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی مہلت دی۔ اس کے علاوہ بہن لیاقت النساء بیگم کی بے پایاں خلوص و محبت کی ممنون ہوں کہ اس منزل تک پہنچنے میں ان کا بھی کافی حصہ رہا ہے

میرے شریک زندگی مرزا اسد علی بیگ کے تعاون کے بغیر اس مقالے کا تصور بھی محال تھا۔ ہر کٹھن منزل پر وہ میرے ساتھ رہے اور ہمت افزائی کرتے ہوئے حقِ رفاقت ادا کیا۔ ان کے مخلصانہ مشورے، اخلاقی ہمدردی اور تعاون کے باعث ہی میں منزلِ مقصود کو پا سکی۔

اس مقالے کے نگراں ڈاکٹر محمد انور الدین صدر شعبۂ اردو کی علم دوستی، مخلصانہ اور ہمدردانہ مزاج سے انکار ناممکن ہے۔ مقالے

کے سلسلے میں پرخلوص توجہ، مفید مشوروں اور حوصلہ افزائی کے لئے میں موصوف کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔

بحیثیت صدر شعبہ بھی موصوف کی عالمانہ رہبری اور رہنمائی کا بھی اعتراف کرتی ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابتداء میں اس مقالے کے نگراں استاد الاساتذہ ڈاکٹر سید جاوید حسین رضوی رہے ہیں جن کی عالمانہ شخصیت میری صلاحیتوں کو ابھارنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی

صنف سلام مشفق استاد محترم کا محبوب موضوع ہے۔ مجھے فخر ہے کہ انکی نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ قدم قدم پر انکی رہنمائی اور مشوروں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح مقالے کا تقریباً کام سوائے کچھ حصے کے آپ ہی کی رہنمائی میں انجام پایا۔ وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے اور الہ آباد واپس چلے جانے پر بھی شفیق استاد نے کافی دلچسپی لی۔ اور کام کو آگے بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ الفاظ میں اتنی طاقت نہیں کہ شکریہ کا حق ادا کرسکوں۔ مقالے کا ہر لفظ استاد محترم کی شفقت سے گراں بار ہے۔ اگر مقالے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے میری نااہلی کہنا چاہیئے اور اگر کوئی خوبی نظر آئے تو استاد محترم کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

جناب ڈاکٹر رحمت یوسف زئی کی بھی کافی ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے بھی اس سلسلے میں ہمت افزائی فرمائی۔

بصالت صاحبہ دفتر کی کاروائی کے سلسلے میں رہبری کرتی رہیں اور مسائل کو حل کرتی رہیں ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں جن عالمانہ شخصیتوں نے رہبری و رہنمائی کی ان میں پدم شری علی جواد زیدی ہیں جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھی ایک تشنۂ علم کو سیراب کیا۔ اس سلسلے میں موصوف کے کرم نامے کافی مفید اور کارآمد ثابت ہوئے۔

پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ لنگویجس جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ہمیشہ علمی رہنمائی فرمائی اور اس مقالے کے لئے اپنے دو عدد غیر مطبوعہ سلام روانہ کئے۔

پروفیسر نیر مسعود صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے مشیر کے نادر و نایاب سلام روانہ کئے جو راقمۃ الحروف کو تلاش بسیار کے باوجود بھی دستیاب نہ ہو پائے تھے۔

محسن زیدی صاحب نے بھی اس مقالے کے لئے دو عدد سلام روانہ کئے

میں ان تمام اہل علم کی صمیم قلب سے شکر گزار اور ممنون ہوں۔ ممنونیت کے ان جذبات کے ساتھ دعا ہے کہ اس بارگاہ میں میری یہ کاوش قبول ہو جس سے نسبت کی وجہ سلام کی صنف ہر درخشاں بن گئی۔
(آمین)

سیدہ زہرا بیگم
یونیورسٹی آف حیدرآباد

نومبر سنہ ۱۹۹۴ء

اردو کی شعری اصناف!

صنفی خصوصیات!!!

محرکات و موضوعات

سلام کے موضوعات؛ سلام کی تعریف
دوسری زبانوں کے ادب میں سلام سے مماثل اصناف
اردو میں سلام کی امتیازی خصوصیات

شاعری کی تعریف

شاعری تعالیٰ نہیں تخلیق ہے اور دنیا کی ہر تخلیق سے اس لئے افضل ہے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی تخلیق میں خارجی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصور تصویر بناتا ہے تو اسے اپنے خیال کی ادائیگی کے لئے رنگ درکار ہوتا ہے۔ موسیقار اپنا نغمہ پیش کرتا ہے تو نغمے کے بول اور ساز کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ مجسمہ ساز رگ سنگ میں جب لہو کی بوند کی گرمی پیدا کرتا ہے تو اسے بھی اوزار چاہیے۔

ہیگل کے لفظوں میں ہر تخلیق کے لئے خارج سے کچھ نہ کچھ لینا پڑتا ہے لیکن ادبی تخلیق کا کچھ خارج سے نہیں لیتا بلکہ جو کچھ ہے اسکا عکس اسکے شعور و ادراک میں ہے اور اسلئے کہا جاتا ہے کہ شاعری دراصل شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ انسانی ذات کی توسیع ہے۔ اس توسیع میں احساسات و جذبات کے جتنے رخ ہو سکتے ہیں وہ سب کسی نہ کسی عنوان سے شاعری میں نظر آتے ہیں۔

شعر کی تعریف افلاطون سے لے کر مونجائنس تک اور ورڈس ورتھ سے لیکر ایلیٹ تک [illegible] کی ہے لیکن مغرب کے معیار کو پیش کرنیکی بجائے اردو ادب کے کچھ علماء کے نظریات کو پیش کیا جا رہا ہے اسلئے کہ جس صنف شاعری کا مطالعہ مقصود ہے وہ قطعی طور پر مشرقی ہے اور اردو کی خصوصی صنف ہے اسلئے بہتر یہ سمجھا گیا ہے کہ اردو ہی کے علماء کی رائے پیش کی جائے۔

خواجہ الطاف حسین حالی شاعری کو ایک سماجی آلہ قرار دیتے ہیں جسکا زندگی سے ہر [illegible] تعلق ہوتا ہے۔ شعر کی بنیادی خصوصیات سے بحث [illegible] تخلیق کائنات

کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کو شعر کی بنیادی شرط قرار دیتے ہیں اور سادگی، اصلیت، جوش کو شعر کی خوبیاں بتاتے ہیں بلکہ وہ ان ہی عناصر کو شعر کی کسوٹی قرار دیتے ہیں

؎ اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

شعر کی عظمت کا اظہار وہ اپنی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" میں اسطرح فرماتے ہیں

"مشاغل دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر ان کو جگاتا ہے" ؎۱

شبلی نعمانی احساس کو شاعری کا دوسرا نام دیتے ہیں اور محاکات و تخیل کو شعر کے اصلی عناصر قرار دیتے ہیں اور شعر کو اسطرح متعارف کرواتے ہیں

"جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور انکو تحریک میں لائے وہ شعر ہے" ؎۲

شبلی تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں۔ اپنی اسی قوت کے باعث تمام اشیاء کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا اور اسی تخیل کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر آبدار موتی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ایک باکمال پیراک ہی اس سمندر کی گہرائی تک پہنچ کر دُرِ نایاب کی تلاش کر سکتا ہے چنانچہ شبلی لکھتے ہیں کہ:-

"اگر شاعری کے ذریعہ اخلاقی مضامین بیان کئے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت، ہمت، غیرت، محبت اور آزادی کو اشعار کے ذریعہ سے ابھارا جائے تو اور کوئی طریقہ اسکی برابری نہیں کر سکتا" ؎۳

چنانچہ مسعود حسن رضوی ادیب بھی اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں شاعری سے متعلق

؎۱ مقدمہ شعر و شاعری از خواجہ الطاف حسین حالی ص ۲۸

؎۲ شعر العجم حصہ چہارم از شبلی نعمانی ص ۲

؎۳ " " " " " " ص ۸۴

اظہارِ خیال کرتے ہوئے شاعری کو "بیکاری کا مشغلہ" نہیں بلکہ مقصدی قرار دیتے ہیں اور اسکے مقاصد پر اسطرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"شاعری ہے جس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے مصیبت میں تسکین دیتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گرتی ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے" [۱]

مسعود حسن رضوی انسانی زندگی میں جذبات کی بڑی اہمیت بتاتے ہیں اور دنیا کی اس رنگینی اور چہل پہل کو ان ہی جذبات کا ایجوٹر قرار دیتے ہیں کہتے ہیں یہی جذبات جب لفظوں کا جامہ پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں۔ [۲]

اسطرح شاعری جذبات کا ایسا اظہار ہے جس سے اجتماعی جذبات کی تہذیب و تربیت ہوتی ہے اور اعلیٰ ترین منزل پر پہنچکر شعر جذبات کی تخلیق بھی کرتا ہے اور جذبات کی تہذیب اور انکی اعلیٰ پیمانے پر تربیت کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اصلی شعر کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ انسانی جذبات کی تہذیب بھی کرے، اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی میں لطیف جذبات پائے نہیں جاتے مگر اعلیٰ ترین شعر ان نازک جذبات کی تخلیق کرتا ہے اسکی سب سے اچھی مثال مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے دی ہے

شعر کی یہ ساری تعریف داخلی وجدانی حیثیت رکھتی ہے اور اسی لیئے اسکی خارجی ہیئت کے سلسلے میں یہ بحثیں بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں کہ شعر میں قافیہ ضروری ہے یا نہیں۔ بحر و وزن ضروری ہے یا نہیں۔

اب تو یہ بھی ہو رہا ہے کہ نثر میں کچھ بھی لکھ دیا اور اسے نثری نظم کا نام دیدیا گیا عمیق حنفی اپنی تصنیف "شعر چیزے دیگر است" میں نثر اور شاعری کا مقابلہ نہایت مختصر اور جامع انداز میں اس طرح کرتے ہیں

---

[۱] ہماری شاعری از مسعود حسن رضوی ادیب ص

[۲]

"نثر شہد جمع کرتی ہے جبکہ شاعری کا کام عطر نکالنا ہے" ۱؎

بال والیری کہتا ہے کہ شاعری رقص ہے اور نثر چلنا جو فرق چلنے اور رقص کرنے میں ہے وہی فرق نثر اور شاعری میں ہے

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی تصنیف "شعر غیر شعر اور نثر" میں اس موضوع پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ "شعر میں اجمال ہوتا ہے وہ نثر کی تفصیل کو چھانٹ دیتا ہے" ۲؎ یعنی ان الفاظ کا اخراج جنکے بغیر نثر کا تصور ناممکن ہے۔

نثر سے ممیز کرنیکے بعد یہ بھی ایک پہلو ہے کہ شاعری کی شناخت اور پہچان کیا ہے؟ مثلاً عربی میں یہ شناخت اور پہچان اختصار اور طوالت کی بناء پر تھی مختصر کلام کو ارجوزہ کہتے ہیں اور طویل کلام کو قصیدہ، لیکن بعد میں موضوع کے اعتبار سے یہ صنف پہچانے جانی لگی اور مدح و ذم، حماسہ، رثا قصیدے کا ناگزیر جز قرار دیئے گئے، اسطرح شاعری کی پہچان کیلئے دو پیمانے مقرر ہوئے (۱) موضوع (۲) خارجی ہیئت۔ یہی دونوں پیمانے اصناف کی شکل میں شاعری کے مختلف رخ اور جہت قرار پائے۔

۱؎ شعر چیزے دیگر است از عمیق حنفی ص ۲۳

۲؎ شعر غیر شعر اور نثر از شمس الرحمٰن فاروقی ص ۳۹

۱۲ ——— :اردو کی شعری اصناف :———

اصناف کے سلسلے میں مختلف علماء کے اقتباسات پیش کرنے سے قبل اصناف کی تقسیم کا سرسری مطالعہ بھی مفید ہوگا

موضوع کے اعتبار سے عاشقانہ مضامین کیلئے غزل، مدح و ذم کیلئے قصیدہ اور کسی قصے کیلئے مثنوی کی اصناف اپنا وجود رکھتی ہیں۔ مرثیہ کے معنی وصف میت کے ہیں۔ اسطرح صنف مرثیہ کی شناخت بھی موضوع کی بناء پر ہو سکتی ہے

اصناف کی مندرجہ بالا تقسیم تو بہ اعتبار موضوع تھی لیکن ان ہی اصناف کی تقسیم اگر ہیئت کی اعتبار سے کیجائے تو یہ رباعی، مخمس، مسدس، متبع اور مثمن کے ناموں سے اردو شاعری میں اپنی شناخت رکھیں گے۔

اصناف سخن پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چلیں تو اندازہ ہوگا کہ اردو شاعری کی اہم صنف "غزل" کے عنوان سے اپنی شناخت رکھتی ہے جسکے اصطلاحی معنی نسیم البلاغت میں اس طرح ملتے ہیں۔

"ایسے ایک وزن اور قافیے والے شعروں کے مجموعے کو کہتے ہیں جن میں حسن، عشق، صفت معشوق، مکالمہ، طالب و مطلوب، اخلاق، تصوف اور ارادت قلبی وغیرہ کا بیان ہو" [1]

عبارت بریلوی اپنی تصنیف "غزل اور مطالعہ غزل" میں اس صنف سے متعلق اسطرح رقمطراز ہیں

"غزل تو صحیح معنوں میں وہی ہے جسمیں آنچ اور احیوتا پن ہو، جدت اور طرفگی ہو اور جو ایک صحیح احساس ایک پر خلوص جذبے اور ایک گہرے شعور کے نتیجے میں تخلیق ہوئی ہو" [2]

---

[1] نسیم البلاغت از سید جلال الدین احمد جعفری ص ۱۰۵

[2] غزل اور مطالعہ غزل از عبارت بریلوی ص ۲۶

چنانچہ یہ نہ صرف ہمارے جمالیاتی تاثرات مرتب کرتی ہے بلکہ زندگی کے جذباتی "تہذیبی" ذہنی، عمرانی، سماجی تقاضوں کی پابجائی کرنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ انفرادی پہلو میں عشقیہ کیفیات کا احاطہ کرنے میں تو اسے آفاقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف میں آپ بیتی بھی جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کا بہترین کلام تو وہی قرار پائے گا جو زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قدیم دور کے حسرت موہانی، جگر، اصغر اور فراق جیسے شاعروں کے نام آج بھی غزل کی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں "اصناف سخن اور شعری ہیئتیں" اپنی اس تصنیف کے تحت شمیم احمد موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے تمام اصناف سخن کی درجہ بندی کرتے ہوئے غزل کو ایک ہیئتی صنف قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ اسکے موضوعات کو وسیع محدود بتاتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

"غزل اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔ اسکی صنفی شناخت کا دارومدار اسکی مخصوص ہیئت پر ہے۔ اس صنف میں موضوع کو اہمیت حاصل نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ایک عرصے تک غزل حسن و عشق کی کیفیات اور جذبات کے اظہار کیلئے ایک مؤثر ترین وسیلہ سمجھی جاتی تھی، لیکن یہ کسی موضوع میں بند ہو کر کبھی نہیں رہی۔ ہر طرح کے خیالات کے اظہار میں اسنے اپنی قوت کو منوایا ہے۔ عہد جدید میں غزل جسطرح کا موضوعاتی تنوع پیش کر رہی ہے اسکے پیش نظر اسکی تخلیقی توانائی اور وسعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یوں یہ بات طے ہے کہ یہ صنف صرف اپنی ہیئت کی بناء پر زندہ رہ سکتی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ چند اور باتیں اسکی صنفی تشکیل میں معاون ہوتی ہیں" [1]

شمیم احمد نے غزل کو ایک ہیئتی صنف قرار دیتے ہوئے اسکے موضوعات کو لامحدود قرار دیا ہے جس سے نہ صرف غزل کی روایتی تعریف کا سلسلہ ~~ٹوٹ~~ منقطع ہوتا ہے بلکہ اسکی وسعت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ غزل کی روایتی تعریف عورت سے بات کرنے کے مترادف ہے۔ یہ

---

[1] اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، از شمیم احمد ص ۱۱۵

تعریف نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ مہمل ہے۔ بلا مبالغہ غزل کے ہزاروں معروف شعر ایسے ہیں جن میں نہ عورت سے بات چیت ہے اور نہ ہی عشق کا تصور، چند اشعار ملاحظہ ہوں

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
میں کہاں کرتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے۔ مجھکو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
مینھوں میں خاک لیکر دوست آئے بہرِ دفن زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

مندرجہ بالا اشعار میں کہیں عورت سے بات چیت کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا، باوجود اس کے یہ سب غزل کے معروف اشعار کی فہرست میں جگہ پاتے ہیں۔ دراصل سارا تصور اس بنیادی فکر کا ہے جو جو لفظ غزل کے معنی لغت میں تلاش کرتا ہے۔ غزل عربی لفظ ہے۔ عربی میں اس لفظ کی قرأت بھی مختلف صورتوں میں ہے مثلاً قرآنِ حکیم میں یہ غزّ کہا ہے یعنی (بہترین کتا ہوا)

عابد علی عابد اپنی تصنیف "اصولِ انتقادِ ادبیات" میں غزل سے متعلق شمس قیس رازی کے خیال سے متفق نظر آتے ہیں۔

شمس قیس رازی نے اپنی تصنیف "المعجم فی مغائر اشعار العجم" میں غزل کے لغوی معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے معرکے کی بات کہی ہے کہ ہرن کو غزال کہتے ہیں اور "غزل الکلب" ہرن کی ایک خاص قسم کی آواز کو کہتے ہیں۔ عابد علی عابد نے بھی شمس قیس رازی کے خیال کو سراہتے ہوئے تفصیل اسطرح پیش کی ہے کہ جب ہرن کو چاروں سمت سے شکاری کتے گھیر لیتے ہیں تو وہ موت سے خوفزدہ ہو کر اپنے بچاؤ کی خاطر ایک مخصوص قسم کی آواز نکالتا ہے جسمیں خاصہ کرب و درد ہوتا ہے اور جو نہایت ہی مؤثر ثابت ہوتی ہے جسکے باعث وہ ان شکاری کتوں سے نجات پا لیتا ہے۔ اس سے غزل اور اسکے موضوع تک پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے ص۱

سید ضمیر احمد نقوی بھی اپنی تصنیف "اردو غزل اور کربلا" میں غزل کی روایتی اور گھسی پیٹی تعریف کو ناقص قرار دیتے ہیں اور غزل کی تعریف کے سلسلے میں وہ جسکی رائے سے متفق ہیں قیاساً وہ شمس قیس رازی ہی ہیں جسکے خیال کی روشنی میں وہ صنفِ غزل کا تفصیلی طور پر بڑے ہی اچھے انداز میں جائزہ لیتے ہیں۔ لکھتے لکھتے ہیں کہ:-

"کسی قدیم ایرانی نے غزل کی تعریف یہ کی ہے کہ غزل کا تعلق اصل میں غزال (ہرن) سے ہے۔ غزال کو جب شکاری شکار کرنے کی غرض سے تیر مارتے ہیں تو

۱؎ حوالہ (بحوالہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل۔ اردو غزل میں تجربات احمد حمید الدین مطبوعہ ص۱۲

غزال زخمی ہو کر بھاگتا ہے۔ اس عالم میں اسکے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔
وہ چوکڑی بھرتا ہے لیکن اسکا پیچھا کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ زخم کی تکلیف
سے بیدم ہو کر گر جاتا [illegible] اسکے قریب پہنچتے ہیں۔ اس وقت
غزال کی آنکھوں میں جو حسرت ہوتی ہے اس حسرت کا نام غزل ہے۔
یہ تعریف غزل کے مزاج کو بڑی حد تک واضح کر دیتی ہے۔ در
حقیقت اسمیں غزال کا تیر کھانا، تیر کھا کر زخمی ہونا، زخمی ہو کر
گرنا، گر کر تڑپنا، تڑپ کر جان دینا، دیدنیا اور جان دینے کے عالم میں نہ
جانے کیا کیا سوچنا۔ ان سب باتوں میں درد کرب، بیکسی، حزن
و یاس کی جو ملی جلی کیفیات ہیں انکا تعلق غزل اور اسکے مزاج
سے ہے اور غزال کی مثال دیکر غزل کی یہہ تعریف کرنیوالے در
حقیقت اس صورت حال کو واضح کرنا چاہتا ہے۔ یہہ تعریف
غزل کی بڑی ہی پہلو دار تعریف ہے۔ اسکی بنیاد انسانی زندگی
کے ایسے بنیادی حقائق ہیں جو غزل کے مزاج کی جان ہیں۔ اسمیں
بنیادی حقیقت تو یہہ ہے کہ انسانی زندگی غم کا نام ہے، اسمیں درد
ہی درد ہے۔ شروع سے آخر تک حسرت ہی حسرت ہے۔ زندگی میں
شر کی قوتوں کا دور دورہ ہے وہ خیر کی قوتوں کو پامال کرتی ہیں
اور اسطرح زندگی میں جو کچھ انسان چاہتا ہے وہ اسکو نصیب نہیں
ہوتا وہ آس پاس اور گرد و پیش غم کے سائے دیکھتا ہے
غزال کی آنکھوں میں مرتے وقت جو حسرت ہے وہ کچھ

نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ اس کے اشارے بڑے ہی بلیغ اور اسکے کنائے بڑے ہی معنی خیز ہیں۔ کچھ انہیں ہی لسانیت معنوی اور صوری اعتبار سے صنف غزل کی ہوتی ہے جسمیں زندگی کے بنیادی حقوق کو داخلی اور جذباتی اندازمیں اشاروں اور کنایوں کیساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ باتیں اس کے مزاج میں داخل ہیں اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں "[۱]

اسطرح غزل کی تعریف موضوعی اعتبار سے یہ ہوگی کہ درد و کرب والی صنف جو انسانی زندگی کی بنیادی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے اخلاقی تہذیب پر زور دیتی ہے۔

قدیم شاعری میں عاشقانہ مضامین قصیدے کا جز ہوا کرتے تھے اسے نسیب یا تشبیب کہتے تھے اور اب بھی قصائد میں غزل داخل کی جاتی ہے۔ قصیدہ موضوعی صنف بھی ہے اور اپنی ایک مخصوص ہیئت بھی رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں صنف قصیدہ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قصیدے کے لغوی معنی گاڑھے مشکل کے ہیں۔ چنانچہ نجم الغنی اپنی تصنیف "بحر الفصاحت" میں صنف قصیدہ کی تعریف اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے کرتے ہیں۔

"چونکہ ان اشعار میں بڑے بڑے مضامین زور طبیعت اور پوری طاقت کیساتھ نکالے جاتے ہیں اس مناسبت سے اسکو قصیدہ کہتے ہیں۔"[۲]

چنانچہ جلال الدین صعبری، ابو محمد سحر اور محمود الٰہی اپنی اپنی تصنیف نسیم البلاغت اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ" اور "اردو میں قصیدہ نگاری" میں بالترتیب قصیدہ کی بابت نجم الغنی کے خیالات سے متفق نظر آتے ہیں۔

ظفر احمد صدیقی اپنی تصنیف "تنقید معروضات" میں صنف قصیدہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

---

[۱] اردو غزل اور کربلا — از سید ضمیر حیدر نقوی ص ۱۶

[۲] بحر الفصاحت — از نجم الغنی ص ۶۸

"۱- قصیدہ عربی زبان کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جو عربی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہے لیکن قصیدہ بہ معنی صنف سخن فارسی اور اردو کیلئے مخصوص ہے۔ عربی میں یہ اصطلاح ایک جداگانہ مفہوم رکھتی ہے جسکے ساتھ ایکطرف طوالت اور دوسری طرف حسن و دلآویزی کا تصور وابستہ ہے پھر یہ اسکا استعمال فارسی و اردو میں غزل و مثنوی وغیرہ اصناف سخن کے مقابل ہوتا ہے جبکہ عربی میں اسکا تقابل رجز و قطعات سے ہے اور یہ تقابل بھی ابتدائی دور میں رہا بعد میں تو قصیدہ ہی سکہ رائج الوقت بن گیا اور اسطرح پوری عربی شاعری ہی قصیدہ کا مصداق بن گئی۔

۲- قصیدہ کی وجہ تسمیہ اور لغوی و اصطلاحی معنوں میں جو وجوہ مناسبت عام طور پر بیان کی جاتی ہیں وہ نادرست ہیں اسلیئے کہ قصیدہ کے عربی مفہوم سے انکا کوئی تعلق نہیں" [۱]

شمیم احمد اپنی تصنیف اصناف سخن اور شاعری ہیئتیں میں تمام اصناف کو با اعتبار موضوع و ہیئت منقسم کر دیتے ہیں لیکن باوجود اسکے مثنوی اور قصیدے کو وہ موضوعی ہیئتی اصناف بتاتے ہیں جسمیں موضوع اور ہیئت دونوں اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے وہ قصیدے کے ~~کئی معنوں~~ ایسی صنف بتاتے ہیں کہ جسکے بطن سے غزل کی پیدائش ہوئی۔ وہ قصیدے کے لغوی معنوں کی مناسبت سے اسکی تعریف اسطرح کرتے ہیں حالانکہ یہ تعریف ظفر احمد صدیقی کی پیش کردہ تعریف

---

[۱] تنقیدی مسروضات از ظفر احمد صدیقی ص ـــــ

سے مختلف اور کسی حد تک متضاد ہے لیکن اسے اسلیئے پیش کیا جا رہا ہے کہ ہر نقطہ نظر سامنے آ سکے۔

"قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی ہیں گاڑھا مغز" اس صنف سخن پر اس بات کا اطلاق اسوجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے زور بندش اور سر شکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں فوقیت رکھتی ہے اسلیئے اسے اصناف سخن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغز سر کو حاصل ہوتی ہے لہذا اسے مغز سخن تصور کر کے قصیدہ کا نام دیا گیا ہے۔ لفظ قصید کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ لفظ لفظ قصید سے مشتق ہے اور شاعر جب کسی کی مدح یا ذم کے اشعار کہتا ہے تو اسمیں اسکے قصد و ارادے کو دخل ہوتا ہے۔" [1]

اصطلاحاً قصیدہ وہ نظم ہے جسمیں کسی کی تعریف یا ہجو یعنی مدح و ذم کے علاوہ وعظ و نصیحت اور حالات کا بیان دیدہ زیب اور پر شکوہ انداز میں کیا جاتا ہے جسکا وجود کسی نہ کسی مقصد کے تحت عمل میں آتا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے قصیدہ چار اقسام پر مشتمل ہے (۱) مدحیہ۔ (۲) ہجو (۳) وعظیہ (۴) بیانیہ

مدحیہ اور ہجویہ قصائد شخصی محور پر گھومتے ہیں۔ مدحیہ قصیدہ دو طرح کا ہوتا ہے یعنی منصبی اور درباری۔

استاد الاساتذہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے قصیدے کو دربار و درگاہ سے وابستہ کیا عام طور سے یہ سوچا جاتا ہے کہ نہ دربار رہے نہ گئے اور نہ درگاہ، اس لیئے قصیدہ ختم ہو گیا۔ لیکن یہ حقیقت سے بعید ہے۔ قصیدوں کی محفلیں مشاعروں سے زیادہ منعقد ہوتی ہیں

---

[1] اصناف سخن اور شعری ہیئتیں از شمیم احمد ص ۴۳

اور مدح و ذم وہ تصور ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا - البتہ اندازِ اور ممدوح بدل جاتے ہیں

پروفیسر گیان چند جین اپنے مضمون "اردو نظم اور اسکی اصناف" میں رقمطراز ہیں

"دورِ حاضر میں شہداے کربلا اور ائمہ کے یوم ولادت پر ان کی

مدح میں بھی قصیدے لکھے گئے لیکن قصیدوں کے شاعروں کو قاصدہ کہتے ہیں" [1]

اردو شاعری کی ایک صنف مثنوی بھی ہے جسکے بارے میں حالی مقدمہ میں لکھتے ہیں

"مثنوی اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے کیونکہ غزل

یا قصیدے میں اسوجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے

ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی بمثنوی میں یہ دقت ہے کہ

ہر بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور ردیف ایکطرح کے لانے پڑتے ہیں پس اسمیں

مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا

ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست اور ردیف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جائے

ہر شخص کا کام نہیں" [2]

اسی طرح حالی تمام ہیئتیں اصنافِ سخن پر مثنوی کو فوقیت دیتے ہیں اور نسبتاً کار آمد صنف قرار دیتے ہیں

کیونکہ اسمیں کوئی تاریخ، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، فقہ یا حکایات رنگین پیرائے میں بیان کئے جاتے ہیں

جسکا خاتمہ کسی نصیحت آمیز مضمون پر ہوتا ہے - اشعار کی تعداد بھی متعین نہیں ہوتی چنانچہ بیان میں

تسلسل بھی برقرار رہتا ہے - مثنوی کے ان ہی خصوصیات کے سبب سید جلال الدین احمد اپنی

---

[1] (شب خون) اردو نظم اور اسکی اصناف از پروفیسر گیان چند ص ۸

[2] مقدمہ شعر و شاعری از الطاف حسین حالی ص ۲۰۲

تصنیف نسیم البلاغت میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"مثنوی کسی قوم یا ملک کی مجموعی [illegible] ہوتی ہے" [1]

شمیم احمد اپنی تصنیف اصناف سخن اور شعری ہیتیں میں صنف مثنوی کو موضوعی ہیتی صنف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ -

"اردو شاعری میں مثنوی کی دہری حیثیت ہے۔ ایک طرف تو یہ ایک مکمل اور مقبول عام صنف ہے اور اپنے مخصوص موضوعات، مزاج اور مخصوص ہیئت کی بناء پر شناخت کی جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ ایک ہیئت ایسی بھی ہے جسے کسی دوسری صنف مثلاً نظم کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔" [2]

اردو شاعری کی سب سے اہم مقبول اور مشکل صنف سخن مرثیہ ہے اسلئے کہ اردو شاعری کا نصف سے زیادہ سرمایہ مرثیوں پر مشتمل ہے۔ یہ درست نہیں کہ اردو غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ ہے کیونکہ مرثیہ کا ہر بند تین اشعار پر مشتمل ہوتا ہے اور مرثیے عموماً دو سو یا دو سو پچاس بند کے ہوتے ہیں اسطرح ایک مرثیے میں اشعار کی تعداد چھ سو سے ۷۵۰ ہوتی ہے۔ صرف مرزا دبیر نے چار سو پچاس اور میر انیس نے چار سو مرثیے کہے ہیں یعنی تقریباً چھ لاکھ اشعار صرف ان دو مرثیہ نگاروں نے ہی کہے ہیں علاوہ ازیں مسدس کی ہیئت میں مرثیے کہنے والوں میں سودا، ضمیر، گدا، عشق، تعشق، وحید، پیارے صاحب، رشید، دولھا صاحب، عروج، کامل، عارف، وغیرہ شامل ہیں۔

---

[1] نسیم البلاغت — از سید جلال الدین احمد — ص ۱۱۳

[2] اصناف سخن اور شعری ہیتیں — از شمیم احمد — ص ۲۸

استادِ محترم نے فرمایا کہ ایک شاعر کو چھوڑ کر اردو کا کوئی قابلِ ذکر شاعر ایسا نہیں
جس نے مرثیہ نہ کہا ہو۔ [۱]

اسلئے مرثیہ جیسی صنفِ سخن زیرِ دقتِ تفصیلی مطالعہ کی طالب ہے۔ یہ مطالعہ اسلئے بھی
ضروری ہے کہ رقمتہ الحروف کے خیال میں سلام و مرثیے کی ذیلی صنف تو نہیں ہے مگر معاون صنف
ضرور ہے۔ دونوں کا سرچشمہ بڑی حد تک ایک ہے

صنفِ مرثیہ کو رقمتہ الحروف نے اپنے قبل از ایں ایم۔فل کے مقالے "حیدرآباد میں اردو مرثیہ
آزادی کے بعد" میں اسطرح واضح کیا ہے۔

مرثیہ دراصل عربی کے "رثا" سے لیا گیا ہے اور رثا بین کو کہتے ہیں۔

عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ "رثا" ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنیوالوں کا ماتم کیا جائے" [۲]
رثا بین کو کہتے ہیں اور بین ان جملوں کو کہتے ہیں جو کسی شخص کی موت پر اسلئے عزیز و اقارب
کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور جسمیں متبنی اپنے گہرے رنج و الم کا اظہار کرتا ہے جس سے مرنے
والے کیساتھ اسکے گہرے ربط اور تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

شمیم احمد لکھتے ہیں۔

"مرثیہ عربی کا لفظ ہے جو ایک اور لفظ رثا سے مشتق ہے رثی کے معنی ہیں
مرے پر رونا اور آہ و زاری کرنا۔ یہ صنفِ عربی شاعری میں رائج تھی عزیزوں
اور بزرگ و برگزیدہ ہستیوں کی موت پر رنج و الم کے جذبات سے لبریز

---

[۱] بحوالہ مجاور حسین صاحب ۔ "۵۰ شاعر خوجہ میر درد میں
[۲] ~~اضافی نعمتی اور نثری نثیں از شمیم احمد ص ۱۸~~
[۳] اصول انتقاد ادبیات از عابد علی عابد ص ۲۴۵

بحوالہ حیدرآباد میں آزادی کے بعد
اردو مرثیہ
مرتبہ زہرا صفحہ ۲ تا ۳

جو اشعار کہے جاتے تھے انھیں اصطلاحاً مرثیہ کہا جاتا تھا"۔ ۱

دراصل مرثیہ قصیدہ کی ہی ایک قسم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرثیہ میں مردہ لوگوں کے اوصاف انکی بہادری اور شجاعت کا ذکر کیا جاتا ہے اور قصیدے میں ان اشخاص کی تعریف و توصیف کیجاتی ہے جو بقید حیات ہیں یعنی ان دونوں اصناف میں مدح ضرور ہوتی ہے۔

مرثیہ بنیادی طور پر غم انگیز ہوتا ہے اور اسکے برعکس قصیدے میں ہمیں زندگی کے امید افزا اشارے ملتے ہیں۔ علاوہ اس کے قصیدے میں ایک پر تکلف تمہید باندھی جاتی ہے لیکن مرثیہ میں زاویہ نظر بدلا ہوا ہوتا ہے

مرثیہ قدیم عربی ادب میں قصیدہ کا ہی ایک جزو سمجھا گیا۔ ابن رشیق نے شاعری کی جو چھ قسمیں بتائیں ان میں مرثیہ بھی شامل ہے۔

ابن رشیق کتاب "العمدہ" میں باب المرثاء کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

"مرثیہ اور مدح میں کوئی فرق نہیں سوائے اسکے کہ مرثیہ میں کوئی ایسی شئے ملا دی جاتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مقصود کوئی میت ہے مرثیہ کا طریقہ یہ ہے کہ ظاہری طور پر غم انگیز ہو"۔ ۲

عربی ادب میں اسلام سے قبل قصیدہ رثائیہ بھی کہتے تھے عموماً اس سلسلے کے مراثی افراد پر لکھے جاتے تھے جن سے کوئی گہرا دلی تعلق ہوا کرتا تھا۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں اسطرح کے مراثی میں متمم بن نویرا کے مرثیہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو اسنے اپنے بھائی مالک بن نویرا کی موت

---

۱ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں از شمیم احمد ص ۱۸۱

۲ العمدہ از ابن رشیق ص ۱۴۷

موت پر لکھا تھا۔

فارسی میں مرثیے کی صنف کا تعین نہیں ملتا۔ رضا زادہ شفق نے تاریخ "ادبیات ایران" میں مرثیے کے ضمن میں نقطۂ آغاز شخصی مرثیہ کو قرار دیا ہے اور اسکے بعد واقعات کربلا سے متعلق مرثیوں کا ذکر کیا ہے۔ غالباً مرثیہ کی تعریف اسلئے نہیں کی گئی کہ ایسے فارسی میں بحیثیت صنف پایۂ اعتبار نہ ملا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عربی میں مرثیہ کی تعریف ہی تعلیم کر لی گئی ہو لیکن اردو میں صنف مرثیہ ابتدا ہی سے محترم اور مستند سمجھی گئی اور اسلئے اسکی تعریف بہت سے نقادوں نے کی ہے۔

عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

"در ثانی اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے دوستوں اور اقارب کے مرنے کا ذکر اور تعریف۔ قوم کے قائدین اور رہنماؤں کے مرنے پر الم کا اظہار ہو۔ پیشوایان دین اور ائمہ اطہار خاص طور پر حضرت سید الشہدا اور شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر ہو، اور ان کے مناقب و فضائل بیان کئے جائیں"[1]

مرثیہ کے مستند عالم سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں کہ :—

"مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جسمیں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کرکے اسکی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جو امام حسینؑ کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جائے یعنی مرثیہ کا ایک مفہوم عام ہے اور دوسرا خاص۔

---

[1] اصولِ انتقاد ادبیات از عابد علی عابد ص ۱۴۵

"لفظ مرثیہ جب کسی خصوصی کے استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہی خاص مفہوم ادا ہوتا ہے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان کی ترکیبوں میں بھی یہی خاص مفہوم مقصود ہوتا ہے" [۱]

اس سلسلے میں سفارش حسین کے یہاں بھی ایسے ہی خیالات کی صدائے بازگشت ہی اردو مرثیہ کے بیشتر لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

"اصل میں یہ وہ نظم ہے جسمیں کسی مردہ شخص کی خوبیاں بیان کی گئی ہوں مگر عام طور پر اس سے وہ نظم مراد ہے جو کربلا کے واقعات پر لکھی گئی ہو۔" [۲]

علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ :-

مرثیہ بھی اک قسم کا قصیدہ ہے سوائے نعت و منقبت کے قصیدوں میں عموماً کسی زندہ شخص کی مدح کی جاتی ہے مراثی میں کسی مردہ شخص کے فضائل بیان کرکے اسکی موت یا شہادت پر اظہار تاسف کیا جاتا ہے۔ اردو میں استبداد عربی و فارسی کی تقلید کیجاتی تھی یعنی بتیس، پچیس[۲۵] اشعار کے مرثیے ہوتے تھے [۳]

ڈاکٹر جعفر رضا نے یوں روشنی ڈالی ہے کہ :-

اصطلاح میں مرثیہ ایسی صنف کو کہتے ہیں جسمیں کسی کی وفات یا شہادت کا ذکر کیا جائے اور اس دنیا سے رخصت ہونے پر رنج و الم کا اظہار ہو اسطرح اردو میں جو مرثیے لکھے گئے انکو دو بڑے حصوں میں نظم کیا جاسکتا ہے واقعات کربلا سے متعلق مرثیے اتنی تعداد میں اور ایسے ادبی خصوصیات

---

[۱] روح انیس — از سید مسعود حسن رضوی — ص ۱۲

[۲] اردو مرثیہ (ابتدائی نقوش) — از شفارش حسین رضوی — ص ۱۰۹

[۳] اردو مرثیہ — از علی عباس حسینی — ص ---

کیساتھ لکھے گئے کہ انکی علیحدہ حیثیت ہوگئی ہے اسلئے اردو
تنقید و تاریخ میں جب مرثیہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے
مراد وہ مرثیے ہوتے ہیں جو واقعات کربلا سے متعلق ہیں اور جن
کی ایک الگ ادبی حیثیت ہے" ۱؎

مرثیہ کی تعریف کم و بیش ان ہی الفاظ میں ان تمام کتابوں میں ملتی ہے جو مرثیے کی
تعریف و تاریخ کے سلسلے میں لکھی گئی یا جن میں اصناف پر بحث کی گئی ہے۔ ان مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے
کہ مرثیہ حسب ذیل خواص رکھتا ہے۔

(۱) وصف میت اسکا ناگزیر جزو ہے

(۲) اسمیں بینیہ عنصر لازمی ہے

(۳) یہ کسی فرد یا افراد پر لکھا جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ دنیا سے گذر گئے ہوں

(۴) ظاہر ہے کہ جب اوصاف بیان کئے جائیں گے تو مدحیہ قصیدے کی طرح سے
اپنے اندر ہر پہلو رکھیگا، یعنی ممدوح سے متعلق اجزاء کی توصیف مثلاً تلوار کی تعریف یا
اسکے حرب و ضرب کا طریقہ وغیرہ۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ملکوں کی تباہی و بربادی پر بھی مرثیہ لکھا جاتا ہے
سماج یا ملک کی حالت زار پر جو نظم لکھی جاتی ہے اسے شہر آشوب کہتے ہیں اسلئے کہ یہ مجرد تصور ہے اور
مرثیہ مجردات پر نہیں بلکہ افراد پر لکھا جاتا ہے۔
مگر غور کیا جائے تو مغرب میں بھی مرثیہ مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ انگریزی میں اسے

۱؎ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی از ڈاکٹر جعفر رضا ص ۱۹

ELEGY کہتے ہیں اور انفرادی مرثیوں کے بڑے اچھے نمونے Gray کے یہاں اور Words worth کی لکھی ہوئی نظم Lucy میں بھی ملتے ہیں۔ عظیم رزمیہ کارناموں میں بھی مرثیہ کا تصور جزوی طور پر ہی سہی مگر نظر آتا ہے مثلاً یونان کے عظیم رزمیہ ایلیڈ میں ہومر نے ہیکٹر کی موت پر پارس کی زبان سے جو کلمات ادا کرائے ہیں انہیں بھی مرثیے کی تعریف منطبق کی جاتی ہے۔

اسطرح رامائن میں لکشمن کو بان لگنے پر رام چندر جی کی زبان سے بیقراری کے عالم میں نکلنے والے وہ کلمات بھی مرثیے کے ذیل میں آتے ہیں جو انھوں نے لکشمن کی مفروضہ موت پر ادا کئے

مہابھارت میں ابھیمنیو کی موت پر ارجن اور اسکی بیوی سبھدرا کا بخ وغم کا اظہار بھی مرثیہ کے ذیل میں آتا ہے۔

شاہنامے میں تو سہراب کی موت پر رستم گرد آفریدہ اور سہراب کی ماں کا اظہار غم بھی مرثیہ کی ایک شکل رکھتا ہے لیکن یہ سارے واقعات مرثیہ کی ایک سطحی شکل کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ایسے حالات نہیں ہیں جن سے ہر انسان کے دل کا تار جھنجھنا اٹھے۔ وہ فضا نہیں ہے جو تمام انسانوں کو متاثر کر سکے۔ بیشک مہابھارت اور رامائن میں رخلاقیات کا درس ملتا ہے لیکن دونوں کا محور ایک عورت ہے سیتا جی ہوں یا دروپدی

مہابھارت اور رامائن میں جان لینے کا جذبہ زیادہ ہے اور جان دینے کا کم دوسرے رزمیوں میں تو مہم آزمائی اور Adventure ہے

ارسطو کی تعریف کہ المیہ یا Tragedy رحم خوف اور دہشت کے جذبات کو ابھار کر انکا تزکیہ کرتی ہے صرف اس المیہ پر منطبق ہوتی ہے جسے دنیا واقعات کربلا کے نام سے جانتی ہے۔

اردو اور فارسی میں مرثیہ کا تصور صرف واقعات کربلا سے متعلق ہے حالانکہ بعض رثائی نظموں کو بھی شخصی مرثیہ کہا گیا اور کبھی مرثیہ کی کوئی درجہ بندی کی گئی اور نہ ہی مرثیہ کی اصطلاح وضع کی گئی۔

لیکن رقمتہ الحروف کے خیال میں صنف مرثیہ کا موضوع واقعات کربلا ہیں اور مرثیے کا اطلاق صرف ان نظموں پر کیا جا سکتا ہے جو واقعات کربلا سے متعلق ہوں۔ شخصی مرثیہ جسے کہا جاتا ہے اسے تعزیتی یا رثائی نظم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

واقعات کربلا کے بارے میں شائد ہی ایسی کوئی تفصیل ہو جس سے اردو جاننے والا کوئی بھی شریف انسان ناواقف ہو۔ بغیر اس ربط کے لئے مختصراً ان واقعات کو زمانی ترتیب کے اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۱ھ میں آنحضرت کی وفات کے بعد یوں تو زمانے میں کئی انقلاب آئے لیکن ایک وقت وہ آیا جبکہ یزید ابن معاویہ تخت نشین ہوا اور اس نے امام حسینؑ سے بیعت طلب کی۔ امام حسینؑ جو کہ حق و صداقت کا مکمل پیکر تھے انکا یزید جیسے ظالم و جابر اور باطل پرست شخص کے ہاتھوں بیعت کرنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ وہ امام تھے اور منصوص من اللہ تھے اور اللہ کا نمائندہ دنیاوی اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ ۸ رجب ۶۰ھ کو مدینہ سے مکہ کیلئے روانہ ہوئے تو یہ زمانہ حج تھا اور جب امام عالیمقام نے دیکھا کہ قافلہ حاجیوں کے بھیس میں مکہ پہنچ چکے ہیں تو آپ حج کو عمرہ سے بدلکر ۸ ذی الحجہ کو کوفہ کیطرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملی جنکو آپنے اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا تھا۔ امام نے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ آگے بڑھے تو حرؑ کا لشکر ملا جو کہ پیاسا تھا۔ امام حسینؑ نے اپنے قافلے میں شامل سبھی کو حکم دیا کہ باوجود دشمن کے پیاسے لشکر کو سیراب کیا۔ یہ لشکر بھی آپ ہی کیساتھ ہو لیا۔ امام حسینؑ نے اپنے سفر کو تمام کیا اور دوسری محرم ۶۱ھ کو سرزمین کربلا پر پہنچے۔ ادھر سوال بیعت سختی سے ہونے لگا۔ جونہی محرم سے یزیدی لشکر آنے لگا ۶ محرم کو خیام حسینی فرات سے بنائے گئے۔ ساتویں محرم سے خیام حسینی میں پانی نہ تھا اور امام وقت کے خیام سے العطش کی صدا کا بلند ہونا گویا امام حسینؑ کی مظلومیت کا اعلان تھا۔ ۹ محرم کی شب عاشور

امام نے عبادت کیلئے صلابت مانگی اور ساری رات خالقِ کائنات کی عبادت میں مشغول رہے، اور دسویں محرم کی صبح زمانے کیلئے حق پرستی کا پیام لیکر آئی۔ میدانِ کارزار گرم ہوا، اور جنگ کا آغاز ہوا اصحاب و انصار نے راہ حق میں اپنی جانیں قربان کردیں۔ اسکے بعد امام نے اپنے عزیزوں کو راہ حق میں قربان کر دیا یہاں تک کہ زینبؑ کے لال عونؑ و محمدؑ نے بھی اپنی جانیں نثار کر دیں۔ کبھی امام نے شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبرؑ کے سینے میں برچھی کا پھل دیکھا تو کبھی ستمائے سکینہؑ اپنے وفادار بھائی کے شانے قلم ہوتے ہوئے دیکھے۔ یہاں تک کہ جب فوج حسینی میں کوئی باقی نہ رہا تو امام عالیمقام نے اپنے چھ مہینے کے ننھے مجاہد علی اصغرؑ کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے سوال پیش کیا۔ حرملہ نے اسکا جواب تیر سے دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علی اصغرؑ نے اپنے باپ کے ہاتھوں پر دم توڑ دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

اور یہ کہ فوج حسینی کا بچہ بچہ راہ حق میں اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ ایسا ہوتا ہے کہ اسکے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس معصوم بچے کی عظیم قربانی کے بعد امام حسینؑ تنہا رہ گئے اور وہ وقت بھی آیا کہ امام مظلوم نے اپنا سر بارگاہ الٰہی میں نذر کیا۔ ایسا سجدہ کیا کہ سرزمین کربلا اس سجدے کو نہ بھول سکی شہادت کے بعد بہنوں اور بے وارثوں پر جو شام آئی وہ "شامِ غریباں" کے نام سے یاد کیجاتی ہے جبکہ مال و اسباب لوٹا گیا اور خیموں میں آگ لگائی گئی اور بعد یہ بچا ہوا قافلہ کوفہ و شام کی طرف اسطرح روانہ ہوا کہ امام زین العابدینؑ ساربان تھے اور علیؑ و فاطمہ کی بیٹیاں سر برہنہ تھیں۔ اس قافلے نے کوفہ کی منزلیں طے کیں۔ راہ شام کے آلام و مصائب دیکھے۔ قید کی اذیتیں برداشت کیں اور زندانِ شام میں چار برس کی بچی کو دفن کرنے کے بعد یہ بچا ہوا قافلہ اپنے وطن کیطرف لوٹا۔ علیؑ کی بیٹی زینبؑ ہی صبر و استقلال کا پیکر تھیں اس لئے ہوئے قافلے کو لئے وطن میں داخل ہوئی۔ اہل وطن کو روداد چمن سنائی۔ ام البنینؑ کو عباسؑ کی خبر شہادت سنائی

فاطمہ صغریٰ کو معصوم بچائی کا پیرسہ دیا۔ اور آخر کار ناناکی قبر پر آگئیں۔ مجمع کو بتایا اور ایک بار آور نزدی کہ نانا ایں آپکے حسین کی سنائی، لکیر آئی ہوں اور آپکے بچے گگر گوکر بلا میں شہید کر دیئے ہیں

یہ تمام واقعات اور ان ہی واقعات سے متعلق بہت سی ذیلی روایات مرثیوں میں، ملتی ہیں ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکھتی ہیں کہ:۔

"مرثیہ کا موضوع اپنے اصطلاحی مفہوم میں کربلا کی داستان ہے جو عرب یا دنیائے اسلام ہی کی نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کی تاریخ کا بھی ایک اہم باب ہے۔ ظلم و جبر، فسق و فجور کے خلاف یہ جہاد اور ایثار بے نفسہ اہم بھی ہے اور عظمت کا حامل بھی کیونکہ اس میں ذاتی غرض کا شائبہ تک نہیں۔ قربانی جو اپنے آپ میں عظیم المثال ہے اس واقعہ کے پس منظر میں عظمت رفتہ کی یاد آفرینی ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی اشاعت اور اظہار کے علاوہ اخلاقی استواری حمیت اور قومی شعور کی بیداری اس کہانی کی بار بار بازخوانی کا مقصد اولین ہے"[1]

مرثیہ کی اس تعریف کے بعد اردو کی بہت ساری غیر اہم اصناف سخن ہیں جن کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں صرف انکے نام درج کئے جاتے ہیں۔

شہر آشوب، واسوخت، ریختی، سہرا، تاریخ، تضمین، شکایت، ناٹک وغیرہ جنکا مقالہ کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں لیکن سلام میں مرثیے کا موضوع ہے، کہیں کہیں قصیدے کا طنطنہ اور رعب و جلال بھی ملتا ہے اور غزل بیدل تو یہ کہا جاتا ہے کہ سلام کی ہیئت بھی غزل کی ہوتی ہے،

---

[1] اردو مرثیہ اور تمدنی عناصر از ڈاکٹر ثمینہ شوکت ص ۴۱ ماہنامہ الزبیر ایڈیشن جنوری ۱۹۸۶ء

اور سلام کو بڑی حد تک رثائی غزل بھی کہا جا سکتا ہے اور مثنوی کا وہ رخ جہاں اعلیٰ اخلاقی و حکیمانہ مضامین نظم کئے جاتے ہیں وہ بھی مضامین سلام میں ملتے ہیں غرض کہ ان تمام متذکرہ اصناف کی جھلک کسی نہ کسی طرح سلام میں نظر آتی ہے

سلام نہ صرف خالص اردو کی صنف ہے بلکہ اردو شاعری کی آبرو ہے اسلئے کہ یہ صنف سخن کسی دوسری زبان سے اردو میں آئی بلکہ اسکی اپنی روایت ہے اور اسکا خمیر اردو ہی سے ابھرا ہے

اگر کسی صنف سخن کے پاس اسکی روایت یا اسکا اپنا ماضی نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنی موت آپ مر جایا کرتی ہے۔ شائد یہی سبب ہے کہ اردو میں سانٹ "ہائیکو" ترائیلے وغیرہ مقبول نہ ہو سکے لیکن سلام کی اپنی روایات صدہا برس کی ہیں اسلئے اردو میں سلام گوئی کی روایت پر کچھ تفصیل سے پیش کرنے سے قبل یہ بھی عرض کرنا ہے کہ عربی و فارسی میں سلام کی روایت نہیں ملتی۔ بہرحال اس صنف کے موضوعات کیطرف اشارے کئے گئے ہیں۔ اب سوال رہ جاتا ہے سلام کی ہیئت کا۔ اسکا جائزہ لینے سے قبل ہیئت کے مفہوم کا تعین مناسب ہوگا۔

ہیئت کے لغوی معنی بناوٹ یا شکل کے ہیں اور ہر صنف میں شاعر کے اظہار کی بناوٹ ہیئت کہلاتی ہے چاہے وہ غزل ہو یا مثنوی مرثیہ ہو یا رباعی اسمیں شاعر اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جس صوری ڈھانچے کو اپناتا ہے وہ اس صنف کی ہیئت قرار پاتی ہے اور وہی ہیئت اس صنف کی پہچان بن جاتی ہے۔

لیکن صنف مرثیہ کیطرح صنف سلام کی حد تک یہ خیال درست نہیں نہیں کیونکہ صنف مرثیہ ~~جسکی~~ ہی طرح صنف سلام کی شناخت بھی اسکی ہیئت سے نہیں بلکہ اسکے موضوع سے ہوتی ہے ہر صنف کی ہیئت دو رخ رکھتی ہے۔

(۱) خارجی ہیئت (۲) داخلی ہیئت

خارجی ہیئت سے مراد یقیناً اسکی ظاہری شکل ہوگی اور داخلی ہیئت سے مراد اس صنف کی ساخت ہوگی مثلاً سلام کی خارجی ہیئت دو یا چار مصرعی غزل کی شکل میں ملتی ہے لیکن اسکی داخلی ہیئت میں ہر شعر کا اپنی جگہ پر مکمل ہونا ہے

ہیئت اپنا ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جس سے شاعر کا طریقۂ اظہار یہ خیال واضح ہوتا ہے جسکو پیش کرنے کے لئے وہ مخصوص انداز بیان استعمال کرتا ہے اور اپنے اس انداز بیان کو موثر اور دلکش بنانے کیلئے اسے الفاظ کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر نہایت قیمتی اور آبدار موتی چننے پڑتے ہیں تاکہ لڑیوں کی شکل میں پیرو کر اپنے کلام کو از حد دلکش بنا سکے کیونکہ اسکی یہی پیشکش اس کے اور سامع کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔

حامدی کاشمیری اپنی تصنیف "اردو نظم میں بودلیری اثرات" میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

> الفاظ شاعر کا ذریعہ اظہار (میڈیم) ہیں الفاظ کی ایک ایسی ترتیب و تنظیم جو معانی کی خالق ہو ہیئت کے نام سے یاد کی جاتی ہے"۔[1]

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہر صنف کی ہیئت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو سامع کے لئے قبولیت کا باعث ہوتی ہیں جسکو احتشام حسین اپنی تصنیف "تنقیدی تنقیدی جائزے" میں اسطرح واضح کرتے ہیں

> "ہیئت اپنے وسیع مفہوم میں ایکطرف تو وہ طریقہ اظہار ہے جو فنکار استعمال کرتا ہے۔ دوسری طرف جانب جذبات

---

[1] اردو نظم میں بودلیری اثرات از حامدی کاشمیری ص ۳۸

دوسری جانب جذبات سے بھرا ہوا وہ ہیرا تر اور کسی حد تک
مانوس انداز بیان ہے جو شاعر اور سامع کے درمیان واسطے
اور رشتے کا کام دیتا ہے۔ اسمیں زبان، زبان کی تمام خوبیاں
آرائش اور اثر انگیزی کے تمام طریقے مواد کے تمام سانچے حسن
اور لطافت پیدا کرنے کے تمام ذریعے اور ان سب سے بڑھکر
مواد کیساتھ ہم آہنگی کا احساس دلا کر ایک مکمل فنی نمونہ بننے
کرنا بھی کچھ شامل ہے،، [1]

اردو اصناف کے سلسلے میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہر صنف کی ہیت مخصوص نہیں ہے مثلاً
مسدس میں مرثیہ بھی لکھا گیا ہے اور جواب شکوہ بھی اور چار مصرعے جنھیں رباعی کہتے ہیں
(ایک مخصوص بحر میں) اسمیں اخلاقی موضوع بھی ہے اور عشقیہ رباعیات بھی۔ کوئی سرسری
رائے رکھنے والا فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ اردو اصناف کا تعلق صرف موضوع سے ہے
تو یہ بھی درست نہیں اسلئے کہ مرثیہ بھی ابتدائی عہد میں مختلف ہیتوں میں لکھا گیا ہے
آج بھی واقعات کربلا آزاد نظم اور معرا نظم کی شکل میں پیرویں، شاکر اور احمد فراز کے
ہاں ملتے ہیں مگر اسے مرثیہ نہیں کہا جاتا اسلئے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اردو میں اصناف کا تعلق موضوع
اور ہیت کے باہمی آہنگ پر ہے جسمیں موضوع کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی روشنی
میں صنف سلام کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔

---

[1] تنقیدی جائزے از احتشام حسین ص ۱۰۲

سلام کی تعریف

صنفِ سلام اردو شاعری کی اپنی تخلیق ہے۔ پرم شری علی جواد زیدی بھی سلام کو اردو ہی صنف قرار دیتے ہوئے اپنے رسالہ "العلم" میں مضمون "سلام کا ارتقائی سفر" میں تحریر کرتے ہیں کہ :-

"عربی میں متفرق اشعار جو سلام سے موضوعاتی ربط رکھتے ہیں اس زبان کے قصائد میں مل جائیں گے لیکن ایک جداگانہ صنف کے اعتبار سے سلام کا عربی میں وجود نہیں۔ فارسی میں کچھ سلام ملجاتے ہیں لیکن بے رتبہ ہیں۔" ۱؎

امداد امام اثر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :-

فارسی میں سہرا . . . میں ہے . . . مگر سلام ہے . . . معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ فارس کو سلام گوئی کا مذاق کم ہے۔ کوئی دلخواہ سلام فارسی کا راقم الحروف کو دستیاب نہوا۔" ۲؎

سلام سے وہ نظم مراد ہے جو غزل کے انداز پر لکھی گئی ہو اور جسمیں واقعات کربلا کا ذکر ملتا ہے بہ سلسلۂ اصناف اور بلحاظ ترتیب مولانا حالی کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" کو اولیت حاصل ہے لیکن اس تصنیف میں صنفِ سلام کا ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے

مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف "آبحیات" میں بھی ہمیں اس صنف کا ذکر نہیں ملتا لیکن

۱، ۲؎ رسالہ دوماہی "العلم" مرثیہ و سلام نمبر جون ۱۹۹۳ء مضمون "سلام کا ارتقائی سفر" از علی جواد زیدی ص ۹

امداد امام اثر اپنی تصنیف "کاشف الحقائق" میں صنف سلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"سلام عروضی ترکیب ہے کی رو سے غزل، سہرا، اور سلام شئے واحد ہیں مگر انکے مضامین کے تقاضے اکید دوسرے سے علیحدہ انداز رکھتے ہیں۔ فارسی میں سہرا اسواسطے نہیں ہے کہ اس ملک میں دولہا یا دولہن کو سہرا نہیں باندھتے مگر سلام ہے سلام میں غزل کیطرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کیلئے تو بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیے سلام گوئی کا لطف یہی سبکہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کیلئے تو بھی غزل سرائی سے علیحدہ نظر آئے" [1]

مندرجہ بالا عبارت سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اہل فارس کو سلام گوئی کا ذوق بہت کم تھا یہی وجہ ہیکہ ایرانی فارسی گو شعراء کے یہاں ہمیں سلام کی صنف تلاش کرنے ہی سے نظر آتی ہے لیکن اسکے برخلاف ہندوستانی فارسی گو شعراء کے یہاں سلام ملتے ہیں لیکن بعد میں اردو نے اس صنف کو اسطرح اپنایا کہ اسمیں ذرہ برابر بھی غیریت باقی نہ رہی بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو اس صنف پر پوری طرح قابض ہوگئی۔

مولانا شبلی نعمانی اپنی تصنیف موازنۂ انیس و دبیر میں اس صنف کے آغاز و ارتقاء سے متعلق اپنے نظریات کو پیش کرتے ہوئے صنف سلام سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اسطرح کرتے ہیں کہ :-

"اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسام سخن

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم امداد امام اثر صـ ۱۷۷

میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ تمام مرثیہ گویوں نے
اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا لیکن
غزل ہیئت اسقدر رگ رگ میں پیوست تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز
میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا[1]
سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں۔ غزل کیطرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ
الگ ہوتا ہے سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرز شگفتہ اور نشست بندش، سادہ اور صاف
مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہوتا ہے۔

مرثیہ ایک موضوعی صنف سخن ہے جو ہیئت میں نہیں ملتا ہے یہ حقیقت
ہے کہ مرثیے کے ابتدائی نمونے ہمیں غزل کی ہیئت میں ملتے ہیں۔ بعد ازاں مثلث، مربع
مخمس غرض ہر ہیئت میں مرثیہ نے رواج پایا۔ بالآخر مسدس کی ہیئت مرثیے کیلئے متعینہ
ہیئت قرار پائی۔ شبلی نعمانی سلام کی ایجاد کا یہی سبب بتاتے ہیں کہ جب مرثیہ نے مسدس
کی ہیئت کو اپنایا تو وہ مرثیہ گو شعراء جو فن مرثیہ گوئی میں کمال رکھتے تھے اور جو اس دور
کی مروجہ مشہور زمانہ صنف سخن یعنی غزل کی ہیئت میں مرثیہ کہتے تھے، اور جس کیلئے اسقدر
کاوشوں میں کھو گئی تھی کہ جسکی قبولیت کے سبب وہ اس میدان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لہذا اسی
ہیئت اور طرز پر انہوں نے سلام ایجاد کر لیا جس میں واقعات کربلا بیان کئے جاتے اور جس میں عاشقانہ
مضامین کو چھوڑ کر دیگر جذبات اور واردات قلب حکیمانہ خیالات اخلاقی و معاشرتی مضامین
کو جگہ دی گئی۔

صنف سلام سے متعلق شبلی نعمانی کے مندرجہ بالا نظریات حقیقت سے بالکل ہی بعید
ہیں کیونکہ سلام کا مآخذ دراصل قرآن حکیم ہے۔ سب سے پہلے قرآن نے سلام

---

[1] موازنہ انیس و دبیر (از شبلی نعمانی) ص ۲۳۴

بھیجنے کا سلیقہ سکھایا۔ جب خالق کائنات نے آدم، ابراہیم اور آل ابراہیم پر سلام بھیجا منتخب بندوں اور مرسلان برحق پر سلام بھیجا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ بندوں کو یہ نہ سکھایا جاتا کہ جس پروردگار اور ملائکہ درود و سلام بھیجتے ہیں۔ ان پر ایمان لانے والے بھی درود و سلام بھیجا کریں۔ چنانچہ سورۂ "الاحزاب" کی ۵۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا جسکا ترجمہ درج ہے۔

ترجمہ "اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ خدا اور اسکے فرشتے پیغمبرؐ اور انکی آل پر درود بھیجتے ہیں تو اے ایمان دارو تم بھی درود بھیجتے رہو اور ہر ہر سلام کرتے رہو"[1]

قرآن حکیم کے سورۂ نور کی ۸۶ ویں آیت میں پروردگار نے سلام ایک مبارک اور پاکیزہ تحفہ قرار دیا ہے۔ سورۂ نساء کی ۸۶ ویں آیت میں سلام کی اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

سلام کا یہ تصور قرآن حکیم کی دین ہے۔ ان تمام مباحث سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ مندرج ہیں۔

(۱) سماجی اعتبار سے بھی سلام پاکیزہ تحفہ ہے جنت میں بھی

مومنین ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

۲۔ پروردگار عالم نے انبیاء علیہم السلام پر سلام بھیجا اور

مومنین کو حکم دیا کہ سرکار دو عالمؐ اور انکی آلؑ پر سلام بھیجتے رہیں۔

ان امور سے ثابت ہوتا ہے کہ سلام کا غزل سے کوئی ربط نہیں۔

اسکا لیس منظر نورانی ہے اور یہ صنف قرآنی ارشادات سے مستخرج ہوئے چنانچہ غور کیا جائے تو ایک موضوعی صنف سخن معلوم ہوتی ہے اور مرثیہ کیطرح اپنے دور آغاز ہی ہر ہیت میں ہمیں ملتی ہے وہ غزل کی ہیت میں ایجاد ہوئی اور نہ ہی غزل کی ہیت تک محدود رہی۔ اس صنف کا مقصد ہی

---

[1] ۔ آیت کا ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب کے مترجم قرآن مجید کا ہے۔

تھا کہ سرکارِ ختمی مرتبت کے حضور میں سلام بھیجا جائے چنانچہ سلام کی روایت اور تاریخ پیش کرتے ہوئے ابتدائی سلام سے عہدِ حاضر کے سلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں جو مختلف ادوار کی خدمت میں گزرانے گئے ہیں۔

سرکارِ رسالت کے بارے میں یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں سے ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ:-

حسینؑ منی و انا من الحسینؑ

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں

جبکہ منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر حسینؑ پر سلام بھیجا تو گویا حضور پر اور حضور پر سلام بھیجا تو گویا حسینؑ پر۔ چنانچہ اس اجتماعی حافظے کا اثر ہے کہ واقعاتِ کربلا کو سلام میں جگہ ملی اور سلام کا موضوع سرکارِ رسالت اور آپ کے اہلبیتؑ سے متعلق ہے قرار دیا گیا ہے۔ اہلبیت علیہ السلام کے واقعات کا بیان سلام ٹھہرا۔ یہاں اتنی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ شخصیت خود کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اس پر سلام نہیں بھیجا جا سکتا اگر وہ دائرۂ مقطوعہ کی روشنی کے گرد ہالہ میں شامل مرثیے میں شخصی مرثیے کی روایت میر ضمیر اور دوسروں نے غالب کا مرثیہ۔ حالی کا مرثیہ داغ یا اکبر کا مرثیہ یا کسی بھی شخصیت کا مرثیہ وفات پر جب تعزیتی نظم لکھی گئی تو وہ مرثیہ کہلایا حالانکہ وہ درست نہیں تھا لیکن مزاج عام کو کیا کیا جائے لیکن سلام کے سلسلے میں قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اگر اس نے محمد مصطفیٰؐ اصل، رحمۃ للعلمین اور آپ کے اہلبیتؑ کی مدحت کی تو آج تک کسی کی جرأت نہ ہو سکی کہ آپ کے علاوہ کسی اور شخصیت پر سلام بھیج سکے۔

چنانچہ حضور اور آپ کی آلِ پاک پر ہی سلام بھیجا جاتا ہے یا اولیائے اہلبیت اور دوستی ہے کہ کسی مذہبی رہنما پر سلام بھیجا گیا ہو لیکن اس کی وجہ [illegible] جانے کا سبب یہ تھا

یہ ہے کہ وہ شخصیت حضور سے نسبت رکھتی ہے

سلام کا تصور بھی متعین اور موضوع بھی متعین اور اسکی شخصیات بھی متعین ہیں - یعنی سلام میں کسی ایسی شخصیت کا تذکرہ آ ہی نہیں سکتا جسے ذات محمد سے نسبت نہ ہو -

سلام صنف مرثیہ کی ذیلی قسم تو نہیں لیکن معاون ضرور ہے - عہد قدیم سے یہی رواج رہا کہ مرثیہ خوانی سے قبل تعظیماً پڑھے ہی رجوع قلب کیلئے لازم پڑھا جانا جسکا ثبوت ہمیں مرزا محمد رفیع سودا کے اس شعر سے ملتا ہے -

؎ یہ سودا عرض بہ عجز و نیاز کرتا ہے
شروع مرثیہ ہونے کو اب تمام سلام

شیخ چاند اپنی تصنیف "سودائیں" میں صنف سلام پر اپنے خیالات کا اظہار اسطرح کرتے ہیں جس سے شبلی کے نظریات کی تردید ہوتی ہے

"صنف سلام جب عالم وجود میں آئی تو صرف غزل کی شکل تک محدود نہیں رہی بلکہ مرثیہ کیطرح اسکو کسی قدر وسعت دی گئی چنانچہ خود سودا کے سلام غزل نما شکل کے علاوہ مربع صورت میں بھی موجود ہیں ایسی حالت میں یہ کہنا کہ غزل گوئی کے جبر سے متاثر ہو کر مرثیہ گویوں نے سلام کو غزل کے طرز اور جواب میں ایجاد کیا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا - سلام کے جو لوازم اور مہمات موضوع حال کے سلام کو شعراء نے مقرر کر لئے ہیں انکی سودا کے زمانے میں تحدید و تعین نہیں ہوئی تھی اسکے زمانے میں سلام نہ کامدعا صرف یہ تھا کہ شہیدان کربلا اور خصوصاً امام حسینؑ کی

کی جناب میں عقیدت تھی اور اس [illegible] کا تحفہ بھیجا جاتا
جیسا کہ اس زمانے کے دستور تھے اور [illegible] سودا کے پاس
سلام سے ثابت ہے کہ سودا [illegible] ہم عصر میر نے بھی سلام
کہا ہے۔ اس میں بھی ثابت ہوتا ہے کہ۔ رسالہ سبیل ہدایت
میں تقی کا جو سلام درج ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے
میر کا ایک مربع سلام رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۳۳ء میں
چھپا ہے ہم ایک بند نقل کرتے ہیں۔

درویشیں بے بضاعت ہے میر دست کو
غیر از سلام تحفہ کرتا نہیں ہے کچھ وہ

ہر لحظہ اور ہر دم ہر گاہ اور بے گاہ
اے شاہ دوسرا ہے تجھکو سلام بھیجے

ان شواہد کی موجودگی میں یہ کسیطرح قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ غزل کے طرز اور جواب میں
سلام کی ایجاد ہوئی یہ ممکن ہے کہ لکھنؤ کے بعد کے مرثیہ گویوں نے خاص موضوعات اور
خاص لوازم مقرر کر لئے ہوں لیکن سودا کے زمانے میں یہ التزام نہیں تھا۔ سلام کا صرف
ایک ہی مقصد تھا اور وہ ہیر خلوص مدحیہ تسلیم و نیاز۔ اس زمانے میں مرثیہ گو، غزل گو
حقیر جانتے تھے مشہور مرثیہ گو شاعر تقی نے لکھا ہے

میں اسکو جو اک کھول کے کر لکھا رہے ہے
غزل نہیں ہے، یہ نام مرثیہ اسکا

ذرا منصفوں سے ہے اب اسکا دعویٰ
بیانِ شہادت کا اک یہ بھی ڈھب ہے

ان حالات میں غزل کی تقلید اور بس کرنا اور اسکے جواب میں سلام کو لکھڑا کرنا مرثیہ گو ہرگز پسند اور گوارا نہیں کر سکتے تھے سودا کے زمانے میں مرثیہ پڑھنے سے پہلے تعظیماً سلام پڑھا جاتا تھا۔ خود اسنے اک سلام کے خاتمے پر اسکی طرف اشارہ کیا ہے

یہ سودا عرض یہ عجز و نیاز کرتا ہے
شروع مرثیہ ہونے کو اب تمام سلام

سلام کے کہنے کا یہی موقعا اور کیونکہ ابھی رسمی ابتدا ارثی اسلئے اسمیں جدت کے نئے نئے پہلو داخل نہیں ہوئے تھے۔ سودا کے سلام بھی اس بلند آہنگی، نازک خیالی، شان و شکوہ، دلی جذبات اور حکیمانہ خیالات وغیرہ کے اظہار سے خالی ہیں جو ہم متاخرین شعراء کے سلاموں میں پاتے ہیں۔ زبان پاکیزہ اور سادہ ہے اور مضمون کو صفائی اور خوص سے ادا کیا ہے سلام کی ابتدائی نشو و نما میں اس سے زیادہ توقع رکھنی کسیطرح جائز نہیں۔ ہمیں اس زمانے پر نظر رکھنی چاہیے بموجودہ معیار پر اس زمانے کی شاعری کو جانچنا کب حد تک ناانصافی ہے۔[1]

شیخ چاند نے صنف سلام پر جو اظہار خیال کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سلام کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی۔ یہ کسی بھی ہیئت میں کہے جا سکتے تھے دوسرے یہ کہ مرثیہ پڑھنے سے قبل تعظیماً شہیدانِ کربلا اور خصوصاً امام حسینؑ کی خدمت میں عقیدت مندانہ سلام بھیجا جاتا تھا۔

---

[1] سودا از شیخ چاند ص ۳۲۲

ممتاز الرشید اپنی تصنیف "اصناف سخن یعنی مروجہ نظم کی قسمیں" میں اس صنف کو اس طرح متعارف کرواتے ہیں کہ :۔

"عام طور پر سلام اس نظم کو کہتے ہیں جسمیں شہدائے کربلا کے حالات غزل کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہوں لیکن ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ہمارے آقائے نامدار رحمتہ اللعالمین صلعم کی ولادت باسعادت کے سلسلے میں بھی سلام لکھا ہے جو ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ اسی طرح ماہر القادری نے بھی جناب رسالتمآب صلعم کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے" [1]

مندرجہ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ موصوف نے ہیئت کو زیادہ اہمیت نہ دی لیکن موضوعات کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

تصنیف "سلام و کلام" مصنفہ نوابر فتح پوری میں حالات مصنف کے ضمن میں وحید الحسن ہاشمی صنف سلام اور غزل کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"غزل کی ادب میں مرثیہ تو ایک لاجواب صنف ہے
سلام بھی غزل سے کم نہیں بلکہ نظر غور سے دیکھا جائے
اور تعصب کی عینک اتار دی جائے تو سلام کا دامن
غزل سے بہر نہج وسیع ہے۔ سلام میں تمام مسائل آسانی
اور عمدگی سے کھپ سکتے ہیں" [2]

یہ صنف سلام کو غزل پر فوقیت دیتے ہوئے سلام کے دامن کو غزل سے بہر لحاظ وسیع بتاتے ہیں

---

[1] اصناف سخن یعنی مروجہ نظم کی قسمیں — از ممتاز الرشید — ص ۲۱۴-۲۱۵

[2] سلام و کلام — از نوابر فتح پوری — ص ۲۱۱

کو دورِ حاضر کے نوجوانوں کے سامنے ایک نظیر کے طور پر پیش کر کے ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانا چاہتے ہیں۔ اور انھیں اپنی حق کی لڑائی کے لئے کمربستہ ہونے پر مائل کرتے ہیں۔ اور ہر انسان کو باعمل ہونے کی تاکید کرتے ہیں۔

"حسین پر سلام" مرتبہ سید علی رضوی اور رسالہ "الکرار" ان دونوں میں بھی احسان دانش کا وہی ایک سلام ملتا ہے لیکن "حسین پر سلام" میں دانش کے تخلص سے موجود ہے تو "الکرار" کے احسان کے تخلص سے دستیاب ہوتا ہے۔ سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

اللہ اللہ یہ وفورِ شوقِ دیدارِ حسینؑ
ذرّے ذرّے میں نظر آتے ہیں انوارِ حسینؑ

صبح کی ضو ریزیوں میں شام کی تسکین میں
عکس افگن ہیں جہاں پر زلف و رخسارِ حسینؑ

دورِ تجدیدِ شہادت غالباً نزدیک ہے
اب نظر آتے ہیں ہر سینے میں آثارِ حسینؑ

جب بیاں ہوتے ہیں میدانِ بلا کے معرکے
جسم میں رفتارِ خوں ہوتی ہے رفتارِ حسینؑ

یوں بھی کعبہ میں دعائیں مانگتے ہیں اہلِ شوق
دل بہ درگاہِ خدا مُنہ سوئے دربارِ حسینؑ

تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے آئینِ جہاد
ہو نہ جب تک ہر مجاہد آئینہ دارِ حسینؑ

مطمئن تفسیرِ قرآں سے بھی ہے دنیا مگر
اب ضرورت ہے کہ ہو تشریحِ کردارِ حسینؑ

کاش احسان میرے لاشے پر پڑے بنکر کفن
وہ فنک سایہ کہ جو ہے زیرِ زیوارِ حسینؑ [1]

مندرجہ سلام منقبتی رنگ کی بھی پوری پوری عکاسی کرتا ہے

---

[1] ہفتہ وار رسالہ "الکرار" مدیر شاہد حیدری ۱۵ و ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲

علاوہ ازیں احسان دانش کا ایک اور سلام خالص رثائی انداز میں ملتا ہے ملاحظہ ہو۔

سلام

لازم درود ہے لب گفتار کے لئے
سوغات کچھ تو ہو شہ ابرار کے لئے

اک خون تھا جو طرۂ عرفان و آگہی
سرخی بنا دیں لب سوفار کے لئے

جن پر رہا تھا سایہ دامان مصطفیٰ
ترسے وہ لوگ سایۂ دیوار کے لئے

درکار چشم دل کو ہے کار بیشت بھی
لازم ہے گریہ شاہِ دل افگار کے لئے

دانش یہی مصیبت ایذد تھی جب رہو
یہ بھی تو اک مقام ہے دیندار کے لئے

مندرجہ سلام بھی دانش کے تخلص سے ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ احسان دانش کبھی احسان اور کبھی دانش تخلص کرتے تھے۔

اردو زبان کے نعت گو شعراء میں امیر مینائی، محسن کاکوری اور بیدم شاہ وارثی کو شہرت حاصل ہے۔ لیکن دور جدید کے نعت گو شعراء میں ماہر القادری کو یہ مقام حاصل ہے۔

ماہر القادری:۔

"ذکر جمیل" یہ ماہر القادری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے اس میں خود ماہر القادری اپنے گھریلو ماحول سے متعلق لکھتے ہیں کہ انھیں ایسا ماحول ملا تھا۔ جہاں صبح و شام حمد و نعت ہی کا ذکر رہتا۔ والد کو ذاتِ رسالت مآب سے گویا عشق تھا جس کے سبب ابتداء میں عشقیہ غزلیں لکھا کرتے لیکن بعد میں صرف

نعت کہنے لگے اور مدینہ جانے کی آرزو میں اس دنیا سے چلے گئے۔

ماہر اپنی نعت گوئی سے متعلق رقم طراز ہیں۔

"دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ نعت رسول میری گھٹی میں پڑی تھی۔ ہوش سنبھالا تو شعر گوئی کے لئے طبیعت کو موزوں بلکہ آمادہ پایا۔ میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ میری شاعری کی ابتداء حمد و نعت سے ہوئی اور انشا اللہ خاتمہ بھی اسی پر ہوگا مجھے اپنی فاسقانہ شاعری کا بہر حال کفارہ دینا ہوگا۔"[1]

تاریخ کے آئینے میں ماہر القادری کی حیات و شخصیت کچھ اس طرح نظر آتی ہے۔

۱۹۰۸ء کو کیسر کلاں ضلع بلند شہر یو پی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ لیکن بعض ناگزیر حالات کی بناء پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔ لیکن عربی زبان و ادب کی تعلیم استادوں سے حاصل کرتے رہے۔ زیادہ وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے جس میں معلومات میں اضافہ یقینی ہے۔

۱۹۲۸ء میں حیدر آباد آئے اور اسی کو اپنا مسکن بنایا۔ ہائی کورٹ میں ملازم ہوگئے۔ اس طرح سولہ سال کا طویل عرصہ انھوں نے حیدر آباد میں گزارا۔ بعد ازاں بمبئی چلے گئے اور وہاں فلمی دنیا سے متعرف ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ماحول اور فضاء کو اپنی طبیعت کے مناسب نہ پایا۔ چنانچہ تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہوگئے۔

---

[1] ذکر جمیل از ماہر القادری ص ۱۲

۱۹۴۹ء سے اردو ماہ نامے "فاران" کے مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے شعر گوئی کا آغاز سن شعور سے ہوا تھا۔ ماحول ہی شاعری اور بالخصوص نعتیہ شاعری کا ملا تھا۔ لہٰذا فطرتاً ان کی شاعری کا آغاز بھی نعت گوئی سے ہوا۔ نظم اور صنف غزل دونوں پر عبور حاصل تھا۔ خیالات اور انداز بیان کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ پر سوز لہجے نے کلام کے اثر کو دوبالا کر دیا ہے۔ جس کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے

؎ ماہرؔ میں اپنی ذات سے جو کچھ ہوں ٹھیک ہوں
غالبؔ نہیں ہوں حافظؔ و خیامؔ بھی نہیں

مندرجہ شعر ماہرؔ کی طبیعت کی انکساری اور قناعت پسندی کی ترجمانی کرتا ہے شاعری میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں ہیں۔ اشعار ان کی والہانہ کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چاہے سلام کے ہوں یا نعت کے ؎

دور جدید کے شعراء میں خاص مقام رکھتے ہیں چنانچہ سلام میں منقبتی انداز بھی ملتا ہے اور طرز جدید بھی۔ "شہید کربلا" کے عنوان سے اس سلام کے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

شہید کربلا

اجل کو دیکھ کے جب مسکرا دیا تو نے — حنین و بدر کا منظر دکھا دیا تو نے
ہے زیب صفحۂ تاریخ تیری قربانی — خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا تو نے
فرات دے نہ سکی گرچہ داد تشنہ لبی — مگر خلوص کا دریا بہا دیا تو نے
ترے نثار کہ شبیر رگ کا خون ٹپکا کر — خدائے دیں کا چمن لہلہا دیا تو نے

رہے گا یاد جہاں کو ثباتِ عزم ترا — ولوکیت کا قدم ڈگمگا دیا تو نے
میری نگاہ میں جچتی نہیں شہنشاہی — نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تو نے
عیاں زمانے میں پھر کربلا کی صورت ہے — خدا کے واسطے پھر آ تری ضرورت ہے [1]

شہادت عظمیٰ کو پیش کرتے ہوئے ماہر لوگوں کے دلوں میں بھی بلند حوصلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہی عزم و استقلال جو کربلا والوں نے پیش کیا۔

ذکر جمیل میں "ظہور قدسی" کے عنوان سے ایک نعت بھی ملتی ہے جو کافی طویل ہے اس کا ایک حصہ سلام پر مبنی ہے چونکہ یہ نعت کا ایک حصہ ہے اس لئے سلام بھی نعتیہ انداز رکھتا ہے۔

سلام

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی — سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سمجھائے — سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دی — سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دی
سلام اس پر کہ دشمن کو حیات جاوداں دیدی — سلام اس پر ابو سفیان کو جس نے اماں دیدی
سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں — سلام اس پر ہوا مجروح جو بازار طائف میں

یہ سلام پینتالیس ۴۵ اشعار پر مبنی ہے جس کے بعد "درود اس پر" کے عنوان سے گیارہ شعر ملتے ہیں جو اس مقطع پر ختم ہیں۔

؎ درود اس پر کہ جو ماہر کی امیدوں کا ملجا ہے
درود اس پر کہ جس کا دونوں عالم میں سہارا ہے

---

[1] ذکر جمیل ماہر القادری ص ۱۰۱

ڈاکٹر محمد چراغ علی اپنی تصنیف "اردو مرثیے کا ارتقاء گولکنڈہ اور بیجاپور میں" صنف سلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

شمالی ہند میں جب غزل کے علاوہ دوسری مختلف ہیئتیں مرثیہ کیلئے برتی جانے لگیں اور بالآخر مسدس کی ہیئت مرثیہ کیلئے مخصوص ہوگئی تو غزل کی ہیئت میں لکھا جانیوالا مرثیہ سلام کہلانے لگا۔ خواہ اسکا مزاج آغاز سلامی یا محبری کے ذکر سے یا نہ ہو" [1]

محبری شاہ کا ہوں خلد میں ہے گھر میرا
منتظر حوریں ہیں مشتاق ہے کوثر میرا
قتل میں تھا جو لاشۂ اصغر تمام رات
جنگل میں ڈھونڈھتی رہی مادر تمام رات

شیخ چاند نے صنف سلام پر جو اظہار خیال کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سلام کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی۔

لیکن جنوبی ہند میں مرثیہ کے لئے غزل کی ہیئت زیادہ مستعمل رہی لہذا سلام اور مرثیے کے فرق کو اسطرح واضح کرتے ہیں کہ:-

چونکہ دکن میں مرثیے کے لئے غزل ہی کی ہیئت بکثرت مستعمل رہی ہے اسلئے دکنی مراثی میں وہی مرثیہ سلام کہلاتا ہے جسکی ردیف میں مرحبا یا صلواۃ جیسے الفاظ ہوں [2]

---

[1] اردو مرثیے کا ارتقاء گولکنڈہ اور بیجاپور میں از ڈاکٹر محمد چراغ علی ص ۱۹۸-۱۹۷

[2] اردو مرثیے کا ارتقاء گولکنڈہ اور بیجاپور میں از ڈاکٹر محمد چراغ علی ص ۱۹۸

کسی بھی علاقے کے تخلیق کاروں کی انفرادیت اور شناخت ادب کے وسیع تناظر میں مشکل ہوتی ہے اردو میں شعری تخلیقات کے مرتبے کا تعین علاقائی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ کمالِ فن کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ محمد قلی ہوں یا سودا ان دونوں کی اہمیت ان کے علاقے سے نہیں بلکہ ان کے کمال فن کی وجہ سے کسی علاقے تک محدود ہو جاتی ہے۔ جیسے صنفِ مرثیہ جو انیس و دبیر جیسی قد آور شخصیتوں کے سبب دلبستان لکھنؤ سے مخصوص ہو چکا بلکہ کر دیا گیا جس کا سبب نادانفیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاعری کی تمام اصناف کا آغاز سرزمینِ دکن ہی سے ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اصنافِ سخن کا ارتقاء شمالی ہند میں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ صنفِ سلام کے لئے بھی انیس و دبیر کا عہد دورِ عروج قرار پاتا ہے۔ حالانکہ صنفِ سلام کا آغاز بھی دکن سے ہی ہوا۔ چنانچہ انصاف کا تقاضہ ہے کہ کسی بھی صنف کی ارتقائی شکل دیکھکر اس کے آغاز و ابتداء کو فراموش نہ کریں۔

یہ حقیقت سے بعید نہیں کہ انیس و دبیر کا عہد صنفِ سلام کے لئے دورِ عروج قرار پاتا ہے لیکن اسکا خمیر تو دکن ہی میں تیار ہوا۔ نہ صرف اس صنف کا آغاز دکن میں ہوا بلکہ ہر عہد میں سلام گوئی کی روایت برقرار رہی۔

چنانچہ ہر دور میں صنفِ سلام پر طبع آزمائی کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے جن میں روایتی انداز میں سلام کہنے والے بھی ہیں اور ترقی پسند رجحان کے حامل شعراء بھی نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد کے شعراء میں برق موسوی کا تذکرہ نہ کرنا ادب ناشناسی ہوگی آپ کا شمار میدانِ سخن کی معروف شخصیتوں میں ہوتا ہے

برق موسوی :-

میر کاظم علی موسوی نام برق تخلص کرتے تھے۔ ایسے خاندان کے فرد تھے جس کے قدم صدیوں سے میدانِ سخن میں جمے ہوئے تھے۔ جو اس میدان میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ سرزمینِ دکن سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں شہید شعلہ، رعد اور لمعہ کے نام سے اپنی شناخت رکھتی ہیں۔

برق میر نادر علی رعد کے فرزند تھے۔ ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے رعد سابق ریاستِ حیدرآباد دکن میں طبیب تھے ساتھ ہی انھیں ایک صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ برق کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کمسنی سے ہی شاعری کا آغاز ہوا۔ جس سے متعلق ڈاکٹر اکبر علی بیگ صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی جنھیں برق موسوی کے بھانجے ہونے کا شرف حاصل ہے اپنی تصنیف "خوش نفساں" میں تحریر کرتے ہیں

"بارہ سال کی عمر میں شفیق ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ برق صاحب کو اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی۔ اس وابستگی کی بناء پر انھوں نے بارہ سال کی عمر میں اپنا یہ پہلا شعر کہا"[1]

---

[1] خوش نفساں از ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص ۱۱۵

ہوا ظاہر یہ مجھ پر والدہ کی موت سے ناظم
کہ دنیا میں فقط بے لوث اک ماں کی محبت ہے

مندرجہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ برق پہلے اپنے نام کی مناسبت سے ناظم تخلص کرتے تھے بعد میں برق اختیار کیا اور برق موسوی کے نام سے شہرت پائی۔

کچھ ہی عرصے میں یعنی پندرہ سال کی عمر تک شاعر بن چکے تھے۔ کلام کو دیکھ کر برق کے والد نادر علی رعد نے خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن وہ طبیب تھے اور چاہتے تھے کہ برق بھی پڑھ لکھ کر اچھے طبیب بنے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے انھوں نے برق کو نظامیہ طبی کالج میں داخل کروایا۔ لیکن برق نے اس میں کچھ خاص دلچسپی نہ لی۔ بلکہ کالج جانے کے بجائے کسی چمن میں بیٹھ کر شاعری کیا کرتے اس طرح رعد کی خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی۔ بالآخر ان پر ملازمت کی ذمہ داری عائد کر دی گئی۔

برق نے نظم اور غزل دونوں پر طبع آزمائی کی نظم گوئی سے متعلق ڈاکٹر اکبر علی بیگ اور نصیر الدین ہاشمی دونوں ہی انھیں جوش سے متاثر بتلاتے ہیں نصیر الدین ہاشمی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"برق نظم نگاری کرتے ہیں اور غزل گوئی بھی انکے کلام میں جوش کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اس رنگ میں کامیابی سے لکھ جاتے ہیں کہ جوش کے کلام کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ انکی شاعری میں مزدوروں کی فریاد، غریبوں کا درد، مظلوموں کے آنسو، بیداری، تڑپ، مناظر قدرت کی دلکشی اور دلفریبی نظر آتی ہے" [1]

---

[1] دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی ص ۴۳۰

برق اردو زبان کے علاوہ فارسی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ بزم سعدی کی محفلوں میں ان کی ذات ہی سے رونق رہتی برق نے حکومتِ ایران کی دعوت پر ایران کا ثقافتی دورہ بھی کیا۔

برق فن عروض میں قدرتِ کامل رکھتے تھے۔ شاعری میں اوزان اور بحور کی سختی سے پابندی کرتے اور دوسروں کے کلام کو بھی اسی کسوٹی پر کستے تھے۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی جو بالکل شعرا کے کلام کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور اساتذۂ فن جیسے غالب، اقبال اور جوش پر تنقید کرتے ہیں اور اپنی شاعری کو ان تمام پر فوقیت دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی شاعری پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا وہ اپنے آپ کو سب بڑا استادِ فن سمجھتے ہیں لیکن برق ہی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے یگانہ چنگیزی کے کلام کو فن عروض کی کسوٹی پر کستے ہوئے ان کی شاعری پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے جو حیدر آباد سے شائع ہونے والے "محفل" حیدر آباد میں ہفتہ وار میں بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ برق موسوی کے اردو اور فارسی گراں بہا سرمائے کی تفصیل کچھ اس طرح ملتی ہے

عقل و جنوں، کنول بہاریہ، للکار، گل بانگ، فردا ب و فرداب، نغمہ و الہام (فارسی)

ارزندہ و زندہ۔

ان شعری مجموعوں کے علاوہ نثری سرمائے میں دین یا رجنگ اور

عزیز جنگ ولا کی سوانح بھی فارسی میں ملتی ہے اس کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے جس میں "ید بیضا" کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ مخطوطے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ سلاموں کا نادر و نایاب مجموعہ ہے۔ تحریر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ "ید بیضا" کہلانے کے مستحق ہے۔ مجموعے پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے

موسوی زادہ ام اعجاز جو موسیٰ دارم
داغ تابندۂ دل چوں ید بیضا دارم

یہ مجموعہ ڈاکٹر اکبر علی بیگ کی ملکیت ہے

ایک سلام جو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

سلام

کلامِ حق سے ہے یہ امر ثابت علی اہل ایماں پر
محبت فرض ہے آلِ نبی کی ہر مسلماں پر

فضاء میں آج تک گونجی ہوئی ہیں جس کی آوازیں
چھڑا تھا کربلا میں کیسا نغمہ بر لبِ جاں پر

حسین ابن علی کے واقعے کے بعد دنیا نے
اٹھا کر رکھ دیئے تاجوں کے قصے طاقِ نسیاں پر
وہ دنیا دی حکومت کے لئے کیا جنگ فرماتا
ازل سے تا ابد جو حکمراں ہو قلبِ انساں پر

مٹائے مٹ نہیں سکتا وہ قانونِ تغیر سے

لہو سے تو نے جو کچھ لکھ دیا ریگِ بیاباں پر

ثنا خواں آلِ احمد کا ہوں برقؔ موسوی میں بھی

نہیں شاہوں کی مدّاحی کا دھبہ میرے داماں پر [1]

برق شاعر مداحِ اہلبیت ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ سلام منقبتی انداز رکھنے کے ساتھ ساتھ ساری انسانیت کے لئے ایک درسِ اخلاقی ثابت ہوتا ہے۔ ایک اور سلام کے سارے اشعار میں برقؔ بہ حضور سید الشہدا سلام بھیجتے ہوئے آپ کی ہستی کو ساری انسانیت کے لئے درس قرار دیتے ہیں۔

سلام

سلام اس امام پر پیام جس کا جہاں کو ایک درسِ زندگی ہے

سلام اس پر کلام جس کا کلامِ حق گفتۂ نبیؐ ہے

سلام اس پر مقام جس کا بلند ہے اکثر انبیاء سے

سلام اس پر نظام جس کا نظام حریت و خودی ہے

سلام اس پر کہ کام جس سے لیا مشیت نے سب سے مشکل

سلام اس پر کہ عام جس سے جہاں میں تبلیغِ حق ہوئی ہے

سلام اس پر سلام جس پر خدا نے بھیجا نبیؐ نے بھیجا

سلام اس پر مدام جس پر سلام ارباب و آگہی ہے

سلام اس پر متام جس کے گدا کا سنا ہوں سے بھی ہے برتر

سلام اس پر غلام جس کے غلام کا برقِ موسوی ہے

سلام کے چوتھے شعر میں قرآن مجید کی وہ آیت کا مفہوم مستعار لیا گیا ہے جس میں

سلام کی تاکید کی گئی ہے (سورۂ احزاب آیت ۵۸)

۱۸ جنوری ۱۹۷۹ء کو برق یہ کہتے ہوئے اس دارِ فانی سے دار البقا کی طرف روانہ ہوئے

آہ برقِ موسوی کیا زندگی کا اعتبار

ہے میری تصویر کا کاغذ بھی مجھ سے پائیدار

اردو کے ترقی پسند شعراء کی فہرست میں شاہد صدیقی کا نام بھی ملتا ہے

جو غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ شاہد صدیقی حیدرآباد کی نئی

نسل میں سب سے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ابتداء میں ان کی غزل بھی عشق و عاشقی کے

جذبات کی ترجمان تھی۔ لیکن دوسرے غزل گو شعراء کی طرح عاشق قرار نہیں پائے

حیدرآباد میں ان کے سلام بھی شہرت کے حامل ہیں۔

شاہد صدیقی :۔

عبدالمتین نام اور شاہد تخلص کرتے تھے آگرہ کے رہنے والے تھے ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے علم نہیں ہو تا کہ کن حالات کے تحت آگرہ سے ترک تعلق کرکے حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا۔ نظم اور غزل گوئی میں مہارت رکھتے تھے شاہد کے تفصیلی حالات کا علم نہ ہو سکا کہ تعلیم کہاں تک پائی تھی اور شاعری کا آغاز کب ہوا۔ نفیرالدین ہاشمی بھی شاہد کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈال نہ سکے اس تعلق سے ان کا یہ بیت ہی مختصر سا بیان ملتا ہے

"شاہد صدیقی بھی ترقی پسند شعراء میں شامل ہیں
نظم اور غزل گوئی میں دستگاہ۔ نوجوان شعراء
میں شاہد کا مقام بہت بلند تھا"[1]

شاہد صدیقی طنز و مزاح نگاری میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ روزنامہ "سیاست" "کوہکن" کے عنوان سے ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ ان کی شہرت ہوئی اخبار "صبح دکن" میں بھی ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ یعنی بیک وقت شاہد نے بحیثیت شاعر، صحافی، اور ادیب شہرت حاصل کی۔

شاہد حاضر جواب مخلص بذلہ سنج اور لطیف مزاج رکھتے تھے جگر مرآدآبادی جو ان کے خاص احباب میں شمار کئے جاتے تھے وہ شاہد صدیقی کی دوستی پر ناز کرتے ہیں۔ شاہد صدیقی کے غزلیات کا مجموعہ "چراغ منزل"

---

[1] دکن میں اردو — نفیرالدین ہاشمی ص ۲۳۷

کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں جگر مراد آبادی "شاہد صدیقی میری نظر میں"
کے عنوان سے لکھتے ہیں

"شاہد صدیقی کا سب سے بڑا کمال شاعری ہے جس کے
لئے انھوں نے اپنی زندگی اور دماغی صلاحیت وقف
کر رکھی ہے یوں تو ان کا خمیر اسی خاک پاک سے
تیار ہوا ہے جسے جغرافیہ اور تاریخ میں اکبر آباد یا
آگرہ کہا جاتا ہے اور جس نے میر، غالب اور
سیماب کو جنم دیا لیکن پچیس سالہ مشق نے
ان کی صلاحیت شعری میں ایسی پختگی اور موزونیت
پیدا کر دی ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے
موزوں طبیعت، تخلیقی دماغ اور زندہ دلی نے ان کی
شاعری کو زندہ شاعری بنا رکھا۔"[1]

شاہد کے ہاں غزل دونوں رنگ میں ملتی ہے ایک روایتی اور دوسری زندگی کے مسائل پر مبنی۔ مسائل غزل جو ترقی پسند تحریک کی دین ہے ابتدا میں عشقیہ رنگ ملتا ہے لیکن بعد میں انھوں نے غزل میں عشقیہ رنگ سے گریز کیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی شعر انہیں ملتا ہے جو عشقیہ رنگ میں رنگا ہو۔ غزل کے مسائلی رنگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے "غزل اور مسائل غزل" میں کوثر حفیظ قتیل لکھتے ہیں

---

[1] مقدمہ چراغ منزل از جگر مراد آبادی ص ۵

"ان کی غزل کا ہر شعر زندگی کے مسائل میں سے کسی نہ کسی
مسئلہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہیکہ
ان کا ہر شعر ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کہ مسائل کا
یہ لداؤ انھوں نے اپنے سر کیوں لے لیا ہے۔ غالباً
شاید اپنے ساتھ غزل کو بھی ترقی پسند بنانے کی دھن
میں غزل سرائی چھوڑ کر مسائل سرائی پر اتر آئے ہیں"[1]

شاہد صدیقی چونکہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے لہذا تصانیف "غزل اور مسائل غزل" اور ان کے شعری مجموعے "چراغ منزل" میں شاہد کی شخصیت کا جائزہ بحیثیت غزل گو ہی لیا گیا ہے۔

پیش نظر مقالہ اگرچہ کہ صنف غزل سے متعلق نہیں ہے لیکن باوجود اس کے شاہد صدیقی کی غزل گوئی پر اس لئے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کے انداز فکر سے واقفیت ہو۔ کیونکہ ترقی پسند شاعر چاہے کسی بھی صنف پر طبع آزمائی کرے وہ "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کے نظریے کو ملحوظ خاطر رکھے گا۔

شاہد صدیقی کے سلام بھی کچھ کم شہرت کے حامل نہیں اس میں بھی سلام کا وہ روایتی انداز نہیں ملتا بلکہ ترقی پسند رجحان ملتا ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میدان کربلا جو امام حسینؑ اور ان کے خانوادے کے لئے ایک امتحان کی منزل تھی جس کے اللہ تعالیٰ حق و باطل کی شناخت کروانا چاہتا تھا۔ شاید عصر حاضر بھی ہمارے لئے

---

[1] غزل اور مسائل غزل حفیظ قتیل ص ۱۲۴

صلوات بر محمدؐ صلوات بر محمد بر پاک آل امجدؐ صلوات بر محمدؐ (احمد)

دکن میں اسلام کے ابتدائی نمونے مرثیے یا مثنوی کی ہیئت میں ملتے ہیں مرثیہ غزل کی ہیئت میں لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ سلام جب [illegible] تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ مرثیہ اور سلام ان دونوں اصناف میں کوئی نہ کوئی نمایاں فرق ہو جسکی وجہ سے وہ رثائی شاعری میں اپنی شناخت رکھ سکیں۔ لہذا صنف سلام کیلئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اسکی ردیف سلام علیک، سلام، مرحبا، سلامی یا صلوات سے ہٹ کر ہو۔

ڈاکٹر محمد چراغ علی دکن میں صنف سلام کیلئے مخصوص ردیف کا تعین اور اسکے جو اسباب بتاتے ہیں اسکے مطالعہ سے تسلی کے اس نظریے کی دکن کی حد تک تو تردید ہوتی ہے کہ سلام مرثیے کی متبادل صنف ہے جو مسدس مرثیے کے رواج پانے کے بعد لوگوں کے مذاق کے مطابق ایجاد ہوئی۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں کہ :-

"اردو شعر و ادب میں سلام ایک ایسی صنف سخن ہے کہ جسمیں غزل کی عروضی ہیئت کے اندر رسول اکرمؐ، آئمہ کرامؑ، اہلبیتؑ اطہار اور خاصان خدا کی سیرت اور انکے کارنامہ کی تشریح و تفسیر بیان کیجاتی ہے خصوصاً کربلا کے ہیرو حضرت امام حسینؑ اور انکے اعزاء و انصار کا تذکرہ پیش نظر ہوتا ہے۔" [1]

لیکن شمیم احمد اپنی تصنیف "اصناف سخن اور شعری ہیئتیں" میں صنف سلام کا تعارف یوں پیش کرتے ہیں کہ جس سے صنف سلام کے مرثیے کے متبادل ہونیکے نظریہ کی تردید ہوتی ہے،

---

[1] بزم نگاران کربلا از ڈاکٹر صفدر حسین ص ۱۶۷

ایک ایسا ہی امتحان ہے لہذا منزل تک پہنچتے پہنچتے اگر ہمارے قدم ڈگمگا جائیں تو حسینؑ کو آواز دینا ہوگا اور اگر کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہو تو علیؑ کا سہارا تلاش کرنا ہوگا۔ یعنی عزم حسینؑ اور شجاعت شاہِ مرداں کی تقلید کرنی ہوگی۔

سلام

جفا کی ظلمت نوازیوں میں وفا کی شمعیں جلا رہے ہیں
حسینِ نورِ حیات بن کر تمام عالم پہ چھا رہے ہیں
امام برحق کو ہر زمانے میں ربط ہے کاروبارِ حق سے
پیمبری ختم ہو چکی ہے مگر پیامات آ رہے ہیں
حسینؑ کے ساتھیوں کی راہوں میں حشر تک روشنی رہے گی
یہ اہلِ ہمت ہوا کے رخ پر چراغ اپنا جلا رہے ہیں۔
یہ ظلمت و نور کا تصادم ازل سے جاری ہے زندگی میں
یزید شمعیں بجھا رہا ہے حسینؑ شمعیں جلا رہے ہیں
خود آگہی منزلِ حضوری مقامِ غفلت مقامِ دوری
شعور بیدار ہو رہا ہے حسینؑ نزدیک آ رہے ہیں
علیؑ کو آواز دیکے اٹھیے اگر نہیں ہے کوئی سہارا
حسینؑ کا نام لیکے بڑھیے اگر قدم ڈگمگا رہے ہیں
میری نگاہوں میں بزمِ ماتم بھی منزلِ امتحاں ہے شاہد
جنھیں مشیت نے آزمایا وہ اب ہمیں آزما رہے ہیں [1]

---

[1] رسالہ "الکرار" ہفتہ وار مدیر شاہد حیدری اگست ۱۹۶۲ء ص ۳

یوں تو شاگردانِ نجم کی کثیر تعداد ملتی ہے لیکن یہ فہرست اس وقت تک نامکمل ہے جب تک کہ شجیع کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔

نواب میر شجاعت علی خاں شجیع :۔

نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ، شجیع تخلص کرتے تھے نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ شجیع ۱۵ ر ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ مولوی انوار اللہ خاں فضیلت جنگ سے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ اور اس دور کے اعتبار سے ادبیات کی تعلیم علامہ نظم طباطبائی سے حاصل کی۔ حیدرآباد میں معظم جاہ کی یادگار باغ عامہ اور معظم جاہی مارکٹ ہے۔ شجیع اپنے دور کی اہم سیاسی شخصیت رہے ہیں۔ دربارِ شجیع کے بارے میں صدق جائسی نے تصنیف "دربار دربار" کے نام سے ملتی ہے۔ جس میں اس عہد کی جاگیر داری تہذیب کے عروج کا داستانی انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔

شجیع کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں شاعری سے والہانہ دلچسپی تھی ان کے دربار سے جوش، فانی، صدق جائسی، نجم آفندی، علامہ ناصر زیدپوری وغیرہ وابستہ رہے ہیں۔ نجم تو ان کے باقاعدہ استاد تھے۔ لہذا شاعری بالخصوص مذہبی شاعری پر نجم آفندی کا اثر ملتا ہے۔ مذہب سے شجیع کی وابستگی اور اہلبیتِ اطہار سے ان کی دلی عقیدت والہانہ تھی۔

یوں تو شجیع نے روایتی انداز کی غزلیں بھی لکھیں ہیں۔ لیکن وہاں بھی

اُن کی عقیدت جھلک پڑتی ہے۔ غزل کا مقطع ملاحظہ ہو۔

مرتبہ میرا پوچھ کچھ نہ شجیع
درِ مشہد پہ پاسبانی کی۔

شجیع نے صنفِ مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ کل چار مراثی ملتے ہیں جن میں سے تین غیر مطبوعہ ہیں۔ اور ایک مرثیہ "دستورِ شہادت" کے عنوان سے ملتا ہے۔ اپنے اُستاد نجم اور جوش و آلِ رضا کی طرح عنوان کے تحت مراثی ملتے ہیں۔ اور ان ہی کی تقلید میں شجیع نے "دستورِ شہادت" کو مرثیے کے بجائے مدتس لکھا ہے لیکن مدتس صنف نہیں بلکہ ہیئت ہے

علم و ادب کی ترقی میں شجیع کا دربار ایک خاص مقام رکھتا ہے اگرچہ کہ شجیع کافی معروف ترین شخصیت تھے لیکن باوجود اس کے شعر و شاعری کا ایک خاص وقت مقرر ہوا کرتا۔ جس میں باکمال شعراء اپنا کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔ شجیع کی طبیعت بھی بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ اور شاعری آپ کا محبوب ترین مشغلہ بن چکی تھی۔ یقیناً اسکا سبب یہی تھا کہ شجیع نے شاعری وراثت میں پائی تھی۔

شجیع کا زیادہ تر کلام غزلیات پر مشتمل ہے جو دیوان کی شکل ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف اخبارات جیسے "صبحِ دکن" اور "رہبرِ دکن" میں بھی آپ کی غزلیات شائع ہوتی رہیں۔

کلام میں سلاست، سادگی، معنی آفرینی اور جدت نگاری نظر آتی ہے۔ چنانچہ مشکل سے مشکل خیال کو عام فہم انداز میں ادا کر جاتے ہیں۔

مطلع و مقطع معنی آفرینی اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے

صنفِ غزل اور مرثیہ کے علاوہ شجیع نے مناجات، قصائد اور صنفِ سلام پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ دیگر اساتذۂ فن کے علاوہ نجم آفندی کو ان کے باقاعدہ استاد ہونے کا شرف ملا۔ "نجم آفندی بحیثیت شاعر" کے عنوان سے عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاض فاطمہ کا تحقیقی مقالہ ملتا ہے یہ مقالہ ایم۔فل کے لئے لکھا گیا ہے جس میں موصوفہ اس تعلق سے لکھتی ہیں کہ

"یہ ایک حقیقت ہے کہ شجیع کے شاعرانہ ذوق کو جلا دینے میں اس وقت کے اساتذۂ فن کی صحبتوں کا بڑا دخل رہا لیکن نجم نے ان کے فنی شعور کو جلا دی اور ایک سمت دراہ عطا کی۔"[1]

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نجم آفندی ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد آئے اور دربار شجیع سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء یعنی بارہ برس تک یہ بہ پابندی دربار شجیع میں حاضری دیتے رہے۔ اگرچہ کہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء بھی نجم کا تعلق دربار شجیع سے رہا لیکن وہ پابندی باقی نہیں رہی۔ لیکن اتنا زیادہ عرصہ نجم کی صحبت میں گزارنے کے بعد شجیع کی شاعری میں نجم کا رنگ پایا جانا کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

کلام کے مجموعے اس طرح ملتے ہیں

---

[1] نجم آفندی بحیثیت شاعر از ریاض فاطمہ ص ۵۲
مقالہ برائے ایم فل عثمانیہ یونیورسٹی

مناجات کا مجموعہ "عرض و ثناء" اور غزلیات کا مجموعہ "شہ پارے" کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سلام، قصاید، منقبت وغیرہ مختلف روزناموں وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ لہذا یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ شجیع کا غیر مطبوعہ کلام کتنا ہے۔

"دستورِ شہادت" جو مطبوعہ مرثیہ ہے۔ اس کے آخر میں تین سلام ملتے ہیں۔ ان سلاموں سے پہلے مندرجہ رباعی ملتی ہے۔ یہ شجیع کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

رباعی

دل جذبِ محبت سے تڑپا جاتا ہے — روضہ مری آنکھوں میں سما جاتا ہے
اُس وقت میں کربلا میں ہوتا ہوں شجیع — جب نام حسینؑ لب پہ آجاتا ہے

سلام مرا لحظہ ہو۔

سلام

اکبر ہیں سب حسینؑ کی خو بو لئے ہوئے — دردِ دلِ رسول کا پہلو لئے ہوئے
آراستہ ہے جعفرِ طیار کا علم — عباس بھی ہیں نذر کو بازو لئے ہوئے
جھولا بھی شیر خوار کا خالی ہے گود بھی — ماں چپ کھڑی ہے آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے
جنگل مہک رہا ہے ورودِ حسینؑ سے — بادِ صبا ہے پھولوں کی خوشبو لئے ہوئے
آنکھوں میں اشک تلتے ہیں آواز کے عوض — ہم خود ہیں حشر میں یہ ترازو لئے ہوئے
دیکھے کوئی حسینؑ کے قبضہ میں کائنات — مٹھی میں ہیں رسولؐ کے گیسو لئے ہوئے
نیزوں پہ آفتاب، صداقت ہے جلوہ گر — اہلِ وفا کے سر ہیں شفا جو لئے ہوئے
میداں میں شہ کی تیغ سے ہے ایک معرکہ — اک زلزلہ ہے حبشیؔ ابرو لئے ہوئے
نذرِ حسینؑ ہی مری فکرِ سخن شجیع — ہر لفظ میں نجات کا پہلو لئے ہوئے

مندرجہ سلام منقبتی ہے اور اخلاقی درس بھی دیتا ہے اس میں کربلا والوں کی ایثار و قربانی کا جذبہ ملتا ہے ۔

میر محمد باقر رضوی امانت خانی :۔

باقرؔ کا شمار دورِ حاضر کے مشہور مرثیہ نگار شعراء میں ہوتا ہے

یہ حیدر آباد میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے ۔ باقرؔ کے آباؤ اجداد ایران سے ۹۳۹ھ میں ہندوستان آئے ۔ ان کے بزرگوں میں امانت خانی نامی ایک بزرگ گزرے ہیں ۔ باقرؔ انھیں کی اولاد سے ہیں ۔ جس کی وجہ سے امانت خانی کا نام آج تک زندہ ہے ان کے والد کا اسم گرامی میر زین العابدین تھا ۔

باقرؔ کی ابتدائی تعلیم اپنے ماموں اور والد کی نگرانی میں ہوئی ۔ ان کے ماموں مولوی مرزا ببادر علی صاحب قبلہ صفی حیدر آبادی تھے جنھیں فرقۂ شیعہ کے علماء میں شہرت حاصل تھی ۔

باقرؔ نے دارالشفاء اسکول ، جاگیر دار کالج اور سٹی کالج میں تعلیم پائی ۔ انھیں بچپن سے ہی شاعری اور مصوری کا بڑا شوق تھا ۔ چنانچہ ۲۲ سال کی عمر سے آپ نے میدانِ سخن میں قدم رکھا ۔ اور ابتداء میں اپنے ماموں مولوی مرزا ببادر علی صاحب صفی حیدر آبادی سے اصلاح لیتے رہے ۔ ان کے انتقال کے بعد دکن کے مشہور و معروف شاعر میر محمد علی مسرور کے شاگرد ہو گئے ۔

باقرؔ نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن شاعری کی ابتداء اپنے استاد کی طرح صنفِ سلام سے کی ۔ اس کے بعد قصیدے ، رباعیات ، قطعے نظمیں ، غزلیں ، نوحے ، مرثیے اور مسدس بھی کہے ہیں ۔ غزلیات کا ایک

غیر مطبوعہ مجموعہ "لالۂ سبز" کے نام سے ہے۔ اس میں غزلیات کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ سلاموں کے مجموعے "ترجمانِ غم" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ کل سلاموں کی تعداد پانچ سو تر سٹھ ۵۶۳ ہے تقریباً دو سو ۲۰۰ نوے دو سو ۲۰۰ قصیدے، پچیس ۲۵ مدس، ایک سو اسی ۱۸۰ کے لگ بھگ رباعیات قطعات، اور تاریخی قطعات بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔

باقر نے ۱۹۵۲ء سے مرثیہ گوئی کا آغاز کیا اور عنوان منتخب کر کے مراثی لکھتے رہے۔ سب سے پہلا مرثیہ "تصویرِ اجرِ رسالت" ہے جو (۸۴) بند پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مرثیوں میں بند کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن طویل مرثیہ لکھنا ہی کوئی فن نہیں بلکہ مرثیے میں وہ تمام اجزا کی پابندی لازمی ہے جو اس کے لئے ضروری ہیں۔ اس شرط پر باقر کے مراثی پورے اترتے ہیں۔

ذوقِ ادب کے لحاظ سے بہار، ساقی، نالے، اور مناظرِ فطرت کی عکاسی ملتی ہے دکنی شاعر ہونے کے باوجود باقر کے ہاں انیس و دبیر کے کلام کے جملہ عناصر ملتے ہیں۔ باقر نے زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات اور نظریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا رنگ بدلا اور یہی جدید انداز وقت کی ضرورت تھا۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ باقر نے کل پانچ سو تر سٹھ ۵۶۳ سلام کہے ہیں جو "ترجمانِ غم" کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے سلام وقت کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سلاموں کو روایتی کہنا بیجا ہوگا۔ ان کے ہاں سلام کا مقصد صرف جذباتِ عقیدت کا اظہار یا اظہارِ رنج و غم نہیں۔

"ترجمانِ غم" حصہ چہارم میں "اقتضائے زمانہ" کے عنوان سے ان کے کچھ اشعار ملتے ہیں جس کا پہلا شعر اسطرح ہے۔

؎ کرو مضبوط بنیادیں تقاضا ہے زمانے کا
نہ باقی رہ سکیگا ورنہ تنکا آشیانے کا

ان کا سارا کلام اسی جذبے کی پابندی کرتا ہے اپنے کلام کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

؎ بیاں ایسا ہو ان میں کر دے جو بیدار سوتوں کو
ہنسائے بعد پھر اس محفلِ عالم میں روتوں کو

آگے صنفِ سلام اور صنفِ قصیدہ کے مقصد سے متعلق لکھتے ہیں کہ

؎ سلاموں اور قصیدوں کا جو مقصد ہے رہے باقی
مگر ان میں ہو کچھ اصلاحِ قومی کی بھی ذمہ داری

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے صرف اصلاحِ قومی کے مقصد کے تحت ہی سلام پیش کئے بلکہ ان کے ہاں رثائی سلام بھی ملتے ہیں۔ عنوان "ترجمانِ غم" کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

؎ غم گفت رہا تعاد لمیں شہ مشرقین کا
باقر ترا کلام ہوا "ترجمانِ غم"

ایک سلام ملاحظہ ہو جو کہ خالص رثائی انداز رکھتا ہے

سلام

مرگِ خواہر کی خبر دینے کو آئے نہ کوئی　　پائے سجّاد کی زنجیر ہلائے نہ کوئی
کہاز سیب نے دھڑکنے نہ لگے قلب رباب　　خالی جھولا بھی کسی وقت جھلائے نہ کوئی
چاک ہو جائے نہ بالو کا کہیں دامنِ صبر　　کرتے اصغر کے بھی سامنے لائے نہ کوئی
اشک ٹپکے جو سکینہ کے یتیمی نے کہا　　عرشِ خالق کو طمانچوں سے ہلائے نہ کوئی
روشنی چاہتا ہوں قبر کے اندر باقر　　میری تربت پہ کبھی شمع جلائے نہ کوئی

دوسرا سلام ملاحظہ ہو جو خالص رثائی نہیں بلکہ اس میں اخلاقی درس ملتا ہے

سلام

ترقی علم نے کی پھر بھی وہ جوہر نہیں ملتا　　سلونی جو کہے وہ صاحبِ منبر نہیں ملتا
برے اخلاق اپنے اپنے ورثہ کے ہوئے غاصب　　مسلمانوں کو حسنِ خلقِ پیغمبر نہیں ملتا
نہ جب تک دور ہو جائے ہمارے پست ذہنیت　　دلِ حیدر بڑی شئے ہے دلِ قنبر نہیں ملتا
نبوت کے ہوا کرتے ہیں دعوے یوں تو آئے دن　　کہے "من کنت مولا" جو وہ پیغمبر نہیں ملتا
بہت ہیں قافلہ سالار بننے کے لئے راضی　　ہر لیٹاں کاروانِ قوم کا رہبر نہیں ملتا
تھپیڑے ہیں زمانے کے تھپیڑے ہیں حوادث کے　　ہمارے ناخداؤں کو کوئی لنگر نہیں ملتا
زمانہ ساز کی چوکھٹ پہ جھکتے ہیں ہزاروں سر　　ہتیلی پر جو آئے دوش سے وہ سر نہیں ملتا
رگوں میں خونِ فاسد بن گئی تقلید کورانہ　　ہماری موت سے کہدو شفا کا در نہیں ملتا
مسلماں کے ارادوں کو ضرورت اسکی ہے باقر　　مگر مسلم کو عزمِ فاتحِ خیبر نہیں ملتا

لہ ترجمانِ حصہ چہار　　باقر امانت خانی ص ۶

اس طرح باقر کے مراثی بھی طرز جدید کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کل (۳۴) مراثی کے ہر سال ۱۲ محرم کو دلیور ھی نواب عنایت جنگ کی مجلس میں اپنا تصنیف مرثیہ سنایا کرتے تھے۔ ان کی ادبی خدمات اور مداحی اہلبیت کی بناء پر انجمن طلبائے قدیم مدرسہ جعفریہ دارالشفاء نے انھیں ۱۶ جون ۱۹۶۸ء کو "مدثا عزملت" کے لقب سے نوازا۔

باقر بیک وقت مصور اور شاعر تھے جس کی گواہی ان کا پہلا مرثیہ "تصویر اجر رسالت" سے ملتی ہے نواب شہید یار جنگ شہید اردو شعراء کے منظوم تذکرے میں موصوف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

؎ ایسی فضا میں ہے باقر کا بھی کلام بلند
مصوری کا نمونہ ہے اس کا ایک ایک بند

مرحوم لفظی تصویروں کے ساتھ لکیروں اور رنگوں سے بھی تصویر بناتے تھے ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تصویر نام ہے پیکر تراشی کا، اگر سخن میں یہ پیکر ڈھلتے ہیں تو مجسمے بن جاتے ہیں۔ رنگ میں ڈھلتے ہیں تو تصویر بن جاتے ہیں اور الفاظ میں ڈھلتے ہیں تو اعلیٰ ترین شاعری وجود میں آتی ہے۔ جس کا اندازہ مندرجہ اشعار سے ہو سکتا ہے

؎ جس وقت تجھ سے شام کے زنداں کا در بنے
تصویر انتظار کی تار نظر بنے

"یہ ایک مخصوص قسم کی نظم ہوتی ہے جو عموماً غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے اور جس میں مرثیے کی مانند کربلا کے واقعات کا ذکر اور شہدائے کربلا کے فضائل حسنہ کے بیانات نظم کئے جاتے ہیں اسی کیساتھ مختلف اخلاقی مضامین بھی لائے جاتے ہیں۔"

کچھ اور جز زباں نہیں اہل سخن کے پاس — عبرائی کیا زباں کے سوا ہے دہن کے پاس
سمجھے یہ سب کہ عونؑ و محمدؑ ہوئے شہید — روتے ہوئے حسینؑ جو آئے بہن کے پاس
چلائی بانو دیکھ کے اصغرؑ کو قبر میں — مجھکو بھی گاڑ دے کوئی اس گلبدن کے پاس
صدمے سے کانپنے لگے عابدؑ کے ہاتھ پاؤں — جس وقت بیڑیاں نظر آئیں رسن کے پاس

"وہ نعتیہ نظمیں بھی جن میں حضور سرور کائنات کی تعریف کی جاتی ہے اور جن میں سلام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے سلام کہلاتی ہیں۔" [1]

پدم شری علی جواد زیدی مصنف "انیس کے سلام" سے شیخ چاند کے تصور سلام کی رائے لی گئی تھی کہ وہ شیخ چاند کے تصور سلام سے متفق ہیں یا نہیں جس پر موصوف نے اپنی گراں قدر رائے سے سرفراز کیا جسے مقالے میں لگانا اسلئے ضروری سمجھا گیا کہ مقالے کی زینت میں اضافہ ہو۔

"شیخ چاند نے ابتداء میں شبلی اور سلیم کے خیالات کا اعادہ کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات سلام کی ابتداء لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کی ایک ضمنی صنف کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تاریخی اور علمی ہر اعتبار سے ناقابل قبول ہے خود شیخ چاند نے اسکی ابتداء کے سلسلے میں کوئی قیاس آرائی نہیں کی۔ انہیں شبلی اور سلیم کے بیانات پر

---

[1] اصناف سخن اور شعری ہیئتیں — از شمیم احمد ص ۱۹۶

ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو ہر دل کو اپنے نشتر سے چیرتے ہوئے پار ہو جاتے ہیں

؎ لاشہ اٹھاتے وقت کہا انقلاب تھا
پیری حسینؑ کی تھی نبیؐ کا شباب تھا

مرثیے کی طرح سلام کے اشعار بھی نہ صرف روایتی انداز میں ملتے ہیں بلکہ طرز جدید اور عصری تقاضوں کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تاثراتی انداز بیان اور اشاریت سے ایک عام ذہین کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

باقرؔ نے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق اظہار عقیدت کی ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی اور اسی راہ پر چلکر انھوں نے دین و دنیا ہر دو جگہ اپنا مقام متعین کرلیا۔

باقرؔ کا کلام مجموعوں کی صورت میں اسطرح ملتا ہے

مراثی کے مجموعے "امانت سخن" "امانتِ غم" اور "زندہ نشانات" کے نام سے شائع ہوئے۔

"تسبیح خاک شفا" کے عنوان سے نوحوں کا مجموعہ ملتا ہے

"لالہ سبز" غزلیات کا مجموعہ ہے جو غیر مطبوعہ ہے

"ترجمانِ غم" سلاموں کے مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر صادق نقوی کا مضمون "انیسِ دکن" کے عنوان سے ملتا ہے جو حضرت باقر امانت خانی سے متعلق ہے۔ گویا ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صادق نقوی حضرت باقر امانت خانی کو "انیسِ دکن" قرار دیتے ہیں

لکھتے ہیں کہ

"حیدر آباد کی رثائی شاعری کی تاریخ میں شائد ہی
کسی ایسے شاعر کا تذکرہ آپ کو ملیگا جس نے باقر صاحب
سے زیادہ شعر مدح اہلبیت و ذکر شہیدان کربلا
میں لکھے ہوں" [1]

بحیثیت "انیس دکن" و "شاعر ملت" اشعار کا بیش بہا اور انمول ذخیرہ رکھنے
پر وہ انیس کی طرح بجا طور پر اپنی ذات پر فخر کرتے ہوئے کہہ سکتے تھے

؎ مہری قدر کر سرزمین دکن تجھے ہمسر آسماں کر دیا۔

لیکن اس کے برخلاف مرحوم کے مزاج میں سادگی، انکساری اور حقیقت پسندی
تادم آخر باقی رہی۔ پسندیدہ کلام پر دل کھول کر داد دینے اور حوصلہ افزائی
کرنے میں آپ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

کسی بھی شاعر یا فنکار کی موت قوم کے لئے نقصان عظیم کا باعث ہوتی ہے
پھر ایسا شاعر جس کا کلام عصر حاضر کے شعر و ادب پر حاوی ہو۔ جو شاعر ملت ہو
جس کے کلام کا مقصد قوم کی اصلاح ہو۔ جو واقعات کربلا کو بطور درس پیش کرتا ہو
ایسے شاعر کی موت قوم کے لئے جس نقصان عظیم کا باعث ہوتی ہے اسکا اندازہ
ایک فنکار ہی بخوبی کر سکتا ہے۔ جناب رضا موسوی شاعر ملت کی موت پر اپنے
تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جس سے خصوصیات کلام پر بھی روشنی پڑتی ہے

---

[1] انیس دکن (ممنون) ڈاکٹر صادق نقوی شاہکار ہفتہ وار اربعین نمبر ۱۴۰۸ھ ص ۱۵ / ۱۷

قطعہ

مرثیہ ہو یا مدحت منقبت ہو یا سلام
حضرت باقر کا فن ہے سب پہ حاوی لاکلام
کرکے رحلت حضرت باقر جہاں سے اے رضا
دامنِ شبیر میں ہے پالیا اپنا مقام

شاعر ملت کی موت ایک ادبی خلاء کے مترادف ہے لیکن اس ادبی خلاء کا احساس اس وقت زیادہ سے زیادہ ہوتا جب عصر حاضر کے افق پر وحید اختر جیسی شخصیت نہ ابھری ہوتی ۔ جسے عصر حاضر کے شعراء میں کافی اہمیت حاصل ہے

ڈاکٹر وحید اختر :۔

ڈاکٹر وحید اختر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ضلع رائے بریلی کے قصبہ جائس کے قریب نصیر آباد نامی قصبہ ہے ۔ جسے اہل تشیع کے مجتہدین اور علماء کا مسکن کہا جاتا ہے ۔ گذشتہ دو سو برس میں خاندانِ اجتہاد کی عظیم شخصیتیں خاک نصیر آباد سے ہی اٹھیں جن میں مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ ، مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ ، مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ ، مولانا اولاد حسین شاعر اور مشہور مرثیہ نگار صحافی اور شاعر عبدی نظمی صاحب مرحوم ، ناظر خیامی صاحب مرحوم قابل ذکر ہیں ۔ اسی خاندانِ اجتہاد کے ایک بزرگ سید نذر عباس نقوی اورنگ آباد چلے آئے تھے ۔ جن کے ہاں ۱۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ایک صاحبزادے کی ولادت ہوئی ۔ جو وحید اختر کے نام سے ادبی دنیا میں معروف ہوئے ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۵۰ء میں اورنگ آباد سے میٹرک درجہ اوّل میں کامیاب کیا
انٹرمیڈیٹ میں آپ کے مضامین سائنس اور ریاضی رہے ۱۹۵۲ء میں
عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس کالج میں داخلہ لیا۔ فلسفہ، نفسیات اور
سیاسیات اختیاری مضامین کے ساتھ۔ ۱۹۵۴ء میں بی۔ اے کا امتحان
درجہ اوّل میں کامیاب کیا۔ بعد ازاں ۱۹۵۶ء میں فلاسفی سے ایم۔ اے
کیا اور ۱۹۶۰ء میں خواجہ میر درد کے تصوف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی
کی ڈگری حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی میں فلسفے کے لکچرر مقرر ہوئے۔
۱۹۷۵ء میں آپ اس شعبہ کے ریڈر اور ۱۹۷۹ء میں پروفیسر ہوئے
اور اب صدر شعبہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔
۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۷ء تین سال ایران میں انگریزی کے فلسفیانہ مجلّہ
"التوحید" کے قلم کار اور مدیر رہے۔ ایران جانے کا سبب انقلاب سے
دلچسپی تھی اور آپ کی اہلیہ بھی وہیں تھی۔ جن سے آپ کی شادی
۳۰ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ مرحومہ کا نام سیدہ صبیہ لقا قزلباش
تھا یہ ایک معزز اور علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔
۱۹۷۴ء میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا
چنانچہ کئی ادبی کتابوں کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔
آیت اللہ خمینی اعلی اللہ مقامہ کی "چہل حدیث" میں بارہ حدیثوں[۱۲]
کا ترجمہ انگریزی زبان میں اور دس حدیثوں کا ترجمہ اردو زبان میں
کیا۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں مشہور و معروف علماء کے مضامین کے ترجمے بھی کئے۔

وحید اختر کی ادبی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان میں سے ہر رُخ ایک تفصیلی مقالے کا متقاضی ہے۔ حیدرآباد یونیورسٹی مستقبل مبارکباد ہے کہ ڈاکٹر وحید اختر کی حیات اور شاعری پر ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ محترمہ ثمینہ شوکت کی نگرانی میں اطہر سلطانہ نے لکھا جس میں وحید اختر کی شخصیت پر نقاد اور مفکر کی حیثیت سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے

ڈاکٹر وحید اختر کے کئی مطبوعہ تصانیف، رسالے اور مضامین ملتے ہیں

وحید اختر نے ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں میدانِ سخن میں قدم رکھا۔ اور اس کی ابتداء آپ نے نوحہ و سلام سے کی۔ یہ سبب ہی حیرت انگیز بات ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر سے شاعری کی ابتداء کی لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ تمام کلام ضائع ہوگیا۔ اس دوران آپ نے کچھ مراثی بھی لکھے۔ لیکن وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

آپ نے تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ دسویں جماعت سے آپ نے غزل اور نظم لکھی جس کی اشاعت ۱۹۴۸ء میں ہوئی ۱۹۵۰ء میں ایک نظم "آنسو" کے عنوان سے 'ادب لطیف' لاہور میں شائع ہوئی۔

وحید اختر کو ذاکر اہلبیت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے اس کا سلسلہ سات سال کی عمر سے ایم۔اے کرنے تک جاری رہا۔ جس سے آپ کے عقاید اور دامنِ اہلبیت سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

وحید اختر کے ہاں مرثیہ نگاری کا آغاز ایک چیلنج کے طور پر ہوتا ہے

جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ میں تقرر کے بعد آبائی وطن نصیر آباد پہنچے۔ یہ محرم کا زمانہ تھا۔ ایک دن کلب عباس صاحب جو رشتے میں آپ کے پھوپھا تھے۔ ایک طرح سے چیلنج کیا کہ موجودہ دور کے شعراء کے لئے مرثیہ لکھنا ناممکن ہے۔ یہی چیلنج وحید اختر کے لئے مرثیہ گوئی کا محرک بنا اور انھوں نے سب سے پہلا مرثیہ در حال علی اصغر لکھا اور دوسرا مرثیہ علمدار فوج حسینی حضرت عباسؑ کی شہادت پر لکھا۔ اسطرح ۱۹۶۵ء سے مستقل مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ اسطرح انھوں نے پندرہ مراثی لکھے۔

وحید اختر کے مراثی ہوں یا سلام طرز جدید کے ترجمان ہیں۔ رثائی انداز بھی ملتا ہے آنسو ان کے ہاں صرف تطہیر جذبات کا کام ہی نہیں کرتے بلکہ تطہیر فکر بھی کرتے ہیں۔ اور اس بناء پر انھیں جوش، آل رضا کے مقابلے میں منفرد حیثیت حاصل ہے ان کے ہاں جدید حسیت ملتی ہے جو ان کا خاصہ ہے۔

شاعر کی تخلیق کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے وحید اختر کے بھائی حمید اختر کی خودکشی اور جولائی ۸۸ء میں اہلیہ کا المناک حادثہ، یہ ایسے واقعات ہیں کہ جس نے وحید اختر کی زندگی میں تلخیاں بھر دی۔ حالات کی ستم ظریفیوں نے ان کے اندر ایک بہت ہی نازک و حساس دل کو جنم دیا ہے

بچپن سے اب تک تلخیاں، محرومیاں، زندگی کی کڑی دھوپ

میں سوختہ جدوجہد تنہائی کا احساس ان سب نے ان کے انداز بیاں میں گداز قلب پیدا کیا ہے جو فانی کے الفاظوں میں خود ترحم کے زمانے کو بھی تڑپانا جانتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ وحید اختر نے ایسا موضوع منتخب کیا جو کائنات کی ابدی صداقت ہے اور ہر دور میں جس شمع ہدایت سے دنیا اکتساب نور کرتی ہے۔

وحید اختر نے بہت ہی گہرائی کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہے مغربی فلسفہ کے عالم ہونے کے ساتھ اسلام کے فقہا، مورخین پر کافی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ جس کے سبب ان کے یہاں جو فکری توازی ہے وہ تاریخ کی شخصیات کا معروض تجزیہ پیش کرتا ہے۔ یہ معروضیت اس وقت شدید وابستگی میں بدل جاتی ہے جب محمدؐ و آلِ محمدؐ کے تاریخی کردار ان کے سامنے آتے ہیں۔

سلام بعنوان "راستے میں کہیں کربلا بھی ہو" ملاحظہ ہو۔

راستے میں کہیں کربلا بھی ہو

ہے حکم اگر کہ مدح جفا و خطا بھی ہو۔ — لازم ہے ذکر قتلِ وفا و صفا بھی ہو

نادیدہ کائناتوں میں ہجرت کے قافلو — دیکھو کہ راستے میں کہیں کربلا بھی ہو

سیراب خوں فنا ہے تو اے رب دو جہاں — تشنہ لبوں کے جام میں آبِ بقا بھی ہو

جشنِ شبِ شہادتِ عشاق ہے تو پھر — کوئی عروس زیست کا دولہا بنا بھی ہو

شور اسلحوں کا جھوٹ کا غل نفرتوں کی چیخ — روشن اذانِ اکبر گلگوں قبا بھی ہو

بود و نبود معرکہ آراء ہیں اے حسینؑ — عشرت بھی ہو جلو میں کتابِ خدا بھی ہو

مشک و علم کے ساتھ سرابِ فرات میں — ناوک کی زد پہ لعل اُگلتا گلا بھی ہو

ظلمات اور نور کے چہروں کے درمیاں — جلتی ہوئی قنات کا پردہ کھینچا بھی ہو

کرنی ہے تار تار قبائے شبی اگر — ہو بھائی بے کفن تو بہن بے ردا بھی ہو

عابد اسیر ہو کے بھی بے کارواں نہ ہوں — ہمراہ طوق و دار بھی زنجیر پا بھی ہو
نیزوں پہ جگمگاتے چلیں ماہِ آفتاب — ناقوں پہ نقاب حدیث کساء بھی ہو
زینبؑ کے لب کلام کریں بن کے ذوالفقار — طوقِ گلو میں جوہرِ تیغِ حذا بھی ہو
دیوار گریہ قید کی دیواریں ہوں تو ہوں — غرقاب سیلِ اشک مئیں قصرِ جفا بھی ہو
کوفے سے شام تک ہے ہر اک گام معرکہ — یہ جنگ جیت جائیں تو سر کربلا بھی ہو
شاہوں کے سر سے تاج تو شانوں سے سر گریں — حیدرؑ کی ذوالفقار کا کچھ حق ادا بھی ہو

ہے آج بھی **وحید** ہر اک سانس کربلا
ایماں کے تن میں روح و دلِ کربلا بھی ہو

مندرجہ سلام تاثر کا المول نمونہ ہے۔ تاثر کے تیز نشتر تو نہیں ملتے بلکہ ایک ہلکی سی کسک اور تڑپ ہے جو دل کو تڑپا دیتی ہے اور انسان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیتی ہے۔

واقعہ کربلا حق و صداقت پر مبنی واقعہ ہے جس میں حضرت امام حسینؑ کا مقصد یہی تھا کہ سچائی کا ایک معیار قائم ہو جائے اور حق و باطل کا یہ امتیاز تا قیامت کھولے بھٹکے ہوئے انسانوں کے لئے منارۂ نور و ہدایت ثابت ہو۔

یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت کے حقیقت پسندوں نے اسکا اعتراف کیا ہے جس میں غیر مسلم شعراء کی خاصی تعداد نظر آتی ہے

جو ناقابلِ فراموش ہے۔ متقدمین میں دلگیر کا نام رثائی ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جانے کا مستحق ہے جنھوں نے تقریباً ساری عمر اپنے آپ کو رثائی شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا۔ خود ان کا تخلص اس کا غماز ہے۔

اسی طرح رثائی ادب کی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسا نہیں ملتا جس میں غیر مسلم شعراء نے اپنا کلام عقیدت بحضور سید الشہدا امام حسینؑ نہ پیش کیا ہو۔ لہذا اُن تمام شعراء کے نام گنوانا تو ناممکن ہے۔ لیکن عہد حاضر میں عرش ملسیانی، اور کالی داس گپتا رضا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عرش ملسیانی :۔

دورِ حاضر کے شعراء میں عرش ملسیانی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ عرش کو جوش ملسیانی کے فرزند ہونے کا شرف حاصل ہے بال مکند نام اور عرش تخلص کرتے ہیں نام کے ساتھ ملسیانی کا استعمال وضاحت کر دیتا ہے کہ قصبہ ملسیان سے تعلق رکھتے ہیں جو صوبہ پنجاب ضلع جالندھر میں واقع ہے۔ والدِ محترم جوش ملسیانی کو حضرت داغ کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔

عرش نہ صرف شاعر بلکہ مشہور ادیب اور رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

تصنیف "دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء" میں عبدالشکور

عرشؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی۔ تلمذ کسی سے
نہیں، ہاں یہ فیضان والدِ محترم ہی کا ہے کہ شعر کہنے
کی صلاحیت جِلا پاگئی۔ غزل اور نظم دونوں میں
طبیعت کام کرتی ہے"۔ [1]

کلام مختلف اخبارو ف اور رسائل میں شائع ہوتا ہے

عرشؔ نے بھی واقعہ کربلا کی حق و صداقت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کیا ہے
چنانچہ بارگاہِ حسینی میں صدقِ دل کے ساتھ اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں
سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

حق بات پہ وارتے ہیں تو لڑتے ہیں قضا سے — رکھتے ہیں عقیدت جو امام شہدا سے
کس طور سے ہوتا ہے کوئی فخرِ دو عالم — پوچھے کوئی مظلومیٔ ارباب وفا سے
اب تک ہیں زمانے کے لئے زندگی آموز — حیدرؑ کے جگر بند محمدؐ کے نواسے
شبیرؑ کے صدقے میں لٹا دوں اسے فوراً — ہو دولتِ کونین بھی حاصل جو خدا سے
ہر دامنِ اولادِ نبیؐ تک ہے رسائی — یہ فیض میسر ہے مجھے دستِ دعا سے
گلزارِ جناں سے ہیں کم مرتبہ ہرگز — وہ خاک جو گلرنگ ہے خونِ شہدا سے
اے دل! مجھے اس ارضِ مقدس پہ ہی لے چل — نسبت ہے بلند میں جسے عرشِ علا سے

اس دور میں بھی تازہ ہیں گلہائے عقیدت
محفوظ ہیں شاید یہ زمانے کی ہوا سے

---

[1] دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء از عبدالشکور ص ۱۵۶

صرف اعتراض کیا ہے۔ ان دونوں حضرات نے یہ فرض کرلیا تھا کہ
لکھنؤ کے مرثیہ گویوں نے غزل کا ایک پیرایہ اختیار کیا ہے اور ایسا
ذخیرہ تیار کیا کہ غزل کے عاشقانہ مضامین کو تھوڑا سا دوسرے جذبات
واردات قلب، حکیمانہ خیالات، فلسفیانہ نکات، اخلاقی اور
معاشرتی مضامین بھی بے تکلف سما سکیں۔ یہ بھی سلام کی آئیت
مشکل ضرور ہے لیکن نہ تو اتنی مشکل تھی اور نہ واحد۔

شیخ چاند کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ سودا، میر تقی میر اور میر ضاحک وغیرہ کے
سلام غزل کے علاوہ دوسرے عروضی اشکال میں بھی ہیں۔ ایسی صورت میں سلام کو صرف غزل کی
ہیئت میں محدود سمجھنا غلط ہے۔ اسی طرح اسمیں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ سلام غزل کی طرح
اور جگہ اس میں ایجاد کیا جائے۔

شیخ چاند نے لکھا ہے کہ سلام کے جو لوازم و مہمات موضوع حال کے سلام گو
شعرا نے مقرر کئے ہیں، انکی سودا کے زمانے میں تعیین نہیں ہوئی تھی۔ اس سے یہ گوشہ نکلتا ہے کہ
اسکے بعد ہوئی تھی یہ درست نہیں ہے۔ اہم شعرا یعنی انیس و دبیر و میر ضاحک کے پیش نظر
سلام موجود تھے جن کی لوازم اور مہمات موضوع کی حد بندی ہوئی ہے۔

میں نے انیس کے سلام میں واضح کر دیا ہے کہ سلام درطرز کے لکھے جاتے تھے۔
(۱) تعشر بیانی تمام تر ثنائی اور (۲) مرثیہ کے علاوہ اخلاقی اور معاشرتی مضامین اور جذبات
خیالات عکیمانہ پر مشتمل۔ انیس نے طرز دوم (۲) کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ طرز اول (۱) کی بنیاد ہی
سکتا ہے لیکن یہ جدت بھی کلی نہیں ہے اور سلاموں کا بڑا حصہ ۱۴ ویں شعر تک تسلیمات و رفیع پر مشتمل ہوتا ہے
سلاموں کی اتنی اہمیت ہے جتنی انیس کے سلام کے مختلف مثالوں ۔ ۔ ۔

کالی داس گپتا رضاؔ :۔

کالی داس گپتا نام اور رضا تخلّص کرتے ہیں۔

۲۵/اگست ۱۹۲۵ء کو ضلع جالندھر کے موضع میں پیدا ہوئے۔ آباواجداد کا پیشہ جاگیرداری تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آفریقہ کا بھی سفر کیا۔

شاعری کا آغاز چودہ سال کی عمر سے ہوا۔ ابتداء میں کمالؔ کرتار پوری سے اصلاح لینے لگے۔ لیکن بعد ازاں جوشؔ ملسیانی کے شاگرد ہو گئے۔

زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل ہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نقّاد بھی تھے چنانچہ ان کی کئی تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں

صنفِ غزل کے علاوہ صنفِ مراثی و سلام پر بھی طبع آزمائی کی ہے کلام کے مجموعے "شعلۂ خاموش" "شورشِ پنہاں" "شاخِ گل" اور "اجالے" کے نام سے ملتے ہیں۔

شعری مجموعہ "اُجالے" اسلامی رنگ کا مجموعہ ہے جس میں نعت، رباعیات، قطعات، میلاد اور سلام ملتا ہے۔

سلام

تھی پیاس کی کلفت سب کے لئے شدت تھی علی اصغر کے لئے
تھا جن کے لئے حوضِ کوثر تڑپا کئے چلّو بھر کے لئے

پیاسا ہی رہا ہم شکلِ نبیؐ پینے کے لئے قطرہ نہ ملا
تھے زخم بھی خون بہانے کو تھے اشک بھی چشمِ تر کے لئے

شبیرؑ کو چھوڑ کے جائیں کہاں چلا کے رفیقوں نے یہ کہا
یہ گردنیں اس کے سر پہ فدا سر ہیں اسی کے در کیلئے

ہر آن جفا ہر لحظہ ستم، اشکوں کا بھی منع سو کھ گیا
رستہ ہیں کوئی باقی نہ رہا تسکین دلِ مضطر کے لئے

کوثرؑ کا کنارہ جنت ہے، مہمان حسینؑ کی دعوت ہے
حُر ہیں کو ملے پہلے ساغر، سو ہاتھ ہیں گو ساغر کے لئے

بھائی نہ رہے بچے نہ رہے بے پردہ ہوئے وہ پاک حرم
قسمت نے جنا تھا روز ازل یہ وقت حسینی گھر کے لئے

شبیرؑ شہید ہوئے کیونکر یہ قصۂ درد و غم ہے رضاؔ
عزت ہے یہ پاک نسل کے لئے عبرت ہے یہ بانیٔ شر کے لئے

عہد حاضر میں محسن زیدی اور پروفیسر عنوان چشتی کے سلام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ محسن زیدی کا سلام جو مقالے میں شامل کیا گیا ہے رثائی انداز سے ہٹ کر اخلاقی درس دیتا ہے۔ جس میں شاعر ذلت کی زندگی سے عزت کی موت کو ترجیح دینے کے سلسلے میں حضرت امام حسینؑ کے کردار کو پیش کرتا ہے۔ کردار کی بلندی کی وضاحت اس طرح بھی کرتے ہیں کہ ہر روز عاشورہ میدانِ کربلا میں سپاہِ مخالف حسینی لشکر سے جنگ و جدل اور ظلم و ستم ڈھانے میں مشغول ہے تو ادھر حضرتِ امام حسینؑ امت کے لئے دعا میں مصروف ہیں۔ سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

محسن نریمی

ادھر امت کا صرف جنگ و مشغول جہاں رہنا

ادھر امت کی خاطر شہ کا مصروفِ دعا رہنا

کوئی آساں نہیں تھا کشتی دیں کا بچا رہنا

بس اک کام آیا شاہِ کربلا کا باخدا رہنا

خوشا دل سے امڈ کر آنکھ میں اشکوں کا آ رہنا

مبارک شاملِ ہر بزمِ عزائے سیدا رہنا

اگر مقسوم ہے والبتہ رہنا اک نہ غم سے

تو بہتر ہے غمِ شبیر ہی میں مبتلا رہنا

چراغِ حق بظاہر بجھ کے بھی روشن ہوا کیا کیا

حسینؑ کربلا تھا باطل کے مقدر میں بجھا رہنا

کہا مولا نے عزت کے لئے مر جانا بہتر ہے

اگر ذلت ہو شرطِ زندگی دنیا میں کیا رہنا

پھر اگر پھر بھی لٹا کر حرفِ شکر و رب ہے ہونٹوں پر

کوئی دیکھے تو شہ کا حاملِ صبر و رضا رہنا

وفاداری میں انصارِ حسینؑ اک میں مثال اپنی

کوئی عالم ہو مولا پر لیے جاں و تن فدا رہنا

یزیدی فوج سے منہ پھیر لینا آخرش حُر کا
کسی بھٹکے قدم کا جس طرح منزل پہ آ رہنا
نکلکر گود سے ماں کی علی اصغر نہ پھر آئے
پسند آیا کچھ اتنا کربلا کے بن میں جا رہنا
زمانہ جسکو چاہے تاج و تختِ خسروی دیدے
مجھے منظور ہے شبیرؑ کے در کا گدا رہنا
وہ محرابِ عبادت ہو کہ سایہ تیغ کا محسنؔ
رضائے حق میں دیکھے تو کوئی سر کا جھکا رہنا۔

محسنؔ زیدی سارے زمانے پر اس حقیقت کو آشکار کرنا چاہتے ہیں کہ حق و باطل کی جنگ حق کی جیت اور باطل کی شکست یقینی ہے عبادتِ الٰہی، اطاعتِ مرضی معبود اور جذبہ وفا کے لئے یہ کربلا والوں کی نظیر پیش کرتے ہیں۔ اور سارے زمانے کو انصار حسین کی وفاداری کا سبق سکھاتے ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی کے جو سلام اس مقالے میں پیش کئے گئے ہیں وہ منقبتی انداز رکھتے ہیں۔ جن میں سے ایک غزل کی ہیئت میں ملتا ہے اور دوسرا مسدس کی ہیئت میں۔ بے پناہ خلوص و عقیدت کے جذبات کے تحت لکھے گئے ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی اور محسن زیدی نے اپنے مندرجہ سلام راقمۃ الحروف کی خواہش پر مقالے کے لئے روانہ کئے۔

(علیؑ)

تہذیب و آگہی و شرافت علی کی ہے
جو کچھ ہے زندگی میں ولایت علی کی ہے

ہے مہر تو نبی کی عدالت علی کی ہے
یعنی دل و نظر پہ حکومت علی کی ہے

اک نور ہے دو نیم یہ سمجھے گا کیا غنیم
جو شکل ہے نبی کی وہ صورت علی کی ہے

من کنت مولاہ کے والی کو نبی کر دیا
اب حشر تک مدام ولایت علی کی ہے

توحید کا ہے عکس نبوت کا آئینہ
قرآں کی ہر صفت پہ شہادت علی کی ہے

میدانِ جنگ میں بھی تجاوز نہیں کیا،
اخلاقیاتِ جنگ شجاعت علی کی ہے

مولودِ کعبہ، دستِ خدا، بازوئے نبی
کس کس ادا سے ایک حکایت علی کی ہے

پیمانۂ صفات بھی عرفانِ ذات بھی
معیارِ علم و عشق روایت علی کی ہے

اسکو نہیں ہے نارِ جہنم سے کوئی ڈر
عنوانؔ! جسکے دل میں محبت علی کی ہے

پیر و مرشد عنوان چشتی

امام آخرالزماں

تو رہبرِ دین و دنیا، تو امیرِ انقلاب — تو سراپا نورِ پیکر، نورِ فطرت، نورِ خواب

تو پیمبر نہیں، لیکن واقفِ سرِ کتاب — یونس و عیسیٰ کا ہم سر، موسیٰ و عیسیٰ خطاب

اپنے نانا کی طرح کرتا ہے تجھ کو سربراہ کے وار

ذوالفقار و ذوالفقار و ذوالفقار و ذوالفقار

ہندی و ایرانی و چینی و شامی آئے ہیں — ہم فقیروں کی طرح نامی گرامی آئے ہیں

کعبہ تو آئے ہیں الفت کے پیامی آئے ہیں — قائمِ آلِ محمدؐ کے سلامی آئے ہیں

چاہنے والوں کی خاطر اک ذرا زحمت اٹھا

اب یہی بہتر ہے مولا پردۂ غیبت اٹھا

موسمِ گل تجھ سے ہے بادِ بہاری تجھ سے ہے — ہر دہ داری تجھ سے ہے اور نرداری تجھ سے ہے

ہر شبِ غم زحمت اختر شماری تجھ سے ہے — اور کس سے ہے ہماری آہ و زاری تجھ سے ہے

اپنی اجڑی زندگی آباد کرنے آئے ہیں

تیرے در پر ہم فقط فریاد کرنے آئے ہیں۔

(پروفیسر عنوان چشتی)

صنفِ سلام کی ابتداء سے لیکر بیسویں صدی تک تقریباً ہر ہیت میں سلام لکھے گئے لیکن آزاد نظم کی ہیت میں سلام کا تجربہ نہیں کیا گیا تھا بیسویں صدی صنف سلام کے لئے اسطرح اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں سلام کی متعینہ ہیت میں تبدیلی آئی اور آزاد نظم کی ہیت میں بھی سلام لکھا گیا۔ سلام پیش کرنے سے قبل آزاد نظم کا خاکہ مختصر الفاظ میں کھینچنا نامناسب نہ ہوگا۔

اردو شاعری کا دور جدید آزاد نظم کے سلسلے میں مخصوص دور قرار پاتا ہے۔ کیونکہ ایسی دور سے آزاد نظم کا آغاز ہوا۔ یوں تو دوسری زبانوں میں آزاد نظم وجود میں آچکی تھی۔ لیکن اردو زبان میں اس کا آغاز کچھ تاخیر سے ہوا۔ جس کا سہرا اکثر نقاد شرر کے سر باندھتے ہیں۔

"آج کا اردو ادب" میں ابواللیث صدیقی آزاد نظم اور اس کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "اردو نظم کے اس دور میں ہیت اور ٹکنیک کے تجربوں کے سلسلے میں شرر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ شرر غالباً اردو میں پہلے شاعر ہیں جو مغربی اثرات کے تحت نظم آزاد، نظم معریٰ کا تجربہ کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی توجہ زیادہ تر ناولوں اور مختلف موضوعات کے مضامین اور ادبی رسائل کی طرف اس قدر مائل رہی کہ وہ پوری طرح اس نئے تجربے کو پروان نہ چڑھا سکے۔ لیکن اسکا شعور واضح طور پر ان کے یہاں موجود ہے"[1]

---

[1] "آج کا اردو ادب" ابواللیث صدیقی ص ۱۰۶، ۱۰۷

آزاد نظم میں نہ تو مخصوص بحور کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ ہی ردیف اور قافیے کی پابندی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ نہ ہی شاعری کے مخصوص ارکان کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور نہ اوزان کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ بلکہ شاعر کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔ موضوع اور ہیت ہر طرح سے وہ پورا آزاد ہوتا ہے۔

آزاد نظم آہستہ آہستہ عام ہونے لگی۔ اور کئی شعراء نے آزاد نظم کی ہیت میں تجربات کئے لیکن رثائی شاعری میں آزاد نظم کی ہیت کا تجربہ سب سے پہلے احمد فراز نے کیا۔ جو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی بیش بہا تصنیف "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" میں تحریر کرتے ہیں کہ

> "احمد فراز نے پچھلے چند برسوں میں رومانی اور غنائی شاعری کی سطح سے اٹھ کر جو احتجاجی شاعری کی ہے اس ضمن میں ان کا تازہ مجموعہ بے آواز گلی کوچوں میں قابل ذکر ہے۔"[1]

احمد فراز کا مندرجہ سلام آزاد نظم کی ہیت میں لکھا گیا ہے یہ "سلام اس پر" کے عنوان سے ملتا ہے چونکہ اس میں استعاراتی کیفیت ملتی ہے لہذا پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسے اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے

سلام ملاحظہ ہو۔

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ از پروفیسر گوپی چند نارنگ صـ ۶۷

سلام اُس پر

اے میرے سربریدہ، بدن دریدہ

سدا تیرا نام برگزیدہ

میں کربلا کے لہولہو دشت میں تجھے

دشمنوں کے نرغے میں، تیغ در دست دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں

کہ تیرے سارے رفیق، سب ہمنوا، سبھی جاں فروش

اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں

گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں

سوائے جانکاہ کے بگولے

چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں

مسافرانِ رہِ وفا لٹا چکے ہیں

اور اب فقط تو

زمیں کے اِس شفق کدے میں

ستارۂ صبح کی طرح

روشنی کا پیرہن لئے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے

اِک داستان کا نقطہ نہیں ہے

اِک واقعہ نہیں ہے

یہیں سے تاریخ اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے
میں آج اس کربلا میں بے آبرو، نگوں سر شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسینؑ کل سرخرو گیا ہے
میں جاں بچا کر فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عزّ و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے
سلام اُس پر
سلام اُس پر

بیشک احمد فراز کا مندرجہ سلام رثائی شاعری بالخصوص صنفِ سلام میں ایک نیا تجربہ ہے۔ احمد فراز نے نہ صرف صنفِ سلام کے لئے آزاد نظم کی ہیئت اپنائی بلکہ انھوں نے اپنے شعری مجموعے "نایافت" کا ابتدائیہ بھی آزاد نظم میں لکھا جو ادب کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ ہے۔

ہو جائیگا۔ سلام شرف حضوری حاصل ہونے پر اظہار خلوص و اعتقاد ہے۔ رسم عام یہی ہے میلادی سلام ہوں یا رثائی سب میں یہ قدر مشترک ہے۔ پہلے تفصیل سے "کو سلام" "پر سلام" وغیرہ لکھنے کا رواج تھا۔ بعد میں "سلامی" "مجرئی" "مجرائی" وغیرہ الفاظ پر اکتفا کر لی جاتی تھی۔ یہ رسمی الفاظ بھی ختم کر دیئے گئے اور سلام اپنی عروضی ہیئت کے اعتبار سے "غزل طرز" ہو گئے۔ یہ اعتبار مضامین اگرچہ بمماثلت رہی لیکن سلام کی سنجیدہ اور رثائی کیفیت سے ہم آہنگی ضروری تھی۔

سلاموں پر اہل دلی نے بھی بہت توجہ کی بلکہ لکھنؤ کے ہر عرس دلی میں شعراء ایام عزا میں سلام پڑھنے کا التزام کرتے تھے۔ شاہان معلیہ بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔ اس سلسلے میں میری تصنیف "دہلوی مرثیہ گو" سے کافی مدد مل سکتی ہے

انیس و دبیر کے زمانے سے سلاموں میں معنوی اعتبار سے جو تبدیلی آئی ہے وہ ہم ہے اور نگاری کا نہیں بلکہ جدید مرثیہ نگاری کا تحفہ ہے مگر بعض مضامین جدید سلام اور عصری غزل میں مشترک ہوں تو اسکو غزل نگاری کا عطیہ سمجھنا غلط ہوگا" [1]

پدم شری علی جواد زیدی نے اپنے خط میں صنف سلام کے ہر گوشے کو بڑے اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے جس نہ صرف شیخ محمد ذکی کے تصور سلام کی توثیق ہوتی ہے بلکہ ساتھ ہی شبلی کے تصور سلام کی تردید بھی ہوتی ہے۔ اس دو رخے طرز سلام اور اس صنف کی تبدیل پذیر بدلتی ہوئی شکلیں ابتداء تا حال پر بھی موصوف نے روشنی ڈالی ہے۔ لکھنؤ پروفیسر گیان چند جین رسالہ "شب خون" میں اپنے مضمون "اردو نظم اور اسکی اصناف" میں صنف سلام کے تحت اسکی اور موضوعات پر اسطرح روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ غزل کی ہیئت میں ہوتا ہے اور اسکا ہر شعر معنوی

---

[1] کرم نامہ از پدم شری علی جواد زیدی صد مورخہ ۶/دسمبر ۹۲ء

اس ضمن میں احمد فراز کا مختصر سا تعارف بے محل نہ ہوگا

احمد فراز :۔

سید احمد شاہ نام اور فراز تخلص کرتے ہیں

پشاور میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے ۔ اختتام تعلیم کے بعد کراچی و پشاور میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروڈیوسر کے فرائض انجام دیتے رہے بعد ازاں پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے جس کا سلسلہ تقریباً دس سال تک چلتا رہا ۔ مختلف اداروں اور ادارۂ ادبیات پاکستان کے دائرکٹر جنرل بھی رہے لیکن اس بات کا علم نہیں ہو تا کہ کونسے حالات نے انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ۔ اور انگلستان میں قیام کو ترجیح دی ۔ لہذا انگلستان میں مقیم ہیں۔

بحیثیت شاعر عالمگیر شہرت کے حامل ہیں

شعری مجموعے "بے آواز گلی کوچوں میں" "درد آشوب" "نایافت" "جانِ جاناں" اور "تنہا تنہا" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔

صنفِ سلام کے آغاز، تدریجی ارتقاء، دورِ عروج
اور دورِ حاضر میں سلام کی مستحکم روایت پر نظر ڈالی جائے تو بیشک
اردو ادب پر واقعہ کربلا کے دیرپا اثرات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ
چودہ سو برس گذر جانے کے باوجود بھی اس واقعہ کا اثر اس قدر
دیرپا ہے کہ اردو شاعری کے لئے کچھ ہی عرصہ پیشتر کا واقعہ معلوم ہوتا ہے
اردو شاعری کئی ادوار پر مشتمل ہے لیکن کسی دور کی شاعری
واقعۂ کربلا کے اثر سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جاسکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ
ہر دور کی شاعری واقعہ کربلا سے متاثر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں
صنفِ سلام کی مستحکم روایت ملتی ہے
یہ تخصیص صرف صنفِ سلام کی حد تک محدود نہیں بلکہ بیان رثائی شاعری
کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ مرثیہ ہو یا سلام، نوحہ ہو یا ماتم یہ شاعری
کے ہر دور میں ملتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری کا آغاز ہی
رثائی شاعری سے ہوا۔ اور یہ فضیلت سرزمینِ دکن کو حاصل ہے
اگرچہ عربی اور فارسی زبان میں بھی مراثی لکھے گئے لیکن جس شد و مد
کے ساتھ اردو زبان نے اسے اپنا کر جو معرکہ سر کیا ہے، یہ شرف نہ تو
عربی زبان کو حاصل ہے اور نہ ہی فارسی زبان اس کی حقدار ہے
یہ تو صرف اردو زبان کا سرمایہ ہے جسے پاکر اس نے حیاتِ ابدی حاصل کی۔

اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے مضمون "واقعہ کربلا کا اثر اردو ادب و دیگر فنون پر" میں اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"امام حسینؑ کو شہادت کے لئے مدینہ سے کربلا جانا پڑا اور شہادت کو ادبی و فنی مرتبہ حاصل کرنے کے لئے عرب و ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آنا پڑا۔ عجب کیا کہ یہ ادبی سفر اس خواہش کا پرتو ہو جو امام حسینؑ نے یزید سے کی تھی کہ اگر تجھے میری ذات و قیام سے اندیشہ ہو تو مجھے ہندوستان چلا جانے دے۔ حالات نے امام کو ہندوستان نہ آنے دیا مگر شہید اعظم کی یہ خواہش قدرت بھی رد نہ کر سکی۔ جسمانی طریقہ پر نہ سہی ایک دوسری شکل میں ایک نئے انداز سے یہ جذبہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ رثائی شاعری کسی ایک گروہ تک محدود نہ رہی بلکہ خواص و عوام بادشاہ ہو یا غریب سبھوں نے اس پر طبع آزمائی کی لیکن یہ اور بات ہے کہ اس میں فنی ارتقاء بتدریج عمل میں آیا۔ ابتداء میں تو صرف خلوص و عقیدت کی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ کوئی بھی تخلیق اپنے ابتدائی مراحل ہی میں شاہکار کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔

---

[1] ہفتہ وار رسالہ الکرار یکم جنوری ۶۲ء مضمون "واقعہ کربلا کا اثر اردو ادب اور دیگر فنون پر" از ڈاکٹر اعجاز حسین

اردو ادب پر واقعہ کربلا کے اثر کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی، جاسوسی ناول نگار ابن صفی نے بھی صنفِ سلام پر طبع آزمائی کی۔ علاوہ ازیں مرزا سودا جو اردو شاعری میں قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی سلام کہے نہ صرف سلام کہے بلکہ سلام میں ادبیت اور شعریت کو لازم قرار دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں

؎ ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام
قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام

چنانچہ معاصرینِ میر اور سودا نے بھی ان کی پیروی کی یہی وجہ ہے کہ میر و سودا کا عہد سلام گوئی کا دور تشکیل قرار پایا۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ واقعۂ کربلا حق و باطل معرکۂ حق و باطل تھا جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست یقینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم شعرا نے بھی اپنا کلام نذرانۂ عقیدت کے طور پر بارگاہ حسینی میں پیش کیا اور اس در پاک سے اپنی وابستگی کا بھی اظہار کیا۔ اس کا سبب ہلال نقوی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"واقعۂ کربلا ایک ایسے جاندار واقعہ کے ساتھ نمودار ہوا جس میں جرأت حق، حوصلۂ گفتار، سرفروشی اور عشق، صداقت کے صدہا پہلو جلوہ گر تھے۔ شعر گو اور نثر نگار کی حساس طبیعت نے اس واقعہ سے اردو ادب کو ایک جاندار تصور دیا اور ایک ایسا تصور جس میں محبت اور شہادت کی شمعیں فروزاں ہیں"[1]

---

[1] ہفتہ وار شاہکار اربعین نمبر جنوری ۱۹۸۰ء "اردو ادب پر کربلا کے علامتی و غیر علامتی اثرات" ہلال نقوی ص ۸

چنانچہ غیر رثائی شاعری پر بھی واقعۂ کربلا کے اثرات کافی دیرپا ہیں چاہے نظم ہو یا غزل اس واقعہ کے اثرات کو دونوں ہی نے قبول کیا۔

لہٰذا اردو غزل میں مستعمل الفاظ جیسے شام غریباں، خیمہ تشنگی، فرات، موج ساحل، سرفرازی، کفن بدوش، غریب الوطن پیاس، سینہ کوبی وغیرہ واقعۂ کربلا کے تاثر کی غمازی کرتے ہیں۔

چونکہ صنفِ غزل کی بناء عشق و محبت پر ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عشق کی راہیں پُرخار ہوتی ہیں لہٰذا غزل میں خوشی کی بہ نسبت غم زیادہ ہیں۔ عشق کا خاتمہ غم پر ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا داستانِ عشق بھی ہے اور داستانِ غم بھی۔ کیونکہ امام حسینؑ کی عظیم قربانی کا سبب عشقِ الٰہی ہی ہے۔ لہٰذا صنفِ غزل کا اس سے متاثر نہ ہونا تعجب کا باعث ہوتا۔ کیونکہ غزل کا موضوع عشق ہی رہا ہے۔

واقعہ کربلا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ہر ادب متاثر ہوا۔ غزل صنف سلام سے اس لئے زیادہ متاثر رہی کہ غزل جس ہیئت میں لکھی جاتی ہے سلام کے لئے بھی وہی ہیئت متعین قرار پائی: واقعہ کربلا کے اثرات کو صنفِ غزل نے صنفِ سلام کے ذریعہ اخذ کیا۔ لہٰذا کوئی دور ایسا نہیں ملتا جس میں غزل سلام سے متاثر نہ رہی ہو۔ چاہے وہ متقدمین کا دور ہو یا دورِ جدید۔

حاتم اور آبرو سے لیکر آزاد اور حالی تمام اساتذۂ سخن کے ہاں غزل میں واقعہ کربلا کا اثر ملتا ہے۔

عصرِ حاضر کے شعراء کے کلام میں بھی واقعۂ کربلا کا بھرپور اثر ملتا ہے اس سلسلے میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

صداقت اور شہادت :۔

؎ سچائی نمو پاتی ہے مقتل کی زمیں پر
یہ فصل صحیفوں میں اُگائی نہیں جاتی

(امید فاضلی)

پیاس :۔

؎ خیمہ گاہِ تشنگاں میں پیاس کی لہروں کے ساتھ
تیر دریا کی طرف سے رات بھر آئے بہت

(امید فاضلی)

شمع رسالت کے محافظ

؎ سلام خانۂ زہرا ترے چراغوں پر
بجھے ہیں شمع رسالت کی روشنی کے لئے

(امید فاضلی)

مندرجہ اشعار اگرچہ کہ امید فاضلی کی غزلیات سے لئے گئے ہیں لیکن واقعہ کربلا سے اس قدر اثر لئے ہوئے ہیں کہ سلام کے معلوم ہوتے ہیں

افتخار عارف کا شعری مجموعہ "مہر دو نیم" جس میں نظم اور غزل دونوں شامل ہیں. غزلیات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ان پر واقعہ کربلا کا گہرا اثر ہے پوری غزل اس واقعہ سے متاثر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو

؎ وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑتا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

(افتخار عارف)

ہر دو ین ستائر کی غزل جس کے تقریباً اشعار واقعہ کربلا کا تاثر لئے ہوئے ہیں

؎ پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون
کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے در خیمہ پہ اب تک صورت تصویر کون
سارے رشتے ہجر تو میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

غزل کے تیسرے شعر میں حضرت امام حسینؑ کی اپنے شہر مدینہ سے ہجرت کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

مُنیر نیازی کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ دل خوف میں ہے عالم فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

ہے باب شہر مردہ گزرگاہ باد شام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

؎ اس دشتِ بلا میں کہ جہاں ہے گزر اپنا
جز سایۂ غم کوئی نہیں ہم سفر اپنا
(منیر نیازی)

دورِ حاضر کے شعراء کے کلام دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب پر واقعہ کربلا کا اثر مقدم اور یقینی ہے۔ اس سے انکار ناممکن ہے۔

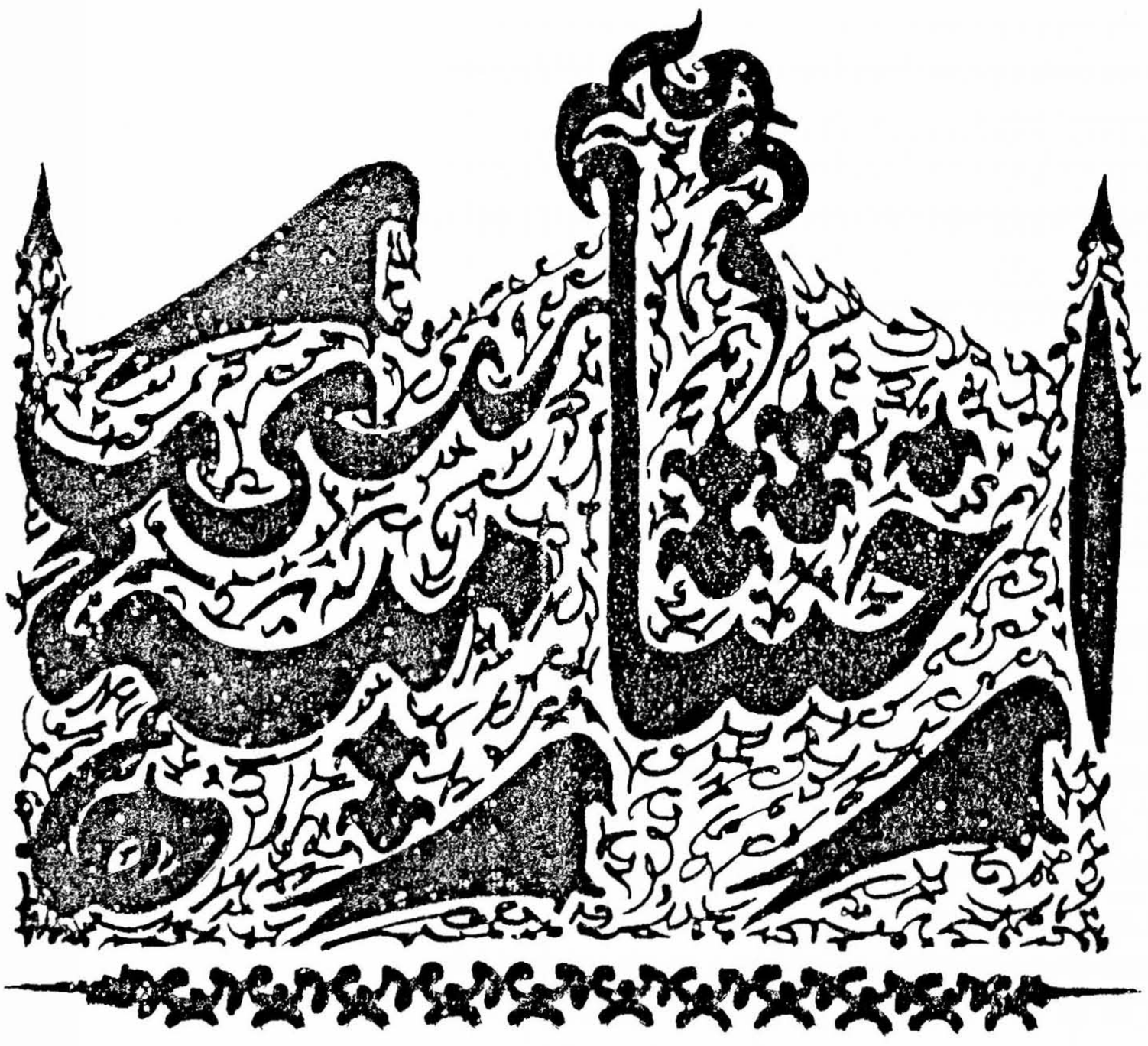

اختتامیہ

اردو میں سلام ایک موضوعی صنف سخن ہے جس طرح دیگر اصناف میں موضوع کیساتھ ہیت بھی متعین ہے۔ صنف سلام کیساتھ ایسا تعین نہیں۔ یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ صنف غزل، قصیدہ اور مرثیہ عربی اور فارسی کی راہ سے اردو میں آئے لیکن سلام اردو کی اپنی صنف ہے اور اسطرح اردو شاعری کی روایت کی اہم ترین کڑی عربی و فارسی میں صنف سلام کا وجود نہیں۔ فارسی میں جو سلام ملتے ہیں ان میں بیشتر ہندوستان ہی میں لکھے گئے جو قلیل سی تعداد ایران میں نظر آتی ہے وہاں اسے بطور سلام نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے ہیت کی بنیاد پر ترکیب بند یا ترجیع بند کہا گیا۔ اردو شاعری کی یہ معرکہ خیز دریافت ہے۔

سلام کا پس منظر قرآن مجید میں سورۂ "الاحزاب" کی آیت سے مستعار لیا گیا ہے جسکا ترجمہ درج ہے۔

"اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ خدا اور اسکے فرشتے
پیغمبر اور انکی آل پر درود بھیجتے ہیں تو اے ایمان
دارو تم بھی درود بھیجتے رہو اور سلام کرتے رہو۔"

چنانچہ ابتدائی دور کے سلام اسی آیت کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں جسکی اصل بنیاد جذبۂ عقیدت پر قائم ہے۔

یہ سرزمین دکن کو افتخار حاصل ہے کہ دوسری اصناف کی طرح اس مقدس صنف کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ اور اسے تمام شعراء نے جذبۂ عقیدت

اعتبار سے آزاد ہوتا ہے۔ اسکا موضوع متعین نہیں کیا جا سکتا
سے متعلق ہوتا ہے خیر عبرت، فنا، اخلاق، شاعرانہ
تعلق وغیرہ ہر کبھی شعر لکھے جاتے ہیں۔ انیس نے سلام میں ایسے شعر بھی کہے ہیں" ۱

شب ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر چراغ علی کی تصنیف "اردو مرثیے کا ارتقا" گولکنڈہ
اور بیجاپور میں" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

چونکہ دکن میں اکثر مرثیے غزل کی ہیئت میں ہوتے
تھے اسلئے وہاں سلام اسی مرثیے کو کہا گیا جسکی ردیف میں
سلام" علیک، السلام، مرحبا یا صلوات شامل ہے بیج
بہ کنیہ اصل سلام یہی ہے یشمال میں جب مرثیہ بالعموم
مسدس کی شکل میں کہا جانے لگا تو غزل کی ہیئت
والا سلام مرثیے سے بالکل ممیز ہو گیا" ۲

ڈاکٹر چراغ علی کے حوالے سے پروفیسر گیان چند جین نے سلام کے جس تصور کو پیش کیا ہے اس سے بھی شبلی کے اس نظریئے کی تردید ہوتی ہے کہ جب مرثیہ کیلئے مسدس کی ہیئت مخصوص ہو گئی تو غزل کے لئے استدر کانوں میں پڑ چکی تھی کہ اسلئے کچھ نہ کچھ تو اضافہ ہو گیا اور لوگوں کے مذاق سے مجبور ہو کر اس کہی جانیوالی رثائی نظم سلام کے عنوان سے شناخت کیجانے لگی۔

---

۱ اردو نظم اور اسکی اصناف (مضمون) از پروفیسر گیان چند جین صفحہ ۲۲ ریختہ
۲ " " " "

کے تحت سلام پیش کئے اور اسے وسیلۂ نجات قرار دیا گیا ہے اور بات
ہے کہ ابتدائی دور کے سلام بھی مرثیے کے ہی عنوان سے ملتے ہیں جسکی وضاحت
کی گئی ہے

دکن میں اردو ادب کی تاریخ پانچ ادوار پر محیط ہے جس میں بہمنی
دور کو اوّلیت حاصل ہے۔ اردو کا سب سے پہلا سلام نظامی دکنی کا ملتا ہے
جو بہمنی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ بہمنی دور جو سنہ ۱۳۴۷ء تا سنہ ۱۴۹۵ء پر محیط ہے اسی
مناسبت سے سب سے پہلا سلام بندہ نواز چودھویں صدی عیسوی کا قرار پائے گا یعنی نظامی
کے سلام کا تذکرہ سوائے تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد اول کے نہیں اور نہ ہی
ملتا لہذا اسے مستند قرار دینا کافی دشوار ہے

سلام کے ابتدائی نمونے محمد قلی قطب شاہ کے یعنی سولھویں صدی کے آخر
سے ملتے ہیں۔ اس کے بعد اسکی صحت مند روایت آگے بڑھتی رہی اور شائد
ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے جذبات عقیدت کے تحت سلام نہ لکھا ہو
لہذا اس دور میں نعتیہ، منقبتی اور کربلائی مراثی وضع کے سلام دستیاب
ہوتے ہیں جنکی زمرہ بندی کی گئی ہے چونکہ اس دور میں "درود" اور
"صلوات" کا رجحان بھی فروغ پاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ سلام اسی کو
قرار دیا جائے گا جس میں لفظ سلام، سلامی، عبرا، عبرئی اور سلام
علیک ہو۔ ہیئت کی تخصیص اپنی ہر ہیئت میں سلام دستیاب ہوتے ہیں۔

سترھویں صدی نے اٹھارویں صدی دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے کئی شعراء ملتے ہیں جنھیں شاہی سرپرستی حاصل تھی جنھوں نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ درگاہ قلی کے سلام ہر ہیت میں ملتے ہیں۔ دہلی کی آمد و رفت کی بنا پر دہلی والوں نے بھی سلام گوئی کے رجحان کو قبول کیا لہذا وہاں بھی سلام کے نمونے ملنے لگے۔ مکین، ضاحک اور سکندر کے ہاتھوں سلام جب سلام گوئی کی روایت جب میر اور سودا تک پہنچی جس کے بعد یہ صنف صرف جذبات عقیدت کی نمائندہ نہیں بلکہ ادبی وزن و وقار سے ہم آہنگ ہوئی اور سودا نے اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راہوں کی نشان دہی کی۔ چنانچہ یہ دور صنف سلام کے لیے تشکیلی دور قرار پایا۔ اس دور تک بھی سلام کی ہیت متعین نہ تھی۔ سلام ہر طرح کے ملتے ہیں اور لفظ سلام، سلامی مجرا سے تقریباً سلاموں کا آغاز ہوتا ہے۔

نادر شاہ اور احمد شاہ درانی کے حملے اور دہلی کی تباہی ہی دبستان لکھنؤ کے قیام کا باعث ہوئی۔ چنانچہ میر سودا، میر حسن وغیرہ اس دبستان کے دور اول کے شاعر قرار پاتے ہیں جنھوں نے دہلی میں چراغ شاعری روشن کیا اور رثائی شاعری کا آغاز کیا

ضمیر، خلیق، فصیح، دلگیر، ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کی کاوشیں تو اس دبستان کے دوسرے دور کی قرار پائیں گی جو صنفِ سلام کے سلسلے میں دورِ تعمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آصف الدولہ کے عہد سے باقاعدہ مرثائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ مذکورہ دور دورِ ضمیر و خلیق کے دور ہی سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اس دور میں خلیق کی زبان خاص معیار رکھتی ہے۔ سلام مرثائی بھی ملتے ہیں۔ دبستان لکھنؤ میں سلام گوئی کا آغاز اگرچہ تاخیر سے ہوا لیکن ارتقاء بہت جلد عمل میں آیا۔ لہٰذا ضمیر، خلیق، فصیح اور دلگیر سلام گوئی کے چار اہم ستون قرار پاتے ہیں ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا نامناسب ہے۔ یہ دور دورِ تعمیر قرار پایا جسمیں سوز خوانی اور تحت اللفظ کے سلام وجود میں آئے۔

سوز خوانی مرثائیت پر مشتمل ہوا کرتی تو تحت اللفظ اخلاقیات اور ادبیات پر۔ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کا بھی وہ منفرد ادبی کردار ملتا ہے۔ مرثائیت اور اہلبیت اطہار سے عقیدت سلام گوئی کے اہم اجزاء قرار پائے۔ ہیت کی پابندی نہیں۔

انیسویں صدی کا تیسرا حصہ مرثائی ادب کی تاریخ کا سنہرا باب یعنی دورِ

عروج قرار پاتا ہے۔ یہ عہد عہد انیس و دبیر سے اردو ادب میں اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اس کے بعد کوئی انیس و دبیر صنف سلام کو نہ مل سکا۔ ان کے عہد سے سلام واقعات کربلا پر محور کرتا ہے۔ میر انیس نے نہ صرف اس صنف کو منزل مقصود کی طرف پہنچایا بلکہ ایک طرح کا تغزل اس میں کیا۔ ان کے ہاں شجاعت، سخاوت حق سے محبت، باطل سے نفرت جیسے اخلاقی درس ملتے ہیں۔ ان کے سلام بھی تحت اللفظ اور سوز پر مشتمل ہیں۔ دبیر کے سلاموں کو بھرپور رثائیت کیلئے اہمیت حاصل ہے دور عروج قرار پانے کا سبب یہ ہے کہ انکے دور میں سلام ہلال سے بدر کامل قرار پایا۔ خانوادۂ انیس کے شعراء نے اس صنف کی مستحکم روایت کو آگے بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دبستانِ عشق کی خدمات بھی اس سلسلے میں فراموش نہیں کیجا سکتی ہیں۔ یہی وہ عہد ہے جسمیں صنف سلام کی ہیئت متعین ہوئی۔ پیارے صاحب رشید کی شخصیت دبستانِ انیس و دبستانِ عشق کی نمائندہ شخصیت ہے مشیر بھی اس سلسلے میں کم اہمیت کے حامل نہیں۔

سلام کے لئے اب لفظِ سلام، سلامی، مجرا جیسے الفاظ کی ضرورت باقی نہ رہی چنانچہ یہ الفاظ کم ملتے ہیں۔ سلام کسی قدر واقعاتِ کربلا سے منسوب ہو گئے۔

بیسویں صدی میں نعتیہ و منقبتی سلام گوئی نے دوبارہ رواج پایا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی صنف سلام کے لئے خوشگوار ثابت ہوئی نہ صرف مرثیہ نگار بلکہ ہر شاعر نے اس صنف پر طبع آزمائی کی اور رسالتمآب اہلبیت اطہار اور بزرگانِ دین پر تحفہ

درود و سلام پیش کیا۔

انیسؔ، امیرؔ اور داغؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن سے نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کی روایت بیسویں صدی کے شعرا کو ملی۔ امیرؔ کا سلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلام کے لیے غزل کی متعینہ ہیئت بدل گئی۔ امیرؔ کا نعتیہ سلام مسدس کی ہیئت میں ملتا ہے۔ انیسؔ، امیرؔ اور داغؔ کا شمار ان اساتذہ میں آتا ہے جنہوں نے غدر کے ہنگامے دیکھے تھے جس سے شعر و ادب بھی کافی متاثر ہوا۔

دلبائوں کا خاتمہ ہو چکا۔ مایوسی کے اس بحر بیکراں میں شاعر قلم کے ہتھیار سے لیس ہو کر کود پڑا۔ ان حالات میں واقعات کربلا نے ہمت افزائی کی۔ امام حسینؑ اور اصحاب و انصار کے کارناموں کو مشعل راہ بنا کر شعرا نے بالکل ہی نکلی ہاری نیز مردہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا انداز جدا ہر شعر با مقصد اور با معنی ہے جن کے ہاں نعتیہ رنگ بھی ایک خاص انداز رکھتا ہے۔ قوم کو عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ہیجان ایک انکار کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ انکی شاعری مرد مومن کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہے جو ایک مومن کے لیے جذبۂ شہادت کی طلب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مال غنیمت اور کشور کشائی کو اسکی معراج قرار نہیں دیتے۔ بعض مرتبہ اظہار افسوس کرتے ہیں کہ

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں

علاوہ اقبال کے تصور فقر، حیدری، تصور عشق اور تصور سجدہ سے بخوبی اندازہ

ہوتا ہے کہ علامہ شہداء کی عظمت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے قوم میں بیداری آزادئ وطن کی سعی مسلسل کا آغاز کرتے ہیں اور عزم حسینی کو مشعل راہ بنانے کا پیغام دیا۔

مسدس شہید یار جنگ شہید اور آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علیخاں عثمان کے سلام بھی شہرت کے حامل ہیں جن کو پیش کیا گیا ہے

دورِ جدید کے شعراء میں جوش، نجم آفندی، آل رضا، جمیل مظہری، احسان دانش، ماہر القادری اور ساتھ ہی برق موسوی، شاہد صدیقی اور شجیع کے جذبات سلام لیا گیا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دورِ جدید میں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے نظریئے کو اپنایا گیا۔ اس نظریئے کے تحت شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

بیسویں صدی میں کچھ اکابار سلام کی ہیت بدلی۔ مثنوی کی ہیت میں بھی سلام لکھے گئے۔ احمد فراز نے آزاد نظم میں سلام لکھ کر اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا کہ سلام ایک موضوعی صنف ہے۔

صنف سلام کے غزل پر اثرات کی وضاحت کی گئی۔ اس دوران یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اردو ادب کی کوئی ایسی صنف نہیں ہے جو واقعہ کربلا سے متاثر نہ رہی ہو۔ کیونکہ شہادت عظمیٰ کی بنیاد بھی عشق ہے عشق کا خاتمہ غم پر ہوتا ہے گویا واقعہ کربلا داستانِ عشق بھی ہے اور داستانِ غم بھی اور انسان خوشی کی بہ نسبت غم سے زیادہ متاثر ہوتا ہے لہذا صنف غزل کا صنف سلام سے متاثر ہونا یقینی ہے۔

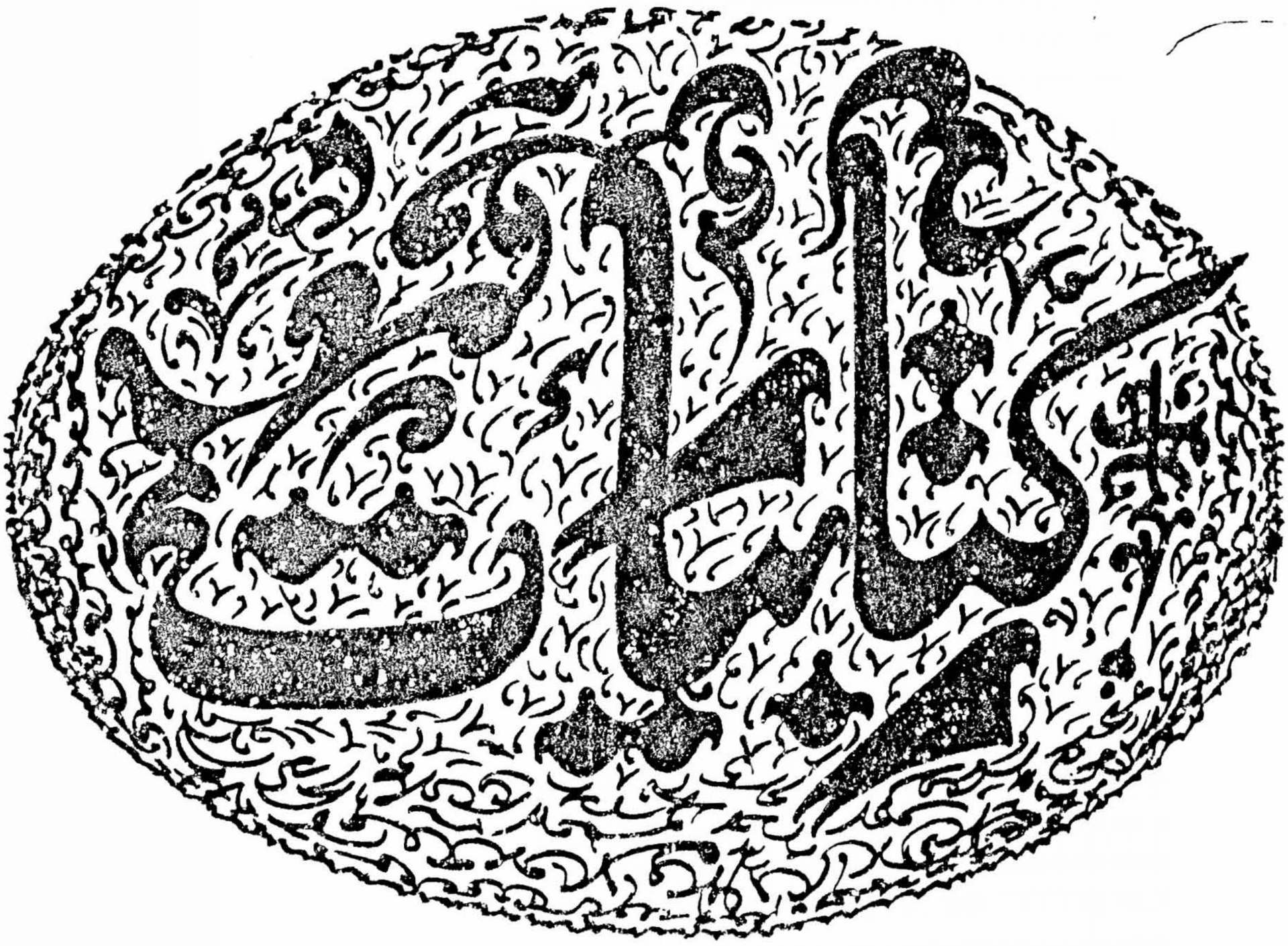

مطبوعات

	تصنیف	مصنف	سن اشاعت	مقام
۱	آب حیات	محمد حسین آزاد	سنہ ۱۹۶۷ء	الہ آباد
۲	آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	سنہ ۱۹۷۵ء	الہ آباد
۳	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	سنہ ۱۹۸۸ء	ایم۔اے۔ پبلشرس دہلی
۴	اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ	ڈاکٹر جمیلہ نشاط	-	-
۵	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	سنہ ۱۹۷۵ء	کوہ نور پبلشرس دہلی
۶	اردو مرثیہ	علی عباس حسینی	سنہ ۱۹۷۲ء	اردو پبلشرز ٹلک مارگ لکھنؤ
۷	اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں	سنہ ۱۹۶۸ء	کتاب نگر لکھنؤ
۸	اردو مرثیہ پاکستان میں	سید ضمیر اختر نقوی	سنہ ۱۹۷۷ء	سید اینڈ سنید کراچی
۹	اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں ۱۷ویں صدی تک	ڈاکٹر محمد حسین آغا علی	سنہ ۱۹۷۳ء	مدینہ پریس
۱۰	اردو مرثیہ	مرتبہ شاہد ردولوی	سنہ ۱۹۹۱ء	اردو اکادمی دہلی
۱۱	ارسطو سے ایلیٹ تک	ڈاکٹر جمیل جالبی	سنہ ۱۹۷۷ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
۱۲	اردو غزل میں تجربات	احمد حمید الدین	-	حیدرآباد

۱۳	اردو غزل اور کربلا	سید ضمیر اختر نقوی	-	مرکز علوم اسلامیہ کراچی
۱۴	اردو نظم میں یورپی	حامد اللہ میری	-	-
۱۵	اسلاف میر انیس	مسعود حسن رضوی	-	-
۱۶	اصول استقادیات	عابد علی عابد	۱۹۶۲ء	ایسوسی ایٹڈ پرنٹنگ پریس لاہور
۱۷	اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد	۱۹۸۱ء	انڈیا بک امپوریم بھوپال
۱۸	اصناف سخن یعنی مروجہ نظم کی قسمیں	ممتاز الرشید	-	-
۱۹	العمدہ طبع دوم	ابن رشیق	۱۹۰۵ء	طبعۃ السعادہ مصر
۲۰	اقبال اور عشق رسولؐ	رئیس احمد جعفری	۱۹۵۶ء	علمی پریس پرنٹنگ پریس لاہور
۲۱	انجم خصوصی شمارہ	مرتبہ باقر زیدی	۱۹۷۷ء	بزم انجم افندی ناظم آباد کراچی
۲۲	انتخاب رشک	محمد انصار اللہ	-	-
۲۳	انیس کے سلام	بیدم شیری علی جواد زیدی	۱۹۸۱ء	ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۲۴	اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	-	-
۲۵	باقیات انیس	ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری		
۲۶	بحر الفصاحت	نجم الغنی	۱۹۷۱ء	لکھنؤ

۲۷	بزم ماتم	سید علی حسین		
۲۸	تاثرات زیارت	علامہ نجم آفندی	سنہ ۱۹۵۰ء	دائرہ الکٹرک پریس لکھنؤ
۲۹	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۸۶ء	
۳۰	تذکرۂ نادر	مسعود حسن رضوی	-	-
۳۱	ترجمان غم (چہارم)	باقر امانت خانی	سنہ ۱۳۶۳ھ	حیدر آباد
۳۲	ترجمان غم (ششم)	باقر امانت خانی	سنہ ۱۳۶۵ھ	حیدر آباد
۳۳	تعلیل و تاویل	ڈاکٹر ظہور الدین	سنہ ۱۹۹۱ء	گلشن پبلشرز سرینگر
۳۴	تنقیدی جائزے	احتشام حسین	سنہ ۱۹۴۴ء	حیدر آباد دکن
۳۵	تنقیدی مضروضات	ظفر احمد صدیقی	-	.
۳۶	جادۂ نو	احسان دانش	-	-
۳۷	جوش ملیح آبادی کی شاعری	ضمیر اختر نقوی	سنہ ۱۹۸۰ء	ادارہ فیض ادب کراچی
۳۸	جمیل مظہری			
۳۹	چراغ منزل	شاہد صدیقی	سنہ ۱۹۶۰ء	انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش
۴۰	حسین پیر سلام	سید علی رضوی	سنہ ۱۹۸۶ء	میر انیس اکاڈمی کراچی

پروفیسر گیان چند جین کے تصورِ سلام سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سلام کی ردیف میں سلامٌ علیک السّلام، مرحبا، یا صلوٰۃ شامل ہونے کی اصل وجہ یہی ہے کہ دکن میں ابتدائی مراثی اور سلام دونوں غزل کی ہیئت میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں اصناف کو اکید دوسرے سے ممیز کرنا اس ردیف کا مقصد ہوا کرتا تھا۔

سنھیا لال ماتھر کی تصنیف "آئینہ عروض و قافیہ" اور رحیم الغنی کی تصنیف "بحر الفصاحت" کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین اپنی رائے اسطرح پیش کرتے ہیں کہ :۔

"سلام کا دوسرا نام بحر الجمی تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بحر الفصاحت کے بموجب سلام بحرِ ہی یا سلامی کے لفظ سے شروع ہوتا ہے ایسے مشاعرے جن میں صرف سلام پڑھے جائیں مسالمہ کہلاتے ہیں" [۱]

سلام نگاری کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے سید علی رضوی اپنی تصنیف "حسینؑ پر سلام" کے مقدمے میں اسطرح رقم طراز ہیں کہ :۔

"جبوقت سلام نگاری کا آغاز ہوا اسوقت مرثیہ کی صنفی حیثیت متعین نہیں ہوئی تھی صرف سلام نگاری سے ہی مرثیہ کا کام لیا جا رہا تھا اسلئے ابتدائی سلاموں میں بین، بکا گریہ، مصائب کو خاص طور پر سامنے رکھا جاتا تھا۔ اسکی ~~ابتدائی~~ عروضی حیثیت سلام ہی سے ملتی جلتی ہے۔ محض خیال کے تسلسل کی وجہ سے اسکو سلام کے بجائے مرثیہ کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے سلاموں کو بہت سے پرانے شاعروں کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے، دکن کے

---

[۱] اردو نظم اور اسکی اصناف (مضمون) رسالہ شب خون ص ۱۹۸۵ء از پروفیسر گیان چند جین ص ۲۲

۴۱	حیات دبیر	افضل حسین ثابت	-	
۴۲	خوش نفساں	ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ	سنہ ۱۹۸۳ء	ادارۂ شعر و حکمت
۴۳	دبستانِ دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	سنہ ۱۹۶۶ء	نسیم بک ڈپو
۴۴	دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی طبع اول	ڈاکٹر جعفر رضا	سنہ ۱۹۷۳ء	نیشنل کتاب گھر الہ باد
۴۵	دکنی ادب کی تاریخ دوسرا ایڈیشن	ڈاکٹر زور	سنہ ۱۹۸۳ء	آئینہ ادب لکھنؤ
۴۶	دستورِ شہادت	معظم جاہ شجیع	سنہ ۱۹۸۳ء	حیدرآباد
۴۷	دکنی شاعری تحقیق و تنقید	محمد علی اثر	سنہ ۱۹۸۸ء	حیدرآباد
۴۸	دکن میں اردو آٹھواں ایڈیشن	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۸۵ء	ترقی اردو بیورو دہلی
۴۹	دورِ تعشق	مہذب لکھنوی	-	لکھنؤ
۵۰	دیوانِ فصاحت	میر مونس	-	-
۵۱	دیوانِ نادر	مرزا کلب حسین نادر	-	-
۵۲	رزم نگاران کربلا	ڈاکٹر صفدر حسین	سنہ ۱۹۷۷ء	سنگ میل پبلیکیشن لاہور
۵۳	سلام و کلام	نزار فتح پوری	سنہ ۱۹۷۶ء	کاروان پریس لاہور
۵۴	سودا	شیخ چاند	سنہ ۱۹۷۲ء	کلکتہ اردو ادب لکھنؤ

۵۵	سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ	سنہ ۱۹۸۶ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
۵۶	شعر العجم	شبلی نعمانی	سنہ ۱۹۲۳ء	معارف پریس اعظم گڈھ
۵۷	شعر و شاعری	عمیق احمد	-	-
۵۸	شعر غیر شعر اور نثر	سمش الرحمٰن		
۵۹	ظفر نامہ	غلام علی خیال لطیف	-	-
۶۰	عطر کلام	سید صفیر حسین ہاشمی		-
۶۱	عادل شاہی مرثیے	میر سعادت علی رضوی	سنہ ۱۹۸۰ء	ابوالکلام آزاد اردو سنٹر ویمیرج انسٹیوٹ حیدرآباد
۶۲	غزل اور مسائل غزل	ڈاکٹر حفیظ قتیل	-	-
۶۳	غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	سنہ ۱۹۷۴ء	کوہ نور پریس دہلی
۶۴	فہرست مخطوطات	نصیر الدین ہاشمی	-	-
۶۵	فسانۂ عجائب	مرحب علی بیگ سرور	-	-
۶۶	کاشف الحقائق ج ۲ پہلا دوسرا ایڈیشن	امداد امام اثر	سنہ ۱۹۰۳ء سنہ ۱۹۸۳ء	ترقی اردو بیورو
۶۷	کاروان ماتم	علامہ نجم آفندی	سنہ ۱۹۵۰ء	زاویہ ادب حیدرآباد
۶۸	کلیات منیر	منیر شکوہ آبادی	-	-

۶۹	گلدستۂ سلام بہ یادگار صد سالہ یوم انیس	حکیم محمد حسن حاذق	۱۹۷۳ء	بزم توقیر ادب بمبئی
۷۰	گلزار داغ	تسکین کاظمی	-	-
۷۱	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۹۷۵ء	مکتبۂ علم و فن دہلی
۷۲	موازنۂ انیس و دبیر	شبلی نعمانی	۱۹۸۲ء	مکتبہ جامع لمیٹڈ نئی دہلی
۷۳	مقدمۂ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۹۸۹ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
۷۴	نگارشات ادیب	سید مسعود حسین ادیب	-	-
۷۵	نسیم البلاغت	سید جلال الدین حیدری	-	مطبع انوار احمدی الہ باد
۷۶	نظم مبارک	سید علی اوسط رشک	-	-
۷۷	وادیٔ السلام	میر مہدی علی شہید	-	-
۷۸	ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	-	-
۷۹	ہسٹری آف اردو لٹریچر	رام بابو سکسینہ	-	-

تذکرے

نمبر شمار	تصنیف	مصنف	سنہ	مقام
۱	تذکرۂ شعراء ہندی	میر حسن	سنہ ۱۷۷۵ء	-
۲	تذکرۂ شعراء معروف بہ تذکرۂ ہندی	مصحفی	-	-
۳	تذکرۂ ریاض الفصحاء	مصحفی	-	-
۴	تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو	امیر علی جونپوری	سنہ ۱۹۸۵ء	سرفراز پریس لکھنؤ
۵	تذکرۂ ہزار داستان	لالہ سری رام		-
۶	مرقع سخن	مرتبہ ڈاکٹر زور	-	-

مقالے

سلسلہ	تصنیف	مصنف	سنہ	مقام
۱	حیدرآبادی مرثیہ آزادی کے بعد	سیدہ زہرا بیگم	۱۹۸۹ء سنہ جنوری	یونیورسٹی آف حیدرآباد
۲	اردو مرثیہ کا ارتقاء	سلطانہ بیگم		عثمانیہ یونیورسٹی
۳	بنجم افندی بحیثیت شاعر	ریاض فاطمہ	۱۹۸۶ء سنہ جون	عثمانیہ یونیورسٹی

مخطوطات

ن ن سلسلہ	تصنیف	مصنف	مخزونہ	مملوکہ
۱	کلیات محمد قلی قطب شاہ	محی الدین زور	سالار جنگ لائبریری	
۲	بیاض مراثی	۱۳۸،	،،	،،
۳	،، ،،	۱۹	،،	،،
۴	،، ،،	۵	،،	،،
۵	،، ،،	۴	،،	،،
۶	بیاض مراثی	مسدود	-	حسن امانت خانی
۷	بیاض سلام	مسدود	-	حسن امانت خانی
۸	بیاض مجموعہ کلام	برق موسوی	-	ڈاکٹر اکبر علی بیگ

رسائل

۱	العلم بمبئی	دوماہی	جون ۱۹۹۳ء	سلام کا ارتقائی سفر پدم شری علی جواد زیدی	۴۷-۹
۲	"	"	"	جدید مرثیے کے محرکات اسالیب پروفیسر وحید اختر	۵۹-۴۸
۳	"	"	"	دبیر کے دبستان امروہہ تنظیم امروہی پر اثرات	۱۰۴-۹۲
۴	"	"	"	دیوان سلام سراج رفعت رضوانہ	۱۹۳-۱۹۱
۵	"	"	"	مراثی قدیم درگاقلی خان درگاہ قلی خان	۲۱۳-۲۰۸
۶	"	"	اکتوبر ۹۳ء	شمع تعزیت پروفیسر نیر مسعود	۲۵-۱۳
۷	آندھرا پردیش	-	جنوری ۱۹۸۶ء	اردو مرثیہ اور تمدنی عناصر ڈاکٹر ثمینہ شوکت	-
۸	الکٹرا حیدرآباد	ہفت روزہ	۱۵ جولائی ۱۹۶۲ء	واقعہ کربلا کا اثر اردو ادب و دیگر فنون پر ڈاکٹر اعجاز حسین	۷-۵
۹	شاہکار حیدرآباد اربعین نمبر	"	اکتوبر ۸۷ء	انیس دکن حضرت باقر امانت خانی ڈاکٹر صادق نقوی	۵-
۱۰	"	"	۹ جنوری ۱۹۸۰ء	اردو ادب پر کربلا کے علامتی و غیر علامتی اثرات ہلال نقوی	۸-
۱۱	شب خون الہ آباد	سہ ماہی	جولائی ۸۵ء آگسٹ ستمبر	اردو نظم اور اس کی پروفیسر گیان چند جین اصناف	۳۸-۳-
۱۲	صدائے جعفریہ حیدرآباد	ماہنامہ	-	نوحے کا ابتدائی اور انتہائی دور سید مرتضیٰ حسین	
۱۳	نظارہ عباس نمبر	-	۱۳۶۸ھ	سلام امیر حیدر امیر	
۱۴	الکٹرا حیدرآباد	ہفت روزہ	۱۵ اگست ۱۹۶۲ء	سلام شاہد صدیقی	۳

قطب شاہی، عادل شاہی۔ نظام شاہی خاندانوں کی
شاعری میں ایسے مرثیے کثرت سے ملتے ہیں جنکا اسلوب
بیان اور فنی طرز سلاموں کا ہے۔"[1]

سید علی رضوی صاحب کا یہ نظریہ حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ سلام مرثیہ سے قبل عالم وجود میں آچکا تھا، اور اسی سے مراثی کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی سلاموں میں بین بکا، گریہ اور مصائب ملتے ہیں۔

سید علی رضوی کی عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ سلام گوئی کے اس سلسلے میں کا آغاز قطب شاہی دور سے ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کیونکہ اس میں واقعات کا تسلسل ہوا کرتا ہے۔

اسی بنا پر یہ بجائے سلام کے مرثیہ کے نام سے مرثائی شاعری میں اپنی پہچان رکھتا ہے یہ درست نہیں کیونکہ سلام مرثائی شاعری کی ہی صنف ہے اور لفظ مرثا عربی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی میت پر رونا یا آہ و زاری کرنا ہے۔ مرثائی شاعری چاہے مرثیہ ہو یا سلام یا کوئی اور واقعات کربلا سے اسقدر مربوط ہیں کہ اسمیں مصائب، گریہ اور بکا ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں ہذا عصر حاضر کے سلام بھی اس سے عاری نہیں۔

دوسرے یہ کہ اردو میں مرثیہ نگاری کا آغاز قطب شاہی دور سے نہیں بلکہ ۱۵ ویں صدی کے ایک اہم بزرگ شاہ راجو حسینی کی مثنوی "نوسرہار" مصنفہ ۱۵۰۳ء سے ہوتا ہے جو کہ اردو کا پہلا مرثیہ ہے جو مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔

---

[1] حسین ہر سلام از سید علی رضوی ص ۱۱

صنف سلام سے متعلق مندرجہ بالا تمام اقتباسات کا نچوڑ یہی ہے کہ سلام سے مراد غزل کی ہیئت میں لکھی گئی نظم ہے جس میں واقعات کربلا کا بیان مقدار ہے اگرچہ کہ یہ نظریہ حقیقت سے بعید ہے کیونکہ سلام، مثلث، مربع، مخمس غرض کہ ہر ہیئت میں ملتے ہیں لیکن صنف سلام سے متعلق عام رجحان یہی ہے۔ چنانچہ اکثر مصنفین نے اسکو متعارف کروانے کے لیے صنف غزل کا سہارا لیا ہے

صنف غزل اردو شاعری کی آبرو کہلاتی ہے لیکن ڈاکٹر ضمیر احمد نقوی کے کہنے کے مطابق دنیا کی کسی بھی زبان کا شعر و ادب اور شاعری کی کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے کہ جسنے واقعۂ کربلا سے تاثر نہ قبول کیا ہو کیونکہ واقعۂ کربلا میں اسقدر شعری افکار موجود ہیں جس سے فیض یاب ہو کر شاعر اپنے فن کو جلا بخشتا ہے۔

ڈاکٹر ضمیر احمد نقوی اپنی تصنیف "اردو غزل اور کربلا" میں اس تعلق سے رقمطراز ہیں کہ

"شاعری میں واقعۂ کربلا کے اثرات دو طرح کے ملتے ہیں

شعوری حیثیت سے اور غیر شعوری حیثیت سے شعوری

فکر کی کارفرمائی مرتبے میں اور غیر شعوری فکر غزل میں اکثر سامنے آئی ہے" ۱؎

شعوری فکر اور غیر شعوری فکر کے فرق کو وہ اشعار کے ذریعہ اسطرح واضح کرتے ہیں

بحیثیت شعوری فکر میر انیس کے مندرجہ بالا اشعار کا عنوان "تیر اور خیمہ گاہ" ہے

سنبھلے تھے جانماز پہ شاہِ فلک سریر ۔۔۔ ناگاہ قریب آکے گرے تین چار تیر

دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکرِ شریر ۔۔۔ عباس اٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر

بیرو انے تھے سراجِ امامت کے نور پر

روکی سپر حضور پر امت ظہور پر

۱؎ اردو غزل اور کربلا ۔۔۔ از سید ضمیر احمد نقوی ص ۷

بحیثیت غیر شعوری فکر وہی عنوان غزل میں جس میں رئیس امروہی نے واقعہ کربلا کی ایک علامت پیش کیا ہے۔

کیسی نجات مل نہ سکے گی پناہ تک
اب تیر آ رہے ہیں میری خیمہ گاہ تک

شعر شاعری اور شاعر کے کربلا سے گہرے ارتباط کو ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ شعر کی تعریف کے سلسلے میں قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں

ترجمہ:- "اور جو لوگ راہِ خدا میں قتل کئے جائیں انھیں
مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں انکی اس
زندگی کا شعور نہیں"

"شعر شعور سے ہے اور جہاں شعور ہے وہاں شہید کی زندگی کا احترام ہے واقعۂ کربلا شعور انسانی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے اسی لئے شعر شعور کی تلاش میں ہے اس لئے واقعۂ شہادت تک پہنچ جاتا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب کے نظریئے کے مطابق شاعری تعمیری کام انجام دیتی ہے مثلاً بے حس قوتوں کو چونکانا، احساس کو جگانا، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارنا گرتی ہوئی قوموں کو ابھارنا وغیرہ۔ حالی نے شعر کیلئے جو بنیادی شرائط رکھے ہیں ان میں "اصلیت" بھی ایک شرط ہے چنانچہ شاعری کو ہم حقیقت یا سچائی کی تلاش کہیں تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس راہ کا مثلاً یا پھر حقیقت کی منزل کو پانے والا ہی تعمیری کام انجام دیتا ہے یہ مسئلہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ایک بڑی سچائی واقعۂ کربلا ہے۔ اس حقیقت کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا چنانچہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں کہ:-

"ہر شاعر جب سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ
دشتِ کربلا میں پہنچتا ہے یہ منظر دیکھتا ہے کہ :"

تنہا کھڑا ہے ایک مسافر لہو میں لال
فوجیں ستم کی گرد میں آمادۂ قتال
چلنے میں تیز تر ہے زبان کا جب سوال

از بسکہ اہلِ درد کا تھا بیتاب ہو گیا
پانی کے مانگنے پہ جگر آب ہو گیا

اور وہ جب اس سچائی کو پا لیتا ہے۔ تڑپ، درد اور کسک کے جذبات اسکے کلام کے لازمی اجزاء قرار پاتے ہیں جس سے کلام میں تاثر کا پیدا ہونا ایک یقینی امر ہے۔ بالکل خصوصی صنف غزل پر یہ نظریہ صادق آتا ہے کیونکہ عشق و محبت یہ وہ رویے ہیں جو غزل کی عمارت کا دار و مدار ہے یا جو غزل کی عمارت کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو کہ عشق و محبت کا انجام "غم" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل سوز و گداز، حسرت و یاس، درد و الم سے لبریز ہوتی ہے۔

ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں کہ :-

"واقعۂ کربلا داستانِ عشق بھی ہے اور داستانِ غم بھی۔
امام حسین عشقِ الٰہی کے میدان میں قربانی پیش کر رہے تھے۔
عشقِ الٰہی کی مکمل داستان سے غزل کیسے نہ متاثر ہوتی جبکہ
غزل کا بنیادی موضوع عشق ہی رہا ہے میر تقی میر سے
اقبال تک آپ کو غزل میں ایسے اشعار بے شمار ملیں گے" [1]

---

[1] اردو غزل اور کربلا — سید ضمیر اختر نقوی ص 19

شہنشاہِ غزل میر تقی میر نے نہ صرف واقعۂ کربلا سے تاثر قبول کیا ہے بلکہ وہ اپنے جذبات عقیدت کا اظہار اپنی غزل میں اس طرح کرتے ہیں۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو صرف ایک خواجہ میر درد ہی ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے مرثیہ یا سلام نہ کہا ہو۔ باوجود اس کے وہ بھی واقعۂ کربلا سے تاثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔ غزل کے وہ اشعار جن میں انھوں نے شہادت عظمیٰ سے تاثر قبول کیا ہے اپنے اس شعر میں وہ تاریخ کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جبکہ بعد شہادت حسینؑ اس لٹے ہوئے قافلے کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا اور علی ابن حسینؑ کو زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔

اٹکی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی ہیں گرفتار ہو گئے (خواجہ میر درد)

علاوہ ازیں چند اور مشہور غزل گو شعرا کے ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جس میں واقعۂ کربلا سے تاثر قبول کیا گیا ہے۔ یہ تمام اشعار غزل کے ہیں۔

ہندوستاں میں عرصۂ دشت بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک (مصحفی)

شریک روح بھی ہے میری میرے ماتم میں
شمول دل عزا اور کون ہے میں ہوں (داغ دہلوی)

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے (

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کیساتھ (مومنؔ)

لکھوں جس میں کوئی مضمونِ ظلم چرخِ بریں
تو کربلا کی زمیں ہے میرے غزل کی زمیں (ذوقؔ)

الطاف حسین حالیؔ کی غزل کا شعر جس میں وہ صبح عاشور اور شام غریباں کی طرف مبہم سا اشارہ کرتے ہیں۔

گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
ہر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش (حالیؔ)

زندانِ شام کا بیان جسکو ایسے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے جسے پڑھنے والا اک آہِ سرد کھینچے بنا نہیں رہ سکتا۔

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی
نگہباں چیخ اٹھے ہل گئی دیوار زنداں کی (حسرتؔ موہانی)

مندرجہ بالا اشعار سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ صنفِ غزل واقعۂ کربلا سے حد درجہ متاثر رہی ہے جسکا سبب ڈاکٹر ضمیر نقوی یہ بتاتے ہیں

واقعۂ کربلا میں یہ تمام اجزاء مثلاً مظالم، مصائب، صحرا نوردی صبر و وفا، خانہ ویرانی، بے نوائی، اسیری وغیرہ غزل کیلئے بھی جاذبِ نظر تھے چونکہ یہ تمام مضامینِ کربلا اور غزل میں مشترکہ کہے جا سکتے ہیں۔ اسلئے بھی غزل پر واقعۂ کربلا کا بھرپور اثر پڑنا لازمی تھا۔" [1]

---

[1] اردو غزل اور کربلا از ضمیر اختر نقوی ص ۶۸

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اپنی وقیع تصنیف "واقعۂ کربلا
بطور شعری استعارہ" میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ واقعۃ الحروف
نے بھی آخری باب میں تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے یہ عرض کرنے کی
جسارت کی ہے۔ غزل میں کربلا کا استعارہ اور سیکڑوں تراکیب و
الفاظ مثلاً ساحل، دریا، پیاس، صحرا، زنجیر، جھنکار، علم، شبدا،
خنجر وغیرہ سلام کے توسط میں غزل میں آئے۔

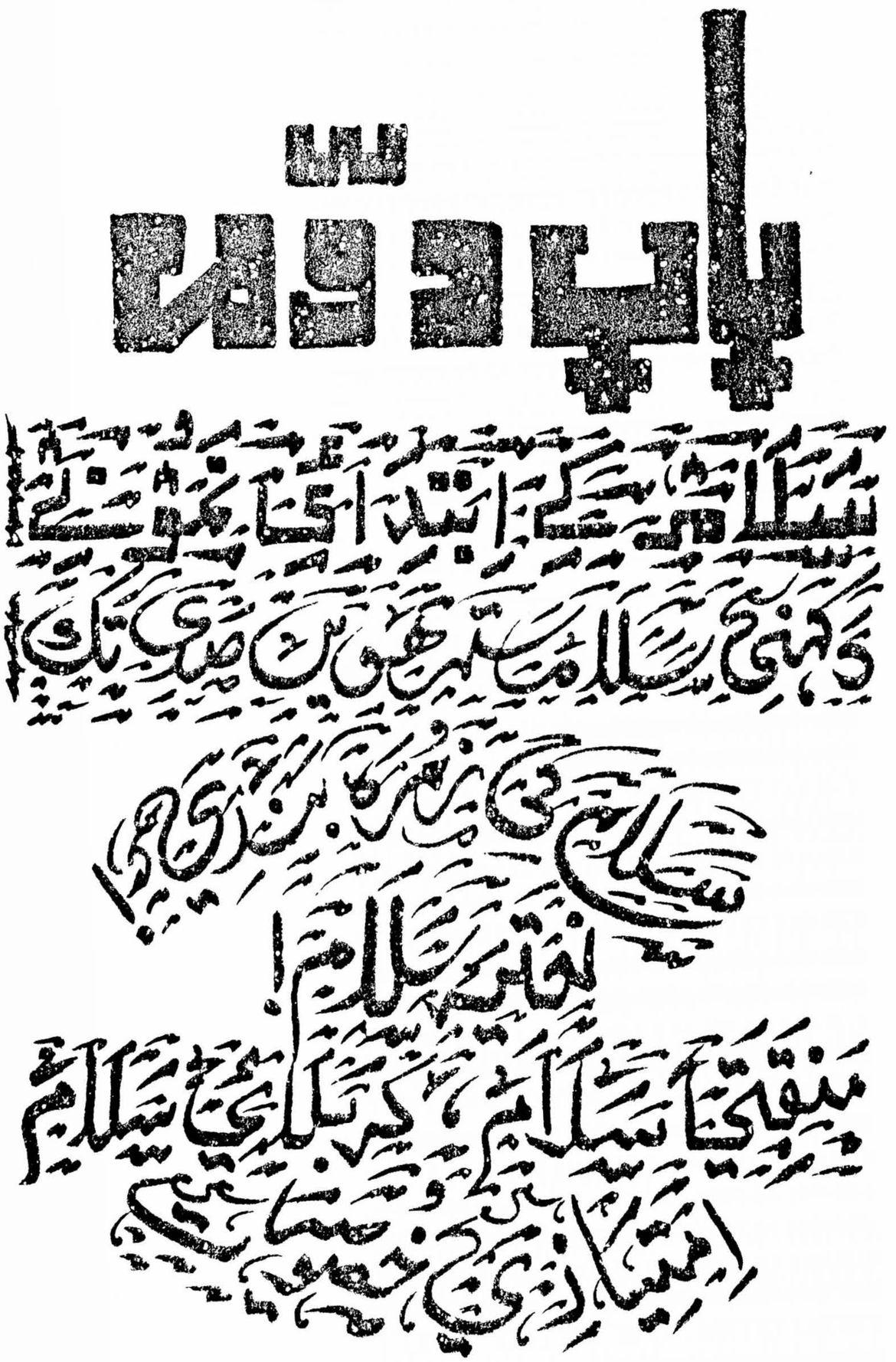

سلام خالص اردو صنف ہے اگر اسے اردو شاعری کی آبرو کہا جائے تو بے جا ہوگا کیونکہ یہ صنف سخن دوسری اور اضافی کیفیت کسی دوسری زبان سے اردو میں نہیں آئی

تاریخی طور پر اسکا تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ بہت ہی مقدس صنف سخن ہے اسلئے کہ اسے قرآن سے ربط ہے۔ قرآن مجید میں کل اکتیس ۳۱ مرتبہ لفظ سلام کا استعمال ہوا ہے "سلاماً" سات مرتبہ اور "تسلیماً" یعنی (سلام کرو) دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

خدا وند عالم اپنی مقدس کتاب میں سلام کا ذکر دو جگہوں پر کرتے "والمحصنات" میں سورۂ نساء جو مدینے میں نازل ہوئی ہے اکیسو چھبیس آیتوں اور چوبیس پر مشتمل ہے اسکی ۸۶ ویں آیت میں سلام کا ذکر کرتا ہے۔ اسکی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور ساتھ ہی سلام کی تائید بھی کرتا ہے ملاحظہ ہو۔

"اور جب تمہیں کسیطرح کوئی شخص سلام کرے تو
تم بھی اسکے جواب میں اس سے بہتر طریقہ سے سلام کرو یا وہی
لفظ جواب میں کہدو۔ بیشک خدا ہر چیز کا حساب کرنیوالا ہے"

اس آیت میں جواب سلام کی کیفیت سے تائید کی گئی ہے جسکا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی امر کرے بجالانے کا اگر کہے تو وہ واجبات میں شامل ہے یعنی سلام کرنا تو سنت ہے لیکن جواب سلام واجب ہے۔ واجبات فرض ہیں انہیں ہر حال میں ادا کرنا ضروری ہے ورنہ روز محشر جواب طلبی ہونا پڑیگا اور ترک واجبات کے ادا نہ کرنے پر جسطرح روز محشر پرسش ہوگی۔ بالکل اسی طرح جواب سلام نہ دینے پر بھی اس کا حساب نامۂ اعمال میں برابر ہوتا رہے گا۔

سلام کا تقدس اسطرح ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پاک و پاکیزہ تحفہ قرار دیتا ہے۔ "سورۂ النور" مدینے میں نازل ہوا اور چونسٹھ آیتوں اور نو رکوع پر مشتمل ہے قرآن مجید کے اٹھارویں پارے "قد افلح" میں ہے ارشاد باری ہے۔

"پھر جب تم گھروں میں جانے لگو (اور وہاں کسی کو نہ پاؤ) تو خود اپنے ہی اوپر سلام کر لیا کرو جو خدا کی طرف سے ایک مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ سلام کو پاک و پاکیزہ تحفہ قرار دیتا ہے اور اسی لئے قرآن مجید کے ساتویں پارے "واذا سمعوا" میں سورۂ انعام ہے یہ سورہ مکی ہے اور ایکسو پینسٹھ آیتوں پر مشتمل ہے اسکی ۵۴ ویں آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کی تاکید کرتا ہے۔

"اور جو لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں تمہارے پاس آئیں تو تم سلام علیکم (تم پر خدا کی سلامتی) کہو۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے۔"

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں نہ صرف پیغمبر اسلام کو سلام کی تاکید کرتا ہے بلکہ اسکی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور ایمان لانیوالوں کو ہی اسکی تاکید کرتا ہوا سورۂ "الاحزاب" کی ۵۶ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے

"اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ خدا اور اسکے فرشتے پیغمبر اور انکی آل پر درود بھیجتے ہیں تو اے ایمان دارو تم بھی درود بھیجتے رہو اور برابر سلام کرتے رہو۔"

اللہ تعالیٰ نہ صرف اپنی کتاب میں سلام کی تاکید کرتا ہے بلکہ خود بھی آل یٰسین اور آل طٰہٰ پر سلام بھیجکر دنیا والوں کو سلام کا سلیقہ سکھلاتا ہے، جسکی پیروی پیغمبر اسلام نے کی ہے نہ بحیثیت پیغمبر انھوں نے صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام ہی دنیا والوں تک نہیں پہنچایا بلکہ پیغام کی عملی تفسیر پیش کرکے کائنات کو سلیقۂ عمل بھی بتا دیا۔

سلام کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سلام کا جواب واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص نماز میں مشغول ہو اور ایسے میں کوئی شخص اسے سلام کرے تو حالتِ نماز میں بھی سلام کا جواب دینا واجب قرار دیا گیا۔

مذہب اسلام میں لفظ سلام کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سلام کی تاریخ کا کوئی بھی دور ایسا نہیں جسمیں لفظ سلام نہ ملتا ہو۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ قرآن مجید جو تیس پاروں اور ایکسو چودہ سوروں پر مشتمل ہے وہ بیک وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل نہیں ہوا بلکہ بالاقساط یہ آنحضرت پر نازل ہوا جسکی تکمیل معراج کو عمل میں آئی۔

قرآن مجید کے نزول کا طریقہ یہ رہا کہ جبرئیل امین وقتاً فوقتاً بحکم پروردگار عالم آیتیں لیکر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور جب بھی یہ آیت لیکر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے پہلے اللہ تعالیٰ کا سلام آنحضرت کو پہنچاتے۔ بعد ازاں اس امر کو بجا لاتے جسکی غرض سے وہ آنحضرت کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔

اسکے معنی یہ نہیں کہ جبرئیل امین صرف آیت لیکر ہی آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے بلکہ کئی مرتبہ جبرئیل امین نے بغیر آیت کے بھی اس دیر پاک پر حاضری دی ہے۔ مثال کے طور پر واقعۂ معراج جسمیں کہ جبرئیل آیت لیکر دیر پاک پر حاضر نہیں ہوئے تھے بلکہ

صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعوتِ معراج پر حاضر ہوئے تھے اور اس وقت بھی جبرئیل امین نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنحضرت کے پاس تحفۂ سلام بھیجا۔

رسول اللہ کے دور میں بھی ہمیں سلام کی سنت مندرجہ روایت ملتی ہے جس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ سارے اصحاب اہلبیت پر سلام بھیجا کرتے تھے۔

حدیث کساء میں بھی ہمیں بار بار سلام کا ذکر ملتا ہے۔ سب سے پہلے آنحضرت اپنی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے دولت سرا پر تشریف لاتے ہیں اور سلام بھیجتے ہیں۔ بعد از سلام اپنے بدن میں ضعف محسوس کرتے ہوئے ایک کساء کی خواہش کرتے ہیں تاکہ اوڑھ سکیں۔ بنتِ رسول حسبِ فرمائش ایک کساء یمانی لا کر اپنے بابا کو اوڑھاتی ہیں۔ بعد از آں یہ سلسلہ چلتا رہا کہ باری باری امام حسنؑ، امام حسینؑ حضرت علی ابن ابی طالب اور جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا سلام بھیجتے رہے اور زیرِ کساء داخل ہوتے رہے۔ اس طرح سے جب پنجتن پاک زیرِ کساء جمع ہو چکے تو جبرئیل امین بحکم پروردگار آئینہ تطہیر لیکر تحفۂ درود و سلام کے ساتھ درِ سیدہ پر حاضر ہوئے اور بعد از آں زیرِ کسائے پیغمبر داخل ہو کر پنجتن کیساتھ شامل ہو گئے۔

سلام کی اہمیت اور ساتھ ہی خاتونِ جنت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی عظمت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت جس وقت بھی مدینے سے باہر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں اپنی لختِ جگر فاطمۃ الزہرا کے درِ پاک پر تشریف لے آتے اور سلام کرتے اور شہرِ مدینہ میں واپسی پر سب سے پہلے درِ بتولؑ عذرا پر تشریف فرما ہو کر سلام بجا لاتے۔

ہر دور میں سلام کی روایت کا سلسلہ چلتا رہا، چنانچہ بعد ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر سلام بھیجنے والوں میں مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اولیت حاصل ہے کہ سب سے آخر میں آپ ہی قبر مطہر سے اٹھے اور سب سے پہلے آپ ہی نے سلام عقیدت پیش کیا۔

بعد ازاں سب سے پہلا خطبہ خاتون جنت جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا نے ہی دیا تھا جس کے اختتام پر آپ نے اپنے بابا پر سلام بھیجا ہے۔

بالکل اسی طرح خاتون جنت جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی وفات پر بھی سب سے پہلا سلام مولائے کائنات حضرت علی ابن ابوطالب علیہ السلام ہی نے کیا ہے کیونکہ وقت تدفین بجز مولائے کائنات کے کوئی اور نہ تھا۔ اسی طرح سے ہر امام کی شہادت کے بعد ہو سکتا ہے دوسرے امام ہی نے سب سے پہلے انپر سلام بھیجا ہے۔

سن ۶۱ھ میں کربلا میں بھی نہ صرف سلام کی روایت برقرار رہی بلکہ اسکو کچھ زیادہ ہی تقویت ملی۔ روز عاشورہ صبح تا عصر جتنے بھی مجاہدین راہ خدا میں معرکۂ حق و باطل کو سر کرنے کے لئے میدان جنگ میں آئے جن میں اصحاب و انصار کے بھائی، بھتیجے اور بیٹے شامل تھے تمام شہداء نے بجز حضرت علی اصغرؑ وقت آخر گھوڑے سے گرتے وقت اپنے مولا و آقا امام حسین علیہ السلام پر سلام بھیجا ہے اور مدد کیلئے اپنے مولا و آقا کو آواز دی ہے جیسے حضرت قاسمؑ کا سلام۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا عَمَّاهُ اَدْرِكْنِي یعنی کل ۷۲ شہداء نے اپنے مولا و آقا پر سلام بھیجا اور اپنی مدد کے لئے آواز دی ہے، جبکہ حضرت علی اکبرؑ نے وقت آخر اپنے بابا پر سلام ضرور بھیجا ہے لیکن انہیں مدد کیلئے نہیں پکارا لہذا تمام شہداء کربلا کی طرح

آپ نے سلام علیک نہیں فرمایا بلکہ یا ابتاہ نبی علیک السلام فرمایا ہے۔

صبح تا عصر جب تمام اصحاب و انصار راہ خدا میں اپنے مولا و آقا پر سے اپنی اپنی جانیں نثار کر چکے یہاں تک کہ شخصاً ماجاہد علی اصغر بھی راہ خدا میں اپنی جان نثار کر چکا تب امام عالی مقام تنہا رہ گئے۔ رخصت آخری کے لیے خیمہ میں تشریف لائے اور تمام اہم اہم بیبیوں پر اپنے سلام آخر بھیجا۔

یا زینب و ام کلثوم و لیلیٰ و ام رباب و سکینہ و فاطمہ علیک السلام۔ یہاں تک کہ اپنی ماں کی کنیز خاص حضرت فضہ کو بھی امام نے سلام کیا۔ جب شہادت حسین بیمار کربلا نے اپنے بابا کا سر نوک نیزہ پر بلند دیکھا تو سب سے پہلے اپنے بابا پر سلام علیک یا ابا عبداللہ کہہ کر سلام بھیجا۔

ایک روایت میں یہ بھی [illegible] زینب نے سب سے پہلے امام حسین پر سلام بھیجا ہے لیکن قبولیت عامہ اس روایت کو حاصل ہے کہ [illegible] سب سے پہلے سر حسین کو نوک نیزہ پر بلند دیکھ کر سلام کیا [illegible] زیارت [illegible] زیارتوں کا آغاز ہوتا ہے امام علیہ السلام سے ہوا [illegible] دیگر سب سے پہلے سلام بھیجنے والوں میں جابر ابن عبداللہ ہیں۔

سب سے اہم سلام جو زیارت ناحیہ کے نام سے ہے جو بارھویں امام علیہ السلام سے منسوب ہے یہ اہم ترین سلام ہے۔ زیارت ناحیہ کا منظوم ترجمہ میر عشق [illegible] کا آغاز یوں ہوتا ہے

سلام [illegible]

[illegible] زیارتوں کے بعد [illegible] آنحضرت روایتوں

کے ذریعہ ہم تک پہنچیں ہیں بالکل اسی طرح زبانیں بھی روایتی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔ اسی سے روایتاً جو زبانیں چلی آرہی تھیں علامہ محلبی نے اپنی ایک کتاب میں جمع کیا ہے اور اس کتاب کو کتاب الطراز کا نام دیا ہے

سلام کی دوسری شکل صلوات ہے۔ فارسی اور اردو میں درود کہتے ہیں۔ اگرچہ سلام کی مندرجہ بالا تمام روایتیں ہمیں عربی نثر میں ملتی ہیں لیکن باوجود اسکے عربی علم عروض میں مستقل تلاش لبیارے باوجود سلام نامی کوئی صنف ہمیں ملتی لیکن امداد امام اثر

"اہل فارس کو سلام کوئی کا مذاق نہ تھا اور کوئی دلخواہ
سلام فارسی کا رائج الحرف کو نہ مل سکا۔" [1]

چنانچہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سلام خالص اردو ہی کی صنف ہے اور اردو کی ابھی اس مقدس تخلیق پر ناز ہے۔ اسکی ابتدا ادبی صنف ہر شبہ کسیطرح دکن سے ہوتی ہے اور ان قدیم ترین تخلیقات پر اہل دکن بجا طور پر ناز اں اور فخر ہیں

دکن کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو کی ابتدا اور ارتقاء ادوار میں منحصر منقسم ہے۔ بہمنی دور اردو زبان کے آغاز کا سب سے پہلا دور قرار پاتا ہے جو ۷۴۷ھ تا ۹۰۰ھ پر محیط ہے جن میں ہمیں حسب ذیل شعراء اور نثر نگاروں کا پتہ چلتا ہے۔

۱) حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز (۲) سید اکبر حسینی

---

[1] کاشف الحقائق از امداد امام اثر ص

(۳) نظامی (۴) شاہ [illegible] (۵) عبداللہ حسینی

(۶) مشتاق (۷) لطفی (۸) شاہ میراں جی شمس العشاق

(۹) آذری - اس دور کے نظم و نثر میں زیادہ تر صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔

اصناف سخن میں صرف مثنوی کا غلبہ ہے۔ اس کے علاوہ صنف غزل، اصناف سخن اور قصیدے پر بھی بعد میں طبع آزمائی کی گئی۔

اگرچہ اس دور کے شاعر نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا آغاز حمد و نعت و منقبت سے ہوا جس کا متعلق نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں رقم طراز ہیں

"مثنوی حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوئی

ہے اس کے بعد علاء الدین بہمنی کی مدح لکھی ہے

پھر اصل قصہ شروع ہوا ہے۔" [1]

"تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" جو ۵۰۰ مرثیہ نگاروں کے تذکرہ پر محیط ہے

مرزا امیر علی بیگ جونپوری لکھتے ہیں:

"ان کا سب سے اہم کارنامہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

۸۲۵-۸۳۹ھ م ۱۴۲۱-۱۴۳۵ء ہے دکن کے مرثیہ گو

شاعروں نے سراپا نظم کرنے پر بہت کم توجہ

---

[1] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۶۰

دی ہے۔ بعد کے مرثیہ نگاروں نے اس
پر توجہ دی ہے۔ نظامی صاحب نے امام حسینؑ
کا سراپا لکھنے اندر نہیں لکھا ہے اس طرح آنے
والے دور کے شعراء کے لئے ایک نئے راستے
کی رہنمائی کی ہے۔" [1]

امیر علی جو بنیوری اسکا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں اور جس کے لئے
انہوں نے شاگردانِ انیس کا حوالہ دیا ہے۔

حسنؑ تاجِ تاباں سلامٌ علیک
حسینؑ ماہِ تاباں سلام علیک
پیشانی حسینؑ کی جو والشمس ہے
بجواں مردِ قرباں سلامٌ علیک
مبارک دو لب سورۂ الما ئدہ
دو تشدید دندان سلامٌ علیک
دو نصر من اللہ و فتحٌ قریب
شہنشہ کی بابا ں سلام علیک
حسینؑ کا سوگند سینہ سورۂ الفاتحہ
دو قد آلِ عمراں سلامٌ علیک

---

[1] تذکرۂ مرثیہ نگارانِ اردو — از مرزا امیر علی بیگ جوبنیوری صفحہ ۴۹۸

نظامی قیامت کا کچھ ڈر نہ کر
حسینؑ شاہِ سلطاں سلامتؑ علیک

سیاقِ عبارت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ امیر علی جونپوری نے نظامی (فخر دین) اور نظامی بربا نپوری کی خلط مبحث کیا ہے جو سلام سبیش لیا گیا ہے بلاشبہ عقیدت کی آنکھوں سے دیکھئے تو لاجواب اور بے مثال ہے لیکن اسمیں ترکیب اور الفاظ کا استعمال بہت لغو کا معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال جب بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تو گولکنڈہ میں قطب شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی اور بیدر میں بریدشاہی اس طرح پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔

قطب شاہی دور اردو کی آغاز اور ارتقاء کا دوسرا دور قرار پاتا ہے جسمیں رثائی شاعری کا خاطر خواہ سرمایہ ہمیں دستیاب ہوتا ہے

مندرجہ بالا پانچ سلطنتوں میں سے قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں بھی رثائی شاعری کا سرمایہ زیادہ سے زیادہ ملتا ہے

اگرچہ رثائی شاعری کا آغاز بہمنی قطب شاہی دور سے ہوا اور نہ ہی عادل شاہی دور سے بلکہ اسکا سہرا نظام شاہی سلطنت کے شاعر شیخ اشرف کے سر ہے جسکی تصنیف "نوسرہار" ہے جو ۱۵۰۲ء میں لکھی گئی جسمیں دس ابواب اور چھبیس فصلیں ملتی ہیں اور جو ۱۸۰۰ اشعار پر مبنی ہے لیکن اسکے باوجود اسلام کا کوئی ذکر نہیں ملتا

عادل شاہی دور کے شاعر میراں الدین جانم کے ہاں بھی ہمیں مرثیے تو ملتے ہیں

سعادت علی رضوی نے "عادل شاہی مرثیے" میں شائع کیا ہے لیکن سلام دستیاب نہیں ہوتا
ڈاکٹر محمد حسین چراغ علی اپنی تصنیف "اردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" رقم طراز ہیں کہ:-

"نوسر ہار سنہ ۹۰۹ھ سے محمد قلی قطب شاہ سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ تک یقیناً ثنائی شاعری بھی ہی گئی جو اب ناپید ہے۔ اسکے علاوہ اس عہد میں دکنی زبان کے کتنے ہی شاعر پیدا ہوئے ہونگے جن کے نام بھی اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں" ۱؎

ڈاکٹر محمد حسین چراغ علی کا اقتباس صد فی صد حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور یقیناً صنف سلام کسیا تھ بھی یہی ہوا ہے اور جب مرثیہ لکھا گیا ہوگا تو عقیدتاً سلام بھی کہے گئے ہوں گے۔

سلام گوئی کی صحت مند روایت ہمیں قطب شاہی دور کے پانچویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے دور ہی سے ملتی ہے

سید علی رضوی اپنی تصنیف "حسین اور سلام" میں محمد قلی قطب شاہ کے سلام کے ضمن میں مندرجہ ذیل نمونہ پیش کرتے ہیں

؎ محرم مہینے میں آیا امام کا ماتم کریں ہم بھر بھر
زمیں اور آسماں میانے بھریا الرقے الم کے بھر بھر

جسپر سلام کا کلام اور مرثیہ کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے لیکن مندرجہ نمونوں پر سلام کا زیادہ

۱؎ اردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈے میں۔ از ڈاکٹر محمد حسین چراغ علی ص ۱۶

اطلاق ہو سکتا ہے یہ کلیات محمد تقی قطب شاہ مرتبہ [illegible] الدین قادری زور سے لئے گئے ہیں۔

یہی مولود لیا ہے خیر سر تھے خوشی کا — سدا صلوات بھیجو سب محمدؐ اور ہو علیؑ کا
بڑائی ہے بہوت اس دلیں ہمکو عید اس میں مارے — سعادت میں سعادت ہے سعادت اس گھڑی کا
سو ساعت کی سعادت میں دعا مانگے جو — لکھیں بخشش کا خط اسکی پیشانی پر حلی کا
نبی مولود ہے دیباچہ سب مولود کیا ہے — سو ہے نوروز عیداں میں اندر تے سروری کا
ازل تے عید کیا خوشیاں جگت میں بھیال لیکن — ہمارے دور میں دائم خوشی ہے ہاشمی کا

درود لک اس نبی پر جو برحق رب کے پیارے ہیں۔ جو فیروزی مہاڑیاں نو جشن کے تئیں سنگارے ہیں
امنس دن مولود آئے خوش خبر قدسی لوہا نے خوشی۔ بھرا مولود گنائے خوش جنت آئو سنوارے ہیں
فلک سرہانی مخمل کے ملک در زباں سوتا رول سے — شفق کی کوٹ لالہ سے منتدب نوری سے ہیں
چندر نمو اس ہو آیا گگن سمدر بھتر ڈھایا — نبی پر وار نے لیا یا ڈھلک موتیاں سوتارے ہیں
سدا تو راج کر قطبا اشرز کا سیاج کر قطبا — نبی کا کاج کر قطبا کے تج بخشانے بارے ہیں

بکر عید آیا صلوات بر محمدؐ — آنند علم آیا نا صلوات بر محمدؐ
جیکج مراد میرا دل میں جو تھی خدا تھا — وہ ہی مراد پایا صلوات بر محمدؐ
بارہ امام پنج تن کا مہر جم ہما ہو — سنج میں چھا نو چھایا صلوات بر محمدؐ
میری خوشیاں کی بیلاں کن منڈوے پر فکر — جبرئیل ورد لایا صلوات بر محمدؐ

یک دھیاں یک چت سوں دل ہو جیو میرا — حیدر سوں صدقہ لایا صلوات بر محمدؐ
دندیالی کی ذات کوں سب یک دھیر لو ہے کبریٰ — دک آگ میں بھونایا صلوات بر محمدؐ
صدقے نبی کے قطبا جناں محل میانے — عشرت پکڑ بسایا صلوات بر محمدؐ

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے سلام ہی کی ایک شکل صلوٰۃ ہے۔ فارسی یا اردو میں اسے درود کہتے ہیں چنانچہ مندرجہ بالا نمونوں کا اطلاق سلام پر ہی ہوگا۔

جناب مولوی سید مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ لکھنوی صدر الافاضل جو رسالہ صدائے جعفریہ میں اپنے مضمون نوحہ کا ابتدائی اور انتہائی دور کے سلسلے میں صنف سلام اور نوحہ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

"سلام ایک مستقل صنف ہے جو نعتیہ قسم کی ایک نظم ہے جسمیں غزل کی طرح خیال آفرینی کیساتھ منقبت (زیادہ) و مصائب محمدؐ و آل محمدؐ کے مضامین باندھے جاتے ہیں اور بحری سلامی یا سلام جیسے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ سلام درحقیقت مرثیہ کا پیش لفظ ہوتا ہے اور نوحہ ایک آزاد و مستقل چیز ہے۔" [۲]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر مرثیہ گو شاعر نے سلام کہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس دور میں مرثیے کے لئے زیادہ سے زیادہ غزل کی ہیئت مستعمل رہی

---

[۱] کلیات محمد قلی قطب شاہ (قلمی) مرتبہ ڈاکٹر زور
[۲] صدائے جعفریہ مضمون نوحے کا ابتدائی اور انتہائی دور از سید مرتضیٰ حسین صاحب

جبکہ سلام کی ہیئت بھی غزل سے جدا نہیں، اگرچہ سلام بھی ہر ہیئت میں لکھا گیا ہے باوجود اسکے ہم دکن کے ابتدائی دور میں سلام اسی کو قرار دیں گے جسکا آغاز لفظ سلام، سلامی مجرئی، مجرا یا سلام علیک سے ہو یا اسمیں درود اور صلوات ہو اور اشعار میں باہمی ربط نہو اگر ان الفاظ کا استعمال نہ بھی ہو اور ہر شعر معنی اعتبار سے مکمل ہو اور اشعار باہمی ربط نہ رکھتے ہوں تو وہ بھی سلام قرار پائے گا۔

بعد ازاں صنف سلام کے لئے صرف اسکے موضوع یا موضوعات اور اسکی خارجی ہیئت ہی اسے دوسرے اصناف سخن سے ممیز کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

ابتدائی دکنی دور میں صنف سلام کے لئے لفظ سلام۔ سلامی کا استعمال بھی اس صنف کی شناخت کیلئے معاون قرار پاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جہاں بھی لفظ سلام نظر آئے اسپر صنف سلام کا اطلاق ہو مثلاً قطب شاہی دور ہی کے شاعر سلطان کی نظم جو ہمیں نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف دکن میں اردو میں ہمیں ملتی ہے جو چھ اشعار پر مشتمل ہے۔

ابرو کی محراب کوں مج ری جیا کا سلام
آج کی شمع کوں تیری میری مون کا سجود
خال کی تل دانہ کوں مرغ دلم کا سلام
ابرسی لت کوں تیری میری لگن کا سجود [1]

اسی طرح ہر شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ سلام استعمال ہوا ہے لیکن اس نظم کا شمار

---

[1] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۱۲۶

قطعی طور پر صنف سلام میں نہ ہوگا۔

سلام کے لیئے موضوعاتی طور پر محمدؐ و آلِ محمدؐ سے ربط ناگزیر ہے

ایک اور رخ قابل غور ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین اپنی تصنیف "تعلیل و تاویل" میں اپنے مضمون "اردو رثائی ادب کے نفسیاتی اور سماجی محرکات" کے رثائی ادب کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے محققین کی اس رائے کی تردید کرتے ہیں کہ رثائی ادب کیلئے غزل کی ہیئت استعمال کرنیکا مقصد یہہ تھا کہ انکے سامنے نمونے کے طور پر فارسی میں کچھ بھی نہ تھا جسکی وہ تقلید کرتے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں

حقیقت یہہ ہے کہ نجی غم و رنج کے اظہار کا بہترین وسیلہ غزل کے سوائے اور کوئی ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف ہماری تمام اصناف سخن میں اور ان کے نفسیاتی عمل سے اگر کوئی صنف مشابہت رکھتی ہے تو وہ غزل ہے۔ انسان کے نفس اور جذبے سے مکمل ہم آہنگی کے اس عنصر نے ابتداء میں اس جذبے کے اظہار کیلئے بھی یہی راستہ اختیار کرنے پر شعراء کو مجبور کیا۔ اسی لیئے ہمارے ہاں ابتداء جتنی بھی رثائی نظمیں تخلیق کی گئیں وہ غزلیہ ہیئت میں ہونے کی وجہہ سے سلام ہی کے دائرے میں رکھی جاتی ہیں۔ ان ابتدائی نظموں میں جذبہ نہ صرف

سیدھے سادے اور غیر مخصوص طریقے سے اظہار
ہوتا ہے بلکہ ہر شعر میں خوبی کی سطح اکبری ہی برتی
ہے ان میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔[1]

اپنے اس اقتباس کے سلسلے میں انہوں نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ:۔

مصطفیٰ کے باغ کا یہ واں کوں بن پانی مکتائے
مصطفیٰ ہور مرتضیٰ ہور فاطمہ کا [illegible] دکھائے
نیکے کپڑے پہنے ہیں پیغمبر ہیں اس غم ستی
دشمنی پکڑے یزید اں مال ہور خاتم ستی[2]

ڈاکٹر ظہور الدین نے ایک نادر خیال کو پیش کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس کی بنا پر سلام کا دامن بہت وسیع ہو جائے گا۔ جس قدر سلام کا [illegible] ہو جائے گا۔ کیونکہ [illegible] ابتدائی دکنی [illegible] کو اپنایا ہے۔

علاوہ ازیں [illegible] ابتدائی دکنی مرثیہ صرف [illegible] ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیہ کہنے میں [illegible] مگر سلام انبیاء پر بزرگان دین پر اور اہلبیت اطہار پر بھی [illegible] مرثیے میں صرف کربلا والوں کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔

---

[1] تعلیل و تاویل — از ڈاکٹر ظہور الدین — ص ۵۲، ۵۳

[2] تعلیل و تاویل — از ڈاکٹر ظہور الدین بحوالہ ڈاکٹر مسیح الزماں اردو مرثیہ کا ارتقاء ص ۳۳

چنانچہ مرثیہ کے مقابلے میں سلام کا دامن نسبتاً کسی قدر وسیع ہے۔

جناب مولوی سید مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ لکھنوی صدر الافاضل اپنے مضمون "نوحے کا ابتدائی اور انتہائی دور" میں سلام کو مرثیے کا پیش لفظ قرار دیتے ہیں۔ ہر تصنیف کے اولین صفحات پر پیش لفظ نظر آئیگا، اور پیش لفظ بالکل وہی نہیں ہوتا جو اصل تصنیف ہوتی ہے بلکہ اس میں مصنف اپنی تصنیف سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے جسکی روشنی میں اس تصنیف کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ اگر پیش لفظ بھی تصنیف کا مثنیٰ ہو جائے تو پھر اسکی ضرورت ہی درکار نہو۔ بالکل اسی طرح سلام کو مرثیے کا پیش لفظ قرار دیا جائے تو سلام اور مرثیے میں فرق لازمی قرار پاتا ہے۔ اگر سلام بھی مرثیہ کی تعریف پر پورا اترتا ہو تو پھر مرثیہ سے قبل تعظیماً اور عقیدتاً سلام کہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

ضمنی طور پر یہاں یہ وضاحت کر دی گئی کہ سلام سے راقمۃ الحروف کی مراد کیا ہے؟ اور مرثیے کی ذیلی اصناف میں کس طرح باہمی ربط اور معنوی تسلسل پایا جاتا ہے اور اسکے باوجود وہ ایکدوسرے سے الگ نہیں۔ واقعات کربلا کے سلسلے میں متعدد اصناف وجود میں آئیں جن میں کی شناخت اور پہچان دشوار طلب ہے مثلاً اس عہد میں لکھی گئی "زاریاں" بھی مرثیہ سمجھی گئیں۔ مسیح الزماں صاحب نے اردو مرثیے کا ارتقاء میں اس طرح کی کوئی تقسیم نہیں کی۔ راقمۃ الحروف نے اپنے ایم فل کے مقالے "حیدرآباد میں مرثیہ آزادی کے بعد" میں نشاندہی کی تھی کہ دکن میں واویلا اپنا آزاد نہ وجود رکھنے والی صنف تھی۔ اسیطرح سوز، ماتم وغیرہ بھی رائج تھے۔ کسی نہ کسی شکل

میں ان سب پر مرثیہ کا بھی اطلاق ہوتا تھا لیکن ۱۷ ویں صدی تک آتے آتے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے ہر ایک کے درمیان خط فاصل کھینچا جا سکتا ہے مثلاً سوز، نزاری اور واویلا کا تعلق قرأت یا ادائیگی سے تھا۔ نزاری اور واویلا میں ان دونوں الفاظ کی تاکید ناگزیر حیثیت رکھتی تھی

اسطرح ابتدائی عہد میں سلام اور مرثیے کے درمیان خط فاصل کھینچنا بہت دشوار تھا۔ ڈاکٹر رشید موسوی اور مسیح الزماں صاحب نے نوسرہار کو مثنوی لکھدیا اور اس پر غور نہیں کیا کہ مثنوی ہیئت کا نام ہے اور یہ کہ مرثیہ مثنوی میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔

اس خلط مبحث سے بچنے کے لئے دا قسمتہ الحروف اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ تمام رثائی نظمیں جن میں لفظ سلام، سلامی، مجرا، مجری ہے اس پر سلام کا اطلاق ہوگا اور اگر اشعار مسلسل بھی ہیں اور باہمی ربط بھی رکھتے ہیں تو بھی انہیں سلام سمجھا جائیگا۔ لیکن سلام کی شناخت اور مرثیے سے اسے ممیز کرنے کے لئے یہی ایک پہلو ہے کہ سلام میں ہر شعر اپنا آزادانہ وجود رکھتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے شبلی کو تسامح ہوا اور انہوں نے سلام کو غزل کی ایک اخلاقی اور رثائی شاخ قرار دیا۔

یہ اصول کہ اگر مجری، سلامی، سلام، مجرا کے الفاظ کسی رثائی نظم میں ہیں اگر وہ مربوط ہیں تو اسے بھی سلام سمجھا جائے۔ صرف اٹھارویں صدی کی تصنیف تک کے لئے ہے اسلئے کہ اسکے بعد سلام کی صنف کی روایت مرثیے سے بالکل اسی طرح الگ ہوگئی جس طرح اندھیرے میں خط ابیض عیاں ہو کر رات اور صبح صادق کے درمیان خط فاصل

کھینچ دیتا ہے۔

یہ قاعدہ مرتب کرتے وقت راقمۃ الحروف کے ذہن میں عرب کے شعراء کا وہ بنیادی اصول تھا کہ شاعر کا قصد و ارادہ کیا ہے؟ سلامی، بحرا، بحری کلیجے سے شاعر کا قصد معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلام لکھنا چاہتا ہے جس کے بعد ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے سلام نہ تصور کریں۔ اگر وہ سلام کے معیار پر پورا نہ اترتا تو وہ بات اور ہے جس پر بحث کر سکتے ہیں اور اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ وضاحتیں ضمنی طور پر اس لئے ناگزیر تھیں کہ نظامی، محمد قلی قطب شاہ اور وجہی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے تحقیقات کی زمرہ بندی کی جا سکے اور تحقیق کے معیار پر انہیں پرکھ کر یا رد کیا جائے یا قبول کیا جائے۔ بہر حال اس منزل سے گزرتے ہوئے اس عہد کا اہم ترین شاعر وجہی قرار پاتا ہے۔

اردو شاعری کا نقطۂ آغاز اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ سے کیا جاتا ہے لیکن مثنوی محمد قلی سے پہلے فخر دین نظامی کے یہاں ملتی ہے اور مرثیہ شاہ اشرف بیابانی کے ہاں۔ عموماً ملا وجہی کو محمد قلی کا معاصر قرار دیا جاتا ہے اس لئے کہ اس نے قطب شاہ کے عہد میں "سب رس" تصنیف کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سا رکشوا کی بناء پر وجہی محمد قلی پر تقدم رکھتا ہے اس لئے اسی کے سلام کو پہلا سلام قرار دیا گیا لیکن واضح اور مستند ثبوت نہ ہونے کی بناء پر محمد قلی کو ہی پہلا اور وجہی کو دوسرا سلام نگار قرار دیا جا رہا ہے۔

وجہی :- محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس عہد کا مشہور شاعر وجہی ہے۔ یہ بحیثیت شاعر اور نثر نگار شہرت رکھتا ہے۔ مثنوی "قطب شتری" اور نثری تصنیف "سب رس" کے علاوہ مراثی بھی لکھے ہیں۔ مندرجہ سلام نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف "دکن میں اردو" میں سلام کے عنوان سے نہیں بلکہ مرثیہ کے عنوان سے ہے لیکن یہ حقیقتاً سلام ہے انہوں نے یہ سلام مجلہ مکتبہ حیدرآباد سے لیا ہے۔

سہ

حسینؑ کا غم کرو عزیزاں — انجو نین سوں جڑو عزیزاں
جنا جو اول ہے غم کا — عرش لگن ہور دہرت بلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا ابھی — گریہ حسینؑ پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجواں سوں پکڑے — یو غم حسینؑ کا جنم دھلایا
دلاں میں دو گلی چہوں نے چٹکیاں — تو غم نے
یو کیا بلا تھا تو کیا جفا تھا — مگر قضا تھا سو حق دکھایا
عجب دلاں کوں اجل کا ساقی — پیالے غم کے سو بھر پلایا
یوں کیا اندیشہ اندیش کتیا — فلک شباں پر ستم خدایا
حسینؑ یاراں درود بھیجو — کہ دیں کا یو دیو اجلایا
تمہارے وجہی کوں یا اماماں — نہیں تمن بن یو رس کو سایا [1]

اس سلام کا پہلا شعر جو دوسرے اشعار سے مختلف القافیہ ہے اسکے تعلق سے چراغ علی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" وجہی کے دو مرثیوں

---

[1] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۷۲، ۲۷۳ بحوالہ بیاض مولانا صفی الدین مرحوم

کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"وجہی کے دونوں مرثیے زبان و بیان، فکر و فن
اور آہنگ شعر کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں پہلا
مرثیہ جو کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا ہے
غزل کی ہیئت میں ہے لیکن پہلے ایک مختلف القافیہ
بیت لکھنے کے بعد اس مطلع کے غزل کی ہیئت کو برتا ہے" ۱؎

وہ مندرجہ بالا سلام کے ابتدائی دو اشعار بطور نمونہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"دکن کے مرثیہ نگار شعراء ہیئت میں کبھی کبھی
اس طرح کی جدت کرتے ہیں" ۲؎

راقمۃ الحروف کا خیال ہے کہ ابتداء میں سلام کا جو نقش اول تیار ہوتا ہے
اسمیں یہی انداز اختیار کیا جاتا رہا ہوگا کہ پہلا شعر بطور "صدا" کہا جاتا رہا ہوگا اور بعد کے
اشعار غزل کی ہیئت میں کہے جاتے رہے ہونگے چونکہ مندرجہ بالا سلام کے سارے اشعار
اپنا آزاد وجود رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے سلام شمار کیا گیا ہے۔

قطب شاہی دور کے مرثیہ نگار شعراء کا جائزہ تفصیلی لیا جائے تو ملا احمد کا نام
بھی ان ہی شعراء کی فہرست میں نظر آئیگا۔ وہ بحیثیت مرثیہ نگار کافی شہرت رکھتا تھا اگرچہ
کہ انکے سلام کو بھی مرثیہ کا عنوان دیا گیا ہے باوجود اسکے یہ سلام ہی ہے

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں احمد سے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ

۱، ۲؎ اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں از ڈاکٹر چراغ علی ص ۱۱۸

احمد بھی اسی دور کا شاعر تھا اسکی پیدائش
اور وفات کے سنین سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اس دور
کا ایک مشہور شاعر ابن نشاطی اسکو استاد سخن کہتا
ہے اور اسکے کلام کا معترف اور مداح ہے" ۱؎

مرزا امیر علی جونپوری بھی احمد کے بارے میں اپنی تصنیف میں یوں رقم طراز ہیں۔

اسم گرامی ملا احمد اور تخلص احمد تھا۔ احمد
قطب شاہی عہد ۱۵۰۸ء تا ۱۶۷۵ء تک کے مشہور شاعر
تھے۔ انہیں قطب شاہی دربار کی سرپرستی حاصل تھی
شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس
عہد کے اچھے مرثیہ نگاروں میں انکا شمار تھا" ۲؎

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اپنی تصنیف میں ملا احمد سے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ملا احمد بھی وجہی کا ہم عصر تھا اب تک
اسکی دو کتابیں قصۂ لیلیٰ مجنوں ۱۶۰۰ء اور احوال
مصیبت اہلبیت دستیاب ہو چکی ہیں اس نے
۱۶۵۰ء سے قبل وفات پائی ہے۔ ۳؎

ملا احمد نے سلام بھی لکھے ہیں جنھیں مرثیے سے خلط مبحث کر دیا گیا مرزا امیر علی جونپوری

۱؎ ۱۱۶
۲؎ ۸۲
۳؎ دکنی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۵۲

نے اپنی تصنیف میں جو نمونا دیا ہے وہ درج ذیل ہے۔

ے
حیف گھائل حسینؑ تن تیرا — جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہو کہاں ہے تن تیرا — کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا
ع ۱

ے
نہیں ملیا بوند کس کیتس پانی — سخت طفلاں کہ سر یو حیرانی
حیف اصغرؑ نے تجھ کوں رومانی — جگ سوں پیاسا گیا ہے تن تیرا

مندرجہ مرثیہ کا نمونہ اسلئے پیش کیا گیا ہے کہ ساتھ ہی "سلام" کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں اصناف کی زبان ایکدوسرے کے مماثل یہی معلوم ہوتی ہے۔ سلام کا جو نمونہ پیش کیا جا رہا ہے وہ مرثیہ ہی کے عنوان ہی سے ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل سلام بیاض مراثی مختلف شعراء نمبر ع ۱۳۸ جسکی کتابت سنہ ۱۱۴۰ھ میں ہوئی ہے دستیاب ہوتا ہے۔

ے
السلام اے شہسواراں السلام اے شہسواراں — کھتی ملک قطاراں السلام اے شہسواراں
ہو حکم یو خدا سوں پایا ہوں مصطفےٰ سوں — کھیتا ہوں دل صفا سوں السلام اے شہسواراں
پیاری او دو خدا کی دو نین مصطفےٰ کے — ہیں نور دوسرا کی السلام اے شہسواراں
فلفل کی مطلیاں دو لخر جسکی جوہراں دو — یطعم کے سروراں دو السلام اے شہسواراں
دونوں کا سنکہ ماتم دو جہاں ہے برہم — دن رات روئیں شبنم السلام اے شہسواراں
دونوں اپرتی قرباں احمد کرے دل و جاں — ہادی رسے سوں ایماں السلام اے شہسواراں ۲

ے ۱ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — مرزا امیر علی جونپوری ص ۸۲
ے ۲ بیاض مراثی ع ۱۳۸ کتب خانہ سالار جنگ

اسی بیاض میں احمد کا ایک اور سلام دستیاب ہوتا ہے۔

صلوات بر محمدؐ صلوات بر محمدؐ — بر پاک آلِ امجد صلوات بر محمدؐ

ہر دم حسینؑ اوپر تجھ پر سلام رحماں — کہتی ہیں غم محباں تجھ پر سلام رحماں

اے والی ولایت اے مظہر کرامت — اے مقصدِ امامت تجھ پر سلام رحماں

اے معنی شریعت اے ہادی طریقت — اے معنی حقیقت تجھ پر سلام رحماں

اے صاحبِ شہادت اے مظہرِ سخاوت — اے معدنِ شجاعت تجھ پر سلام رحماں

تیری صفت میں حصوں قرآں ہوا ہے وارد — لکھتا سدا عطارد تجھ پر سلام رحماں

یاقوت علیؑ کا کھنکا موتی نبیؐ کے من کا — جیو فاطمہؑ کے تنکا تجھ پر سلام رحماں

جو تھا تیرا یو قصد اس سوں کیا ہے مقصود — آدم کو جگ میں معبود تجھ پر سلام رحماں

تو ہا نور ہے نبیؐ کا بہار خلف علیؑ کا — بھائی حسنؑ ولی کا تجھ پر سلام رحماں

ہے ساقی توں کوثر ہے شافی نول محشر — جو ہے تیرا پیمبرؐ تجھ پر سلام رحماں

تیری سنی کی لھو لے موتی مدح کے رولی — احمد سدا یو بولے تجھ پر سلام رحماں [1]

قطب شاہی دور کا دوسرا مشہور شاعر غواصی ہے

غواصی: — دکنی مرثیہ نگار شعراء میں غواصی کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مراثی کے علاوہ غواصی کی تین مثنویاں "صیف الملوک و بدیع الجمال" "طوطی نامہ" اور "مینا ستوشی" ملتی ہیں علاوہ ازیں غواصی نے صنفِ غزل پر بھی طبع آزمائی ہے۔

---

[1] بیاض مراثی ص ۱۳۸ کتب خانہ سالار جنگ

سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں اسکی شہرت عام ہوئی اور سلطان عبداللہ کے عہد میں اسکو شاہی تقرب حاصل ہوا۔ مثنوی مینا ستوشی میں ہمیں سلام کے اشعار ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنویوں میں بھی منقبت کیساتھ ہی سلام ادا کرنیکا دستور تھا۔

غواصی یو کرتا کرم کی نظر — دعا حق سوں منگتا سرے حق اوپر
بڑے ناموارو ں میں ہوں کم نام — کیا ہو یہہ نادانگی سوں تمام
کرم کی نظر رکھ کم و بیش سوں — کرو پرورش اس دل و جاں سوں
ہزاراں درود اور ہزاراں سلام — بحق محمدؐ علیہ السلام ع ۱

غواصی کے مراثی ہمیں "دکن میں اردو" "اردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" "اردو مرثیہ اور تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" کے علاوہ مخطوطات میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر مصنف نے صرف اسکی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے۔ سلام گوئی کا تذکرہ کسی کے ہاں نہیں ملتا اور مندرجہ سلام کو ہر مصنف نے مرثیہ ہی بتایا ہے اور مخطوطات میں بھی یہہ مرثیہ کے عنوان ہی سے ملتا ہے

اگرچہ کہ بہ اعتبار ردیف اس دور کے اعتبار سے اسپر مرثیہ کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن یہہ سلام ہے کیونکہ اسکا ہر شعر معنوی اعتبار سے جداگانہ ہے مربوط نہیں زبان نسبتاً صاف نظر آتی ہے۔

؎ دستا نہیں کروں کیا وہ بیان کربلا کا — پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا

Indira Gandhi Memorial Library
University of Hyd-134
101637

آسماں تے خدایا جبریل اوتر کو آیا — روتا اوپر تے لایا فرمان کربلا کا
گھر ماندھ کربلا میں کر شکر ہر بلا میں — کیوں ہے کہ کربلا میں سلطان کربلا کا
ہے آکھ بڑا تو سب نے نین کسی قرابت سے — پکڑیا حسینؑ جب سے میدان کربلا کا
چندا سک سوں سوتا اس کا سول عمر کھوتا — تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سور جوتی دنیا کھڑی ہے روتی — کاں تے ہوا یو کوفی میہمان کربلا کا
منجہ سک نہیں ہے دکھ بن ہوں میں ندہال جھن — لا گیا ہے رات ہور دن منجہ دھیان کربلا کا

غواصیا معطر عالم کوں سب کیا ہے
گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا [1]

مندرجہ بالا سلام مخطوطات میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی بھی اسی سلام کو مرثیہ کے عنوان سے اپنی تصنیف میں بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف میں مرثیہ نگاری کے باب میں اور شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ:-

"سلطان محمد قلی کی طرح اسکا نواسہ سلطان
عبداللہ نے بھی مرثیے، سلام، نوحے تصنیف کئے ہیں" [2]

نصیر الدین ہاشمی نے عبداللہ قطب شاہ کی سلام گوئی کا تذکرہ کیا ہے لیکن سلام پیش نہیں کئے اور نہ ہی برا قسمتہ الحروف کو اسکے سلام دستیاب ہوئے۔

قطب شاہی دور کی مرثیہ نگاری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں بادشاہ

---

[1]
[2] دکن میں اردو — از نصیر الدین ہاشمی — ص ۱۷۶

اور غلام دونوں بھی نظر آئیں گے جنھوں نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ بالکل اسی طرح ملک خوشنود کا نام بھی ہمیں دبستانِ بیجاپور میں نظر آتا ہے۔

ملک خوشنود :— یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا غلام تھا جو جہیز میں شہزادی خدیجہ کے ساتھ بیجاپور بھیجا گیا تھا، جہاں پر اسنے ترقی کی منزلیں طے کیں اور بحیثیت شاعر مشہور ہوا اور یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ ۱۶۳۵ء میں پھر سفیر بنا کر بیجاپور بھیجا گیا۔ گولکنڈہ سے جب روانہ ہوا تھا تو غلام تھا اور جب آیا تو نہ صرف سفیر بلکہ نامور شاعر کی حیثیت سے آیا۔ ملک خوشنود کا مندرجہ سلام نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف میں ہمیں مرثیہ کے عنوان سے ملتا ہے۔

ماتم محرم کا انپر پھر جگ نے آیا عجب — دھرتی گگن پاتال میں پھر آگ سلگایا عجب
ٹوٹیا قلم، ترقی زبان، کیونکر لکھوں غم کے بیاں — تم ہو رہے سات آسمان غم کا بدل چھایا عجب
مارے ہیں شہؑ تجکر بلا سو سے ہیں دکھ لک لک بلا — مرتا ہے عالم تلملا گھر گھر سو دکھ ڈھایا عجب
جل جا سورج کا رہوا تن جہیج کر جالا ہوا — گل گل چندر گالا ہوا مکھ پر کلنگ لایا عجب
روتے ملک جن ہور پری شہؑ پر بلا کیونکر کھڑی — ٹکڑے ہوئی سب دھرتری ہے سور کا مایا عجب
ساری محب زاری کرو سمدور نیناں سوں بھرو — باطن سنیاسی ہو پھرو ماتم خبر لیایا عجب
شہؑ کا بندہ خوشنود ہے دیکھت چرن مقصود ہے — شاہد سرا معبود ہے جن جگ میں پنجایا عجب [1]

دکنی دور کے مرثیہ نگار شعراء میں شاہ راجو کا نام بھی ہمیں ملتا ہے۔

شاہ راجو کا نام اسلئے اہمیت کا حامل ہے کہ انکا سلسلہ صوفی بزرگ سید محمد حسینی گیسو دراز سے ملتا ہے۔

---

[1]

اردو نثر کے آغاز و ارتقاء میں صوفیائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے لیکن یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ شاہ راجو جنکا سلسلہ ایک صوفی بزرگ سے ملتا ہے نے اردو نظم نگاری میں صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے

شاہ راجو: ۔ شاہ راجو سلطنت قطب شاہی کے آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد تھے۔ انکے مراثی بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار کا شمار اسی لئے سلام میں ہوگا کہ اس کے اشعار باہمی ربط میں کم ہیں اگرچہ کہ یہ مرثیہ کے عنوان سے ملتے ہیں۔

سہ حسینا کے ماتم سوں آلِ حرم پر ۔۔۔ ہوا ہے قیامت سو یارب سراسر
حیدر حیدر دھوئیں تھا علی کے ہرج کا ۔۔۔ نبی کے درج کا سو اولعل و گوہر
شفاعت دے منج شاہ اپنی لقاء کا ۔۔۔ ہمیشہ لگا منج ترا عشق اکبر
رحم شاہ راجو حسینی پہ اپنا ۔۔۔ تری جھالوں میں رکھو تم شاہ اکبر [1]

عادل شاہی دور کے مرثیہ نگار شعراء کی فہرست میں علی عادل شاہ کا نام بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ عادل شاہی دور کا دوسرا علی عادل شاہ ہے۔

علی عادل شاہ شاہی ثانی: ۔ دکن میں شاہی تخلص کرنے والے بھی دو شاعر گذرے ہیں۔ بالکل مرزا ہی طرح ایک کا تعلق بیجاپور سے ہے تو دوسرے کا تعلق گولکنڈہ گول کنڈہ سے ہے۔

---

[1] اردو مرثیہ از سفارش حسین رضوی صہ ۴۹

گولکنڈہ سے تعلق رکھنے والے شاعر شاہ قلی خاں شاہی ہے جبکہ بیجاپور سے
تعلق رکھنے والا عادل شاہی سلسلہ کا ساتواں حکمران ہے اور دوسرا عادل شاہ (۳۵)
مناسبت سے علی عادل شاہ ثانی کہلاتا ہے۔ اسکا دور حکومت ۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۳ء
ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسیر اغ علی لکھتے ہیں:۔

"یہ عادل شاہی سلاطین میں پہلا بادشاہ ہے
جسنے دکنی زبان میں مرثیے کہے" [1]

علی عادل شاہ نے تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ راگ راگنیوں
پر مشتمل کتاب "نورس" کا بھی یہ مصنف ہے چنانچہ وہ اپنی ہر صنف کیلئے جن راگ مرثیے
کے لئے بھی راگنی کی وضاحت کرتا ہے۔ مذکورہ سلسلہ "عادل شاہی مرثیے" مرتبہ
میر سعادت علی رضوی سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ مرثیے کے مندرجات سے ہمیں ملتا ہے
کہ یہ مرثیے اشعار پر مشتمل ہوتے تھے لیکن دستیاب مرثیے مسدس ہیئت میں ہیں اس لئے مسدس شمار کیا جانا چاہیئے۔ [2]

دیکھیو ہم کا چاند سکھ کوں دیا دو تمام — دل کوں کر داغ داغ شاہ ولد ابراہیم
ابن رسول خدا تس کے فرا قوں ہر دل — آن کے بھرے الجھوسین کا کرنا ہے جام
ذرت مبارک کے تئیں کہتے ہیں ناحق شہید — دیکھو ستمگار لوگ اس کوں سمجھ خوب کام
ساری یو امت کے تئیں حکم نبی کا اتھا — سنیہ کوں اپنے تمیں تن سوں دیکھو ہمدام
کیا یو منافق یزید کہتا ہر ائی سے کل — دیسے نا مان کر دیسے نبی کا کلام
اسکی عداوت سبب اوشہ خورشید رو — گلشن فردوس میں کہتا ہے اپنا مقام
شاہ شہیداں حسین وصف تمہارا جو باں — شاہی کرے ورد یو عشق نے ہر صبح و شام [3]

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور و گولکنڈہ میں۔ ڈاکٹر محمد حسیر اغ علی ص ۵۴
[2] عادل شاہی مرثیے مرتبہ [illegible] ص ۱۱۲

اسکی راگنی کی وضاحت وہ اسطرح کرتا ہے

جے جے ونتی - دیپک راگ (بھارجا) جو رات کے پچھلے پچھلے پہر گاتے ہیں -

دوسرا سلام بھی ہمیں مرثیے کے عنوان سے ملتا ہے لیکن اشعار میں باہمی ربط نہ ہونے کی وجہ سے یہ سلام ہی قرار پائے گا -

؎ آیا چندر یو جگ منے سکھ جب جدا ہوا — یو شور شر عشور کا گھر گھر ندا ہوا
فرزند مرتضیٰ کے ہوئے ہیں شہید جب — تب تے اساس گھٹ منے پھر ابتدا ہوا
جب تے لوگ ظلم سنے کربلا منے — ہر اک پہ دکھ امام کا لازم سدا ہوا
جو خاک و خوں میں تن دسیا شاہ شہید کا — غم نے حسین شاہ کے کئی لک گدا ہوا
جاری ہوا ہے خون شہیداں کے تن تے یوں — چھانی گئی دھرت لگت سو ردا ہوا
ارواح انبیاء جتے غمگین ہوئے ہیں سب — جب تے حسین شاہ نے جگ سول بدا ہوا
جب تے ملک فلک پہ گئے اس کھتر کوں دیکھ — شہدا کے صف میں شاہ سدا مقتدا ہوا
جب تے ہوا ہے عشق کوں کونین میں ظہور
قبس روز سے حسین پہ شاہی فدا ہوا [1]

لیکن اسکی راگنی کی وضاحت نہیں کی گئی ہے

تاریخ مرثیہ نگاران دکن کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں مرزا نامی دو شاعر ملیں گے جن میں ایک گولکنڈہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا بیجاپور سے جسکا کلام بہ نسبت گولکنڈہ والے مرزا کے زیادہ ہے

---

[1] عادل شاہی مرثیے مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۱۱۴

مرزا بیجاپوری: — مرزا بیجاپوری عادل شاہی دور کا مشہور مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس نے اپنے سوز و گداز سے بھرپور مرثیوں کی صنف پر طبع آزمائی کی۔ اس کی حتیٰ کہ زندگی کے آخری سال تک مرثیہ ہی کہتا رہا۔

ایک خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ مرزا رفیع سودا اور شجاعت بیجاپوری ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے بلکہ ایک ہی مرزا تھا۔ لیکن مرثیہ نگاری پر مشتمل تمام تصانیف میں مرزا گولکنڈوی اور مرزا بیجاپوری دو شاعر ملتے ہیں اور ہر ایک کے حالات جدا جدا ہیں جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ مرزا گولکنڈوی قطب شاہی دور کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قطب شاہی دور کا خاتمہ ۱۰۸۳ھ میں ہوا جبکہ مرزا بیجاپوری سے متعلق ڈاکٹر محمد حسین اعراب علی اپنی تصنیف "اردو مرثیے کا ارتقاء" بیجاپور اور گولکنڈہ میں، میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے اردو مرثیہ کے بارے میں مرزا کے متعلق یہ دو شاعروں کا ذکر کیا ہے جس میں سے ایک بیجاپور کا مشہور مرثیہ گو مرزا ہے جو ۱۰۸۳ھ سے قبل متوفی ہو چکا تھا۔"[1]

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "عادل شاہی دور کے مرثیہ نگاروں سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ [illegible]

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں از ڈاکٹر اعراب علی بحوالہ اردو [illegible] کے بارے میں صفحہ ۷۷

متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اس دور کا مشہور مرثیہ نگار شاعر مرزا ہے
جسنے سواء مرثیہ کے اور کوئی صنف سخن پر خیال
آفرینی نہیں کی حتیٰ کہ بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے
کی خواہش کی تو اسنے انکار کر دیا جب زیادہ
اصرار کیا گیا تو اسنے ایک مرثیہ میں نام کے بجائے
بادشاہ کا نام لکھدیا۔" ۱؎ (کذا)

مرزا کے مرثیے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی دو دو سو شعر کا مرثیہ بھی ہے یہ مرثیے مسدس بھی ہیں اور غزل نما بھی۔ مرزا کے نوحے اور سلام بھی ملتے ہیں۔ ۲؎

مرزا بیجاپوری کے سلام ہمیں مخطوطات کے علاوہ میر سعادت علی رضوی کی مرتبہ تصنیف "عادل شاہی مرثیے" میں ملتے ہیں۔

؎

اے حسینؑ علی سلام علیک — شاہ جملہ ولی سلام علیک
اے شہ کربلا سلام علیک — افضل اولیاء سلام علیک
توں ہے برحق امام دو جگ کا — اے شہ رہنما سلام علیک
جد ہے تیرا محمدؐ مرسل — سرور انبیاء سلام علیک
فاطمہؑ ہور علیؑ کے دریا کا — توں دُرِ بے بہا سلام علیک

۱، ۲؎ دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۸۷ ص ۲۸۸ بحوالہ بساطین السلاطین ص ۷۷، ۳۳

سرور دیں حسنؑ کا تو بازو — اے دو جگ پیشوا سلام علیک
جیوں دیا رب تجھے شرف عالی — یوں کہے نہیں دیا سلام علیک
ہے تیرے نالوں پر جہنم مرزا — جان و دل سوں فدا سلام علیک [1]

حسینؑ علیؑ پر ہزاروں سلام — دو جگ کے ولی پر ہزاروں سلام
توی شاہ سرور سلامٌ علیک — دو عالم کے رہبر سلامٌ علیک
تیرے ہور تیرے حد کا بڑھنے صفت — ہوا عرش ممبر سلامٌ علیک
تیرے وصف کا سورۂ ھل اتیٰ — پڑیا خطبہ داور سلامٌ علیک
تیرا وصف لکھے کوں لوح و قلم — رہے ہیں مقصر سلامٌ علیک
تجھے شاہ تخت شہادت کیا — او جبار اکبر سلامٌ علیک
ازادیں تیرے قدر کی سر چتور — سو جبریل شہپر سلامٌ علیک
نہیں نور چشم رسول خدا — توں سلطان محشر سلامٌ علیک
نہیں رہنما شاہ کونین ہے — حسینؑ ابن حیدرؑ سلامٌ علیک
آپس کے گلے سوں کہئے جدا — تجھے نت پیمبرؑ سلامٌ علیک
تیری خاک درگہہ تے پایا ہے سر — تو یوں ہے منور سلامٌ علیک
تیری گرد نعلین کا یا امام — دو جگ کوں ہے افسر سلامٌ علیک

---

[1] عادل شاہی مرثیے — مرتبہ سعادت علی رضوی

تیرا مدح مرزا کے ایمان کا ہو زیب و زیور سلام علیک [1]

مرزا نے بھی وجہی کیطرح سے پہلا شعر بطور سدا - دوسرا قافیہ میں لکھا اور بقیہ اشعار ایک ہی ردیف میں لکھے اسکے علاوہ ایک اور سلام اسطرح ملتا ہے -

؎ السلام اے شاہِ سرور السلام اے شاہِ سرور

ہر دم اس روح صفا پر السلام اے شاہِ سرور

بخت مرزا کوں جو ہوئے تو جنم اس غم سوں روئے

اس درد میں جان کھوئے السلام اے شاہِ سرور - [2]

دکنی مرثیہ نگاروں کی فہرست میں ہاشمی بیجاپوری کا نام بھی ملتا ہے یہ عادل شاہی دور کا شاعر تھا -

ہاشمی بیجاپوری :- سید میراں نام ہاشمی تخلص کرتا تھا - علی عادل شاہ ثانی شاہی کے عہد سے تعلق رکھتا تھا - یہ نابینا ہونے کے باوجود دکنی دور کے مشہور شعراء میں اپنا مقام رکھتا تھا - اسکا سن وفات ڈاکٹر حفیظ قتیل مرتب کلیات ہاشمی نے سنہ ۱۱۰۹ھ بتایا ہے - ہاشمی کا نام ریختی گوئی میں بھی اہمیت رکھتا ہے

"عادل شاہی مرثیے" مرتبہ میر سعادت علی رضوی"

میں ہاشمی بیجاپوری کا ایک مرثیہ ملتا ہے جو کہ سلام ہے -

---

[1] عادل شاہی مرثیے مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۳

[2] عادل شاہی مرثیے مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۲

ماہ محرم کا جو گھر سب دھر تری کلوس لہری — رو رہے ہیں شہؑ کے غم میں مے جن و شجر حور و پری

تارے نہیں آسماں پر ماتم میں شہؑ کے سوزشوں — گویا زہرہ جبر خ پر توڑی گلے کی گلسری

آسماں نیلا حریر ان پہنا ہے اس ماتم میں — خورشید غم نایاب کیا لیا لباس زرنری

عارضی لی شہؑ کے غم ستی چھاتی میں لہوئیں کے لہو جھلا — یاروں غلط کہتے ہیں یو لعل بدخشاں جوہری

تیراں ہیں آہ کے سر لہرا فلک کے سینے اندر — آتے ہیں پیکاناں نظر میں شمس زہرہ مشتری

ابر بہاری ہوں جیں فیر و زرگ ہیں دشتاں — شہؑ کے دکھوں درد لیں ہو خلعت لیا ہے سب میری

سب عیش و عشرت کے شجر درہم درہم ہوئے یک دمیں — اس درد ہور غم کی سونگ یلبار یا صرصری

سن ہاشمی یو مرثیہ میر سوز گائے تے عجب — انگشت حیرت مکھ مینے لیوے ایس کے انوری

دستبانِ گوکنڈہ اور بیجاپور میں ہمیں کئی شعرا ملیں گے جنھوں نے صنف مرثیہ میں طبع آزمائی کی ہے اور ایسے شعرا کی بھی کمی نہیں جنھوں نے بحیثیت مرثیہ گو شہرت حاصل کی لیکن شاعر ایسے بھی ملتے ہیں جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو مرثیہ گوئی کے لیے وقف کر دیا۔

لطیف کا شمار بھی اس دور کے بلند پایہ مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے

لطیف:۔ لطیف قطب شاہی دور کا شاعر تھا۔ نام غلام علیخاں تھا اور لطیف تخلص۔ سرزا امیر علی جرنپوری اپنی تصنیف "تذکرہ مرثیہ نگاران اردو دکنی" اسکا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

قطب شاہی دور کے آخری سلطان جناب شاہ ابوالحسن تانا شاہ

۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۷ء کے دور حکومت میں اسکو ترقی کرنیکا موقع ملا یہ بھی عبداللہ

شاہ کے درباری شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے شاعری سے ان کو دلی

لگاؤ تھا۔ اس دور کے بلند مرثیہ نگار شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۵۲

---

۵۱ عادل شاہی مرثیے — مرتبہ میر سعادت علی رضوی ص ۱۳۱

۵۲ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — مرزا امیر علی جرنپوری ص ۱۹

ظفرنامہ اسکا اہم کارنامہ ہے

مندرجہ اشعار نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف میں مرثیہ کے عنوان سے ملتے ہیں لیکن یہ سلام ہے۔

اے اہلِ درد اشک سوں انکھیاں کوں تر کرو — نکلیا ہے پھر یوما ہے محرم نظر کرو۔
نازل زمیں پوسرتے ہوا غم حسین کا — ماتم زدیاں کو دتیک طرف سے خبر کرو۔
پہرتن عود سوز میں غم کی انکار آج — حیواں کوں عود ہور دلاں کوں اگر کرو۔
سلطانِ کربلا کی غریبی کوں یاد کر — ٹکڑے جگر کوں اور دلاں کوں خنجر کرو۔
ہے ڈر اگر تمن کوں قیامت کی دھوپ کا — سایہ کوں اہلبیت کے سر کا چھتر کرو۔
جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے — ہور اس ناخوشی تے بات سری سن حذر کرو۔
غواص کے زماں کے اچھے لطیف توں — اے عارفاں ہو یاد تمن بو اچر کرو۔ [1]

طوالت کے سبب سے ۱۵ اشعار چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

علاوہ ازاں ظفرنامہ میں بھی اسکے ہاں غواصی کیطرح سلام کے اشعار ملتے ہیں

ہزاراں درود ہزاراں سلام — بنی ہور ولی پر اچھو مدام [2]

اسی عہد کا ایک شاعر کاظم تخلص کا بھی ملتا ہے۔

کاظم:- نام کاظم علی اور کاظم تخلص کرتا تھا۔ گولکنڈہ کا رہنیوالا تھا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اسکی مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا جس سے متعلق نصیر الدین اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں تحریر کرتے ہیں۔

"کاظم بھی گولکنڈہ کا شاعر تھا صرف مرثیہ گوئی اسکا پیشہ تھا۔" [3]

قبل ازایں مرزا بیجاپوری کی بھی اسی خصوصیت کو پیش کیا گیا تھا کہ اسنے سوائے مرثیہ کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اسطرح دکن میں کم از کم دو شاعر تو ایسے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو

---

[1] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۷۸ بحوالہ بیاض کتب خانہ حضرت مولوی صفی الدین مرحوم
[2] ظفرنامہ از غلام علی خاں لطیف ص
[3] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۷۸

مرثیہ گوئی کے لئے وقف کر دیا

کاظم کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رثائیت کیساتھ ادبیت بھی پائی جاتی ہے تاریخ مرثیہ نگاری کا ہر مصنف کاظم کے کلام کی ادبیت کا ذکر کرتا ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرثیہ ارتقاء پذیر تھا اور یہی بات سلام کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔

اب تک جن جن شاعروں کے سلام کے نمونوں کو پیش کیا گیا وہ تمام کے تمام غزل کی ہیئت میں تھے لیکن کاظم نے شعری اجتہاد کیا اور سلام قطعہ بند یا مربع میں پیش کئے اگرچہ کہ اسکو بھی مرثیہ کا عنوان دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سلام ہیں کیونکہ اسکا ہر بند دوسرے بند سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے مرثیہ اسی صورت میں قرار پاتا جبکہ اسکے بند ایک دوسرے سے مربوط ہوتے اسطرح سلام کی روایت میں ایک نیا پہلو ہمیں ملتا ہے۔

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علیؑ ولی — بے تاج سرداراں کی خبر لو علیؑ ولی
نیزاں اوپر سروں کی خبر لو علیؑ ولی — ظلم و ستمگراں کی خبر لو علیؑ ولی
آرام دل شکستہ بے تاب کوں نہیں — انکھیاں میں اسکے راہ دیکھو خواب کوں نہیں
تمہیں اتنا یو درد کے اسباب کوں نہیں — غم ہائے بیکراں کی خبر لو علیؑ ولی
جن کو سلاتے گود میں رکھتے تھے دوش پر — دریائے خوں سر سوں چلا اونکے جوش پر
کیا صبر کر رہے ہیں وہ لب کوں خموش کر — اوس ناز پروراں کی خبر لو علیؑ ولی
ہے سر پہ اون کے تیغ کوہستاں کے روش — دل خوں ہوا ہے غم سو بدخشاں کے روش
ہر سے انجھو نین ستیں نیلاں کے روش — اس پاک جوہراں کی خبر لو علیؑ ولی
گلزار احمدیؐ پہ چلی صرصر خزاں — کانٹو نہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بیدل صنوبراں کی خبر لو علیؑ ولی

دریائے خوں میں غرق محباں ہیں شاہ کے — تا آسماں بگولے اڑاتے ہیں آہ کے
آتش لگے ہے خرمن ہستی میں ماہ کے — اس خاک بستراں کی خبر لو علیؑ ولی
دنیا منے ہے بسکہ محباں اوپر ستم — طاقت نہیں ہے انکا بیاں سب لکھے قلم
فضل و کرم سیں اپنے لو سن ماجرائے غم — کاظم سے مضطراں کی خبر لو علیؑ ولی[1]

کاظم کے علاوہ دبستانِ بیجاپور کے مرثیہ نگاروں میں سیوا بیجاپوری کا نام تو ملتا ہے لیکن نہ ہی ان کے سلام گوئی کا تذکرہ ملتا ہے اور نہ ہی سلام ملتے ہیں لیکن دبستانِ گولکنڈہ کی تاریخ میں شاہ قلی خاں شاہی کے مراثی دستیاب ہوتے ہیں :—

شاہی :— یہ شاہی تخلص والا دوسرا شاہی ہے۔ گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کا نہ صرف ہم عصر تھا بلکہ اسکا مصاحب تھا اور اس نے مخمس اور مربع کی ہیئت میں واقعات کربلا پیش کئے۔ لیکن ان میں نہ باہمی ربط ہے اور نہ تسلسل اسلئے انہیں سلام ہی کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

؎ جب تے دہریا امام جبرن کربلا منے — تب تے ہوا ہے غم کوں رہن کربلا منے
افسوس صد ہزار سرو حسین کا — ہو کر رہیا ہے سرخ بدن کربلا منے
جس روز سے او سور چلیا جگ کوں کر وداع — اس روز تے سوز و بن کربلا منے

---

[1] اردو مرثیہ۔ مصنف سفارش حسین رضوی ص ۶۴، ۶۵

ہو لالہ زار سر لیو سارے شہید کے — دستے ہوں لبوں سوں لال چمن کربلا منے
نبہ کا دیپک لگا کر جو شاہی نے دھونڈ کر — پایا ہے بے بہا یو رتن کربلا منے[1]

دبستان گولکنڈہ کے شاعروں میں نوری کا بھی شمار ہوتا ہے جیسے اپنی مرثیہ گوئی پر میر ضمیر کی طرح ناز تھا۔

نوری:- سید شجاع الدین نوری گجرات کے رہنے والے تھے۔ ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گولکنڈہ آئے اور یہیں مقیم ہو گئے مرثیہ نگاری میں نہ صرف شہرت رکھتے تھے بلکہ اپنے مراثی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا — ولے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا — دہم تک کا احوال پورا لکھا
میں جب اس کوں لوگوں کے آگے پڑھا — عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ واہ — کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا — کبھی اس سے پہلے سنانے پڑھا
اماماں سے اسکا ملے گا صلہ — کہ ہے نوری ہی موجد اس طرز کا

مرثیہ کا کوئی نمونہ کسی نے بھی پیش نہیں کیا خود ان کے اس طرح دعوے کے مطابق مرثیہ بلند پایہ ہونا چاہیے۔ اگر بلند پایہ نہ بھی ہو تو اسلئے اہمیت کا حامل ہوگا کہ

---

[1] دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی — ص ۲۸۲

ان سے قبل کسی شاعر نے بھی شہادت کے بعد کے واقعات اتنے تفصیلی نہیں لکھے یہ ان کی ایجاد ہے۔

جب مرثیے میں انہوں نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے تو مرثیے سے قبل عقیدتاً سلام بھی ضرور لکھے ہونگے لیکن دستیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ مرثیہ نگاری پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کا دور بھی علم و ادب بالخصوص مرثیہ نگاری کے لئے سنہرا دور تھا چنانچہ افضل نامی مرثیہ گو شاعر بھی اسی دور سے تعلق رکھتا تھا۔ مثنوی محی الدین نامہ ۱۰۹۵ء بھی اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ مرثیے 2 ہی ملجاتے ہیں جن میں سے ایک سلام ہے جسکے اشعار "اردو کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" دستیاب ہوتے ہیں۔

؎ اسی دن دیس میں ماتم قیامت ہوئیگی قائم ۔ مگر بخشاوے مجرم چندر آیا محرم کا
ہوا یونس پو مشکل جاں ہوا ہے نوح پر طوفاں مگر کس دیکھئے خوباں چندر آیا محرم کا
شہیدی تخت چڑھنے پر کئے جب مقدر حسین سرور مبارکباد کوں اکثر چندر آیا محرم کا
حسین سرتاج میں سب کے دئیے سر باٹ کے رب کے تصدق ماؤں اس چھب کے چندر آیا محرم کا
کئے ہیں ظلم او ظالم کرو ماتم جگت سالم پڑو قرآن سب عالم چندر آیا محرم کا
کرو خیرات دو نوبت کیسے یہ راز بولو مت مگر کس دیکھنے ہمت چندر آیا محرم کا[1]

مرثیہ نگاران بیجاپور میں شغلی بیجاپوری کا نام بھی ملتا ہے جسکا ایک سلام جسے سفارش حسین رضوی نے اردو مرثیہ میں بعنوان مرثیہ شامل کیا ہے

؎ جب گنج مخفی توں اتہا تب تخم تھارے یا حسینؑ اب او تخم سوں توں شجر دیسارے یا حسینؑ

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں ڈاکٹر محمد چراغ علی ص ۱۴۴، ۱۴۵

جگ سوں طریقہ تج نوا بولن مجھے لازم ہوا — روشن ہوا منجہ دل دیوا تیری عطا رے یا حسینؑ

توں ذات سلطان منیر دا ماندگاں کو دستگیر — جیوں منجہ کیا روشن ضمیر تیوں میں پکاروں یا حسینؑ

یا کوئی منجہ کافر کہو یا منجہ پو کوئی شاکر رہو — تجھ غم شغل میں ہو محو شغلی ہوا رے یا حسینؑ

علاوہ ازیں شغلی کی مثنوی "پند نامہ" میں بھی ہمیں سلام کے اشعار ملتے ہیں۔ [1]

بیجاپور کے مرثیہ نگار شعراء میں ہمیں حسینی کا نام بھی ملتا ہے۔

حسینی: — عادل شاہی باکمال (دور کے) شاعروں میں حسینی کا شمار ہوتا ہے یہ ایک صاحب دیوان شاعر تھا۔ جسنے اپنے مراثی کے مجموعے کو ردیف وار ترتیب دیکر اسکا نام "دیوان حسینی" رکھا جو مؤلف "تذکرہ نگاران اردو" کے کہنے کے مطابق ۲۳۸ مراثی و سلام پر مشتمل ہے۔ یہ مراثی غزل، مربع اور مخمس کی ہیئت میں ہیں۔ یہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ کتب خانۂ آصفیہ میں انہی کا مختصر سا دیوان موجود ہے ساتھ ہی کتب خانۂ سالار جنگ میں بھی "دیوان حسینی" ہمیں دستیاب ہوتا ہے جس سے متعلق فہرست مخطوطات میں یوں لکھا ہے

"ایک حسینی شاعر سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل میں گزرا ہے جسکا ایک دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں ہے اور ایک ہاشم علی برہان پوری کا دیوان بھی "دیوان حسینی" کے نام سے موسوم ہے مگر یہ کوئی دوسرا شاعر ہے جسکے متعلق کوئی معلومات

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۷۵ بحوالہ بیاض ادارۂ ادبیات اردو

ہمدست نہیں ہوئے۔[1]

اس دیوان میں ابتداء میں دو سلام ملتے ہیں بعد ازاں بسم اللہ کے ساتھ ردیف وار غزلیات کا آغاز ہوتا ہے۔ دیوان میں جتنی بھی غزلیات موجود ہیں سب شہدائے کربلا سے متعلق ہیں لیکن اسے غزل کا عنوان دیا گیا ہے۔

دبستان گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعراء کے کلام کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان میں سے زیادہ تر شعراء نے سلام کو بھی مرثیے ہی کا عنوان دیا ہے اور کم شاعر ایسے ملیں گے کہ جنھوں نے اپنے سلام بعنوان سلام ہی پیش کئے ہیں لیکن حسینی نے اپنے لئے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا ہے وہ اپنے رثائی کلام کو نہ تو مرثیے کا عنوان دیتا ہے اور نہ سلام و نوحے کا بلکہ غزل کا عنوان دیا ہے جو کہ قدیم روایتی انداز سے انحراف ہے۔ اگر اس کے کلام کو غزل ہی کے دائرے میں رکھا جائے تو صنف غزل پر واقعۂ کربلا کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ صنف غزل نے واقعۂ کربلا سے اثر قبول کیا ہے۔

کتب خانۂ سالار جنگ میں موجود مخطوطہ بیاض مراثی کے آغاز میں دو سلام بعنوان سلام ہمیں ملتے ہیں۔

؎ ہر اک دم سو سو اور سو سلام باری او سپر ہے
محبوب حق امام سیوم اور سبط پیمبر ہے

---

[1] فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ۔ مرتبہ نصیر الدین ہاشمی ص ۵۷۳

علیؑ والی کا دلبر اور پیارا ہے وہ احمدؐ کا
محمدؐ کے برادر کا پسر دلدار حیدرؑ کا
وہ ہے سرورؑ ابا عبداللہ جسکا اسم اطہر ہے
سیہ خامہ سپہر اسکے لئے ہے
ہوا جسکے الم میں خاک دیکھو صبح کا بر ہے
پیمبرؐ لحمک لحمی علیؑ کو جس طرح تولے
جسے صبح و مسا جبرئیل جھولے پر جھولائے وہ
علی مارا گیا اب پاک کوثر ہے
کیا جب کربلا کے بیچ وہ سرور لیا سمجھ ہے
چاہے کیا جسجا کا میرا وعدہ پہ سر ہے
علی عباسؑ علمبردار سرورؑ کا کیا جس دم
اب دریا پہ سائے بہرایا علمبر ہے
پسر مولا ہے سرورؑ کا
جسکو وہ دلدار اکبرؑ ہے
پدر کے بعد صبر سید سجادؑ جو دیکھے
کہے ایوب سے بھی یہ امام اعلی المگر ہے [1]

دوسرا سلام فارسی زبان میں ملتا ہے

---

[1] مخطوط بیاض مراثی کتب خانہ سالار جنگ

۵ السلام او عالم اسرار سرور السلام — السلام او اکرم و دلدار احمد السلام

اسکے بعد دو غزلیات ہیں جسکا آغاز سلامی سے نہیں ہوتا ورنہ ہر غزل کا آغاز سلامی اور مجرئی سے ہوتا ہے اور اشعار باہمی ربط نہیں رکھتے چنانچہ تمام غزلیات کا شمار صنف سلام ہی میں ہوگا۔

ہر سلام کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو بعنوان غزل ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر سلام کے کچھ اشعار کو پیش کرنا اسلئے ضروری ہے کہ یہ تمام غزل کے عنوان سے ملتے ہیں۔

مندرجہ سلام ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے جسکے کچھ اشعار لئے جا رہے ہیں۔

(۱) ہے سلامی تو محب خاندان مصطفیٰ — اور غلام آل پاک دودمان مصطفیٰ

فی سبیل اللہ شہید کربلا ہو گئے امام — تھے حسین ابن علی جو عز و شان مصطفیٰ

جنکو طفلی میں بجائے شیر مادر قوت روح — بیشتر اوقات ہو اب دہان مصطفیٰ

قتل ہو ہو کر گئے جنت کو انصار امام — تین دن کے بھوکے پیاسے مہمان مصطفیٰ

کیوں نہ حامی ہوں ہر اک امر کے تیرے حسین

ہے حسینی تو غلام شیعیان مصطفیٰ [1]

جملہ ۱۵ اشعار

---

(۲) ہے مجرئی ثنا گر سلطان کربلا — مداح وصف دلبر سلطان اولیاء

حضرت حسین ہیں خلف مرتضیٰ علی — شاہ شہید مظہر سلطان اولیاء

قتل پسر کے رو نرسی گریاں ہو اب تلک — جنت میں دیدۂ تر سلطان اولیاء

---

[1] بیاض مخطوطہ مراثی کتاب نمبر ۱۹ — کتب خانہ سالار جنگ

جسم سر حسین علیؑ رن میں کٹ گیا — اور غم ہو گیا مقدر سلطانِ اولیاء
زینبؑ اخی کی لاش سے کہتی تھی یا حسینؑ — سر پیٹ پیٹ دختر سلطانِ اولیاء
زخمی کیا ہو صدمہ تیر ستم سی آہ — حلقوم طفلِ اصغرؑ سلطانِ اولیاء
تجھ پر حسینی آتشِ دوزخ حرام ہے
ہے تو کمینہ چاکر سلطانِ اولیاء ۱

جملہ ۱۹ اشعار

دس ۱ ہے سلامی جو ثنا خوانِ علیؑ مرتضیٰ — ہے غلام اہل داعیانِ علیؑ مرتضیٰ
بعدِ قتل شاہ اعدا نی شہیدوں کے تمام — کاٹی سر اور لوٹا سامانِ علیؑ مرتضیٰ
ایسی کی تلوار اکبر نی بمیدان نبرد — تھی شجاعت جو کہ شایانِ علیؑ مرتضیٰ
سر فدا عمو پہ کر قاسم سدھاری در جناں — بادشاہِ نو عروسانِ علیؑ مرتضیٰ
صبح سے ماتم کی تا شام مصیبت قید میں — روتی جاتی تھی اسیرانِ علیؑ مرتضیٰ
کیوں نہ جنت حلال اور آتشِ دوزخ حرام — ہے حسینی از غلامانِ علیؑ مرتضیٰ ۲

جملہ ۱۷ اشعار

(۳) ۱ کریں شہؑ کو تسلیم شیعانِ فاطمہؑ زہرا — سلامی ہیں جو مومن دوستانِ فاطمہؑ زہرا
حسین ابنِ علیؑ سبطِ نبیؐ فرزندِ شیرِ حق — جگر بندِ خدیجہ اور جانِ فاطمہ زہرا
فکر غم پرسشِ محشر کا تو مداحِ سرور ہے
حسینی خانہ زادِ خاندانِ فاطمہؑ زہرا ۳

۱، ۲، ۳ مخطوطہ بیاض مراثی کتاب ۱۹ — کتب خانہ سالار جنگ

جملہ ۱۸ اشعار

(۵) کرتا سلامی آپکا یا حسن المجتبیٰ ہی صلوٰۃ و ثنا یا حسن المجتبیٰ

ہے جو حسینی غلام آپکا حضرت امام

کہتا ہے صبح و مسا یا حسن المجتبیٰ ۱

جملہ ۱۱ اشعار

(۶) ہیں سلامی سبط پیغمبر شہید کربلا نور چشم احمد و حیدر شہید کربلا

فی سبیل اللہ ہی قتل حسین ابن علی کشتۂ آب دم خنجر شہید کربلا

خلق نے سمجھا ہے برحق امام ابن الامام جب کئی باری شہید کربلا

آہ اسدم سی کمر جب باندھ کر جانے لگی سوی رن سولائی جان پرور شہید کربلا

بلکہ ہو جاتا عدم سارا جہاں کر قہر سی یک نگہ بھی کرتی اعدا پر شہید کربلا

غم نکر تو بخشش عصیاں کا اپنی حشر تک

ہیں حسینی شافع محشر شہید کربلا ۲

جملہ ۱۳ اشعار

(۷) سلامی مرثیہ لکھ لیو اٹھا کر تم قلم اپنا بہا لیو در غم شبیر اشک چشم نم اپنا

تھی اگر کہتی قاتل سی چلا تو وار برچھی کا سپر کرتی ہیں اب راہ خدا میں سینہ ہم اپنا

بہر حال و بہر قال و بہر وقت و بہر ساعت

حسینی پر حسین ابن علی رکھیو کرم اپنا ۳

کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطات میں ہمیں ایک اور بیاض میں حسینی کا سلام بعنوان سلامی ملتا ہے جو (۱۲) اشعار پر مبنی ہے۔

۱، ۲، ۳ مخطوطہ بیاض مراثی کتاب ۱۹ کتب خانہ سالار جنگ

سلام حضرت امام علیہ الصلوات والسلام

مومناں دل سیں پیمبر پہ کہو ملکہ سلام — بہر علی ساقی کوثر پہ کہو ملکہ سلام

گوہر تاج محمد سو حسن ابن علی — شہ چین پہ کہو ملکہ سلام

غم ستی ہو کہ عزیزاں یو حسینی کہ غمیں — مطلع نور منور پہ کہو ملکہ سلام

بلبلاں چونکہ چمن میں یہ ترانہ سیں کہیں — اوس گل باغ صنوبر پہ کہو ملکہ سلام

کوفیاں آج کئی رنمیں حسن شہ کوں شہید — اوس مہ انور حیدر پہ کہو ملکہ سلام

تن سے جدا سر سوں کئی جگوں ہا چوبالی تھے بنی — کہو الم غم ستی سر لا پہ کہو ملکہ سلام

اختر قطب رسالت ہیں حسین ابن علی — دینکی کہینگے سو اختر پہ کہو ملکہ سلام

حضرت زین العبا ہیں جو سجی جگ کے امام — دل سیں شہ باقر و جعفر پہ کہو ملکہ سلام

موسیٰ کاظم و سرور علی موسیٰ رضا — بہر تقی و نقی صفدر پہ کہو ملکہ سلام

عسکری لشکر اسلام کی قوت ہیں بجا — دو شہ علم کے مظہر پہ کہو ملکہ سلام

ہادی دین خدا ہیں جو امام برحق — مہدی رہبر پہ کہو ملکہ سلام

ہے تمہیں جس سے شفاعت کی حسینی کو امید — بہر علی ساقی کوثر پہ کہو ملکہ سلام [1]

بیاض مراثی دکنی شعراء کتب خانہ سالار جنگ میں کئی اور شعراء کے مراثی دستیاب ہوتے ہیں لیکن شعراء کی سکونت اور انکے دور کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سفارش حسین رضوی نے اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں ان شعراء کے مراثی پیش کئے ہیں جن میں کچھ مراثی سلام کی

---

[1] مخطوطہ بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ کتب خانہ سالار جنگ

تعریف پر پورے اترتے ہیں جو اس بنا پر تقاضے میں شامل نہیں کئے گئے کہ ان سے متعلق مستند حوالے نہیں ملتے اور دوسرے یہ کہ راقمۃ الحروف کا مقصد سلام کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہے۔

ان شعراء میں صادق، محبت، صلاح، مظفر، حسن، رضا علی رضا ایاغی، جلالی، عاصی، فائض، حمزہ، ہادی، طالعی اور ظہور کے نام ملتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد چراغ علی نے بھی اپنی تصنیف میں انہیں غیر متحقق مرثیہ گو شعراء کی فہرست میں رکھا ہے۔

۱۷ ویں صدی کے دکنی مرثیہ گو شعراء کی فہرست میں شرف النساء نامی شاعرہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ساتھ ہی سفارش حسین رضوی نے نمونۂ کلام بھی پیش کیا ہے۔

شرف النساء: — سفارش حسین رضوی شرف النساء کا دور تقریباً ۱۱۰۰ھ قرار دیتے ہیں چنانچہ مندرجہ مرثیہ کی قدامت کا اقرار ضرور کرتے ہیں لیکن اسکی ادبی حیثیت اور بلند مرتبے کے قائل نہیں جبکہ ڈاکٹر محمد چراغ علی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" شرف النساء کو غیر متحقق شعراء کی فہرست میں رکھتے ہیں لیکن زبان و فن کے قائل نہیں لکھتے ہیں کہ

"یہ شاعرہ زبان و فن کے اعتبار سے ۱۷۰۰ء سے پہلے کے شعراء کی ہمسری کرتی ہے" [1]

مندرجۂ ذیل سلام کو سفارش حسین رضوی مرثیہ کے عنوان سے بطور نمونہ

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں ڈاکٹر محمد چراغ علی ص ۱۹۰

پیش کرتے ہیں لیکن اسکو سلام قرار دینے کا سبب یہی ہے کہ اشعار باہم مربوط نہیں ہیں۔

؎ دسیا چاند غم کا گگن میں حسینؑ — پریا زلزلہ سب زمیں میں حسینؑ
رسالت کے کہن کا منور چندر — چھپیا کربلا کے رن میں حسینؑ
شباں کا شہنشاہ سرور حسینؑ — ہے مہمان کربل کے بن میں حسینؑ
کئے کیوں ستم شہ اوپر ظالماں — یکیلے رہے جب اورن میں حسینؑ
ولایت کے گلشن کا گل غم ستی — پریا جھر جنت کے صحن میں حسینؑ
جدا ہو کے جب خانداں سوں دیکھو — رہیا چلو مرجا کے تن میں حسینؑ
یوں روئی ہے شرف النساء غم ستی — یہی حیف کھا اپنے من میں حسینؑ [1]

دکنی دور کے مرثیہ نگاروں کا جائزہ لیں تو ہمیں چند نام ایسے نظر آئیں گے کہ جن کے دو شاعر ملتے ہیں مثلاً شاہی تخلص رکھنے والے دو شاعر ملتے ہیں۔ ایک علی عادل شاہ ثانی شاہی اور دوسرے شاہ قلی خاں شاہی اور بالکل اسی طرح مرزا تخلص رکھنے والے بھی دو شاعر ملتے ہیں۔ ایک مرزا بیجاپوری اور دوسرے مرزا ابو القاسم۔ علاوہ ازیں قادر نامی بھی دو شاعر ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک عبد القادر جو لنگا کوتال کے نام سے پہچانے جاتے ہیں جو بیجاپور سے تعلق رکھتے ہیں، جسکا عہد علی عادل شاہ کا عہد قرار پاتا ہے اور دوسرا قادر قطب شاہی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۷۸، ۷۹ بحوالہ اخبار سرفراز لکھنؤ محرم ۱۳۴۹ھ ص ۳۷

یہ حسین اتفاق ہے کہ ایک ہی تخلص رکھنے والے ہر دو شاعروں میں سے ایک کا تعلق بیجاپور سے رہا ہے تو دوسرے کا گولکنڈہ سے۔ ان ہی شاعروں میں سے قادر کی شخصیت بھی شہرت کی حامل ہے۔

قادر :— حیدرآباد کے مشہور مرثیہ نگاروں کی فہرست میں قادر کا نام بھی ملتا ہے شمالی ہند کے متعدد تذکرہ نگاروں نے بھی قادر کا ذکر کیا ہے۔ یہ ابوالحسن تاناشاہ (۱۶۷۲ء ۱۶۸۷ء) کے عہد کا شاعر تھا۔ اسی کے شعر سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۴۹ھ میں بقید حیات تھا۔

؎ سن گیارہ سو اوپر اونچاس سال سبز بانا قادر کا ہوئیں لال [1]

ساتھ ہی اسی کے ہمعصر شاعر ہاشم علی ہر ہان پوری کے شعر سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قادر ۱۱۶۹ھ سے قبل ہی انتقال کر چکا تھا جسکا اظہار ہاشم علی اپنے شعر سے اسطرح کرتے ہیں

؎ ہزار حیف ہیں شاعران دکن سو روتی رہ مرثیہ او قادر ہیں۔ [2]

ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی تصنیف "دکنی شاعری تحقیق و تنقید" میں لکھتے ہیں کہ مولوی افسر صدیقی امروہی کی مرتبہ "بیاض مراثی" میں انیس مرثیے دستیاب ہوئے جنکے ابتدائی اشعار وہ اپنی تصنیف میں درج کرتے ہیں ان نو مراثی میں سے ایک مرثیے کا آغاز اسطرح ہوتا ہے۔

؎ السلام اے شاہ مرداں السلام السلام اے شیر یزداں السلام [3]

---

[1] دکن میں اردو ضمیر الدین ہاشمی صفحہ ۴۴۵ بحوالہ یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۲۲۶

[2] دکن میں اردو ضمیر الدین ہاشمی صفحہ ۴۴۵

[3] دکنی شاعری تحقیق و تنقید ڈاکٹر محمد علی اثر صفحہ ۱۶۲ بحوالہ بیاض مراثی

مندرجہ سلام بھی جو بعنوانِ مرثیہ اسی بیاض میں ڈاکٹر محمد علی اثر کو دستیاب ہوا ہے اشعار میں باہمی ربط نہونے کی بناء پر سلام ہی قرار پاتا ہے۔

ے پیدا ہوا غم کا بنا جب یا علی موسیٰ رضا — دھوتا ہے جگ رو رو گناہ جب یا علی موسیٰ رضا

شہ سب میں ہے عالی قدر دونوں جہاں میں نامور — سایہ ہے او عصیاں اوپر جب یا علی موسیٰ رضا

شہ سوں او ہے دنیا و دیں شہ معدنِ صدق و یقیں — شہ ہے نبی کا جانشیں جب یا علی موسیٰ رضا

زیور ہے او فرقان کا کعبہ ہے او ایمان کا — پیارا ہے وہ سبحان کا جب یا علی موسیٰ رضا

شہ دیں کا بو تاج ہے ایمان کا معراج ہے — جس کوں امامت راج ہے جب یا علی موسیٰ رضا

مشتاق او کرتار کا جیو باز نقد و یکبار کا — سو دکھیا دیدار کا جب یا علی موسیٰ رضا

شہ کا گذر حق باش ہے دائم شہاں میں خاص ہے — جسکی دو جگ کوں آس ہے جب یا علی موسیٰ رضا

ایمان کی قندیل میں ہو شہ کا غم جب آشکر — روشن ہوا مجھ چک میں جب یا علی موسیٰ رضا

اپنے کرم کی چھاؤں کر روشن مرا توں نانوں کر — قربان ہوں تج پاؤں پر جب یا علی موسیٰ رضا

جنت محبت کا عدم کوثر ہوا شہ کا قدم — توں شہ شفاعت ہے عجم جب یا علی موسیٰ رضا

اے عادرا توں کر جتن شہ کی محبت کا رتن — بس ہے تجے یو دم وطن جب یا علی موسیٰ رضا[1]

دبستانِ گولکنڈہ سے تعلق رکھنے والے ایک اور مرثیہ نگار شاعر کا تذکرہ ہمیں تاریخ میں ملتا ہے۔ یہ محب کے نام سے مشہور ہوئے۔

محب: — محب بھی ابو الحسن تانا شاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اسکی ایک طویل نظم

---

[1] دکنی شاعری تحقیق و تنقید از ڈاکٹر محمد علی اثر ص ۱۶۷ بحوالہ بیاض مراثی مولوی افسر صدیقی امروہی

"معجزۂ حضرت فاطمہ" کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۹۷ میں موجود ہے جسمیں ابوالحسن تانا شاہ کی مدح کی گئی ہے۔ مندرجہ سلام بعنوان سلام بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ جو ۱۱۷۸ھ سے قبل کی مرتبہ ہے اسی میں دستیاب ہوتا ہے۔

؎ جو دیکھوں روضۂ حضرت رسولؐ آنکھوں سے — چڑھاؤں اشک کے قطروں کے پھول آنکھوں سے

وہ بارگاہ میں پلکوں سے کیجے جاروبی — جہاں کی جھاڑے ہے جبریل دھول آنکھوں سے

کرے ہے روح الامیں باادب سی صبح و مسا — طوافِ درگہ جانِ بتولؑ آنکھوں سے

پیاسی حلق پہ صابر نے فی سبیل اللہ — کیا ہے ظلم کا خنجر قبول آنکھوں سے

ہر اک محب کو بلاشبہ حج اکبر ہی — کرے زیارتِ سرورؐ حصول آنکھوں سے [1]

دکنی مرثیہ نگاری کا دامن اسقدر وسیع و بسیط ہے کہ یہ کئی شعراء کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں فائز کا شمار بھی ان ہی شعراء میں ہوتا ہے۔ "قصۂ رضوان شاہ و روح افزا" بھی اسی نے لکھی ہے۔ یہ ۱۰۹۴ھ کی تصنیف ہے۔ کل تقریباً 2520 اشعار پر مبنی مثنوی ہے جسکا اختتام اس طرح ہوتا ہے

؎ اتھا جس وقت سالِ ہجرت ہزار
اوس اوپر نود اوسکے اوپر چہار
ہوا قصہ رضوانِ شہ تمام
نبیؐ اور علیؑ پر ہزاراں سلام [2]

---

[1] بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ — سالار جنگ کتب خانہ

[2] یورپ میں دکنی مخطوطات — نصیر الدین ہاشمی ص ۱۴۹

دکنی دور میں ہمیں زیادہ سے زیادہ مثنویاں ملیں گی تقریباً ہر شاعر نے صنف مثنوی پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے لہذا ہر مثنوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خدمت میں تحفہ سلام پیش کرتا ہے چنانچہ ہر مثنوی میں سلام کے اشعار ملیں گے۔

جہاں تک فائز کا تعلق ہے ہر مصنف نے اپنی تصنیف میں اسکا نام اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی تصنیف "دکنی مثنویوں کی تحقیق و تنقید" میں تحریر کرتے ہیں کہ کتب خانہ سالار جنگ میں انہیں فائز کا ایک مرثیہ جو غزل کی ہیئت میں ہے دستیاب ہوا جسکی سرخی اسطرح ہے

"مرثیہ حضرت امام حسینؑ من کلام فائض عرف محمد زماں" جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فائز کا عرف محمد زماں تھا اور وہ اپنا نام فائض تحریر کرتا ہے لیکن اسکی وجوہات بعید از عقل ہیں کہ جب شاعر نے اپنا نام فائض لکھا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہر مصنف نے اپنی تصنیف میں اسکے نام کا املا اسطرح نہیں لکھا جسطرح خود شاعر نے لکھا ہے

ڈاکٹر محمد علی اثر تحریر کرتے ہیں کہ اسکی مثنوی "رضوان شاہ اور روح افزا" میں بھی شاعر نے اسی شکل میں فائض لکھا ہے۔

مندرجہ بالا سلام جو بیاض میرانی میں بعنوان مرثیہ ملتا ہے درحقیقت مرثیہ نہیں بلکہ سلام قرار پاتا ہے کیونکہ اس میں اشعار کا باہمی ربط نہیں۔

سوز رفعت کے گگن کا یا حسینؑ — نور احمدؐ کے نین کا یا حسینؑ

کیوں کیا عالم کوں بیکس گر جو تھا — شاہ تو جگ کے بئن کا یا حسینؑ

اس دکھوں زہراؑ کا دل ہے چاک چاک — حال کیا بولوں حسنؑ کا یا حسینؑ

لیلیٰ دس دتیاگ سوں مجنوں ہوئی — چھوڑ بر و امال و دھن کا یا حسینؑ

مار نعرے رش پر رو تے ملک — شور غم سن مرد و زن کا یا حسینؑ

دل ہو ٹکڑے اس پچھیں نکلیا ہے بھار — سر گیا پانی نین کا یا حسینؑ

گل کے لہو ہو نین تے نکلیا ہے سب — نین اثر لینے میں من کا یا حسینؑ

سرو نیں اس درد سے نکلیا ہے آہ — پھوڑ کر سینا چمن کا یا حسینؑ

دیکھ سینا عندلیباں کا پھوٹیا — چاک گل کے پیرہن کا یا حسینؑ

اشک سوں شبنم کے اس دکھ تے بھرا — نین ہو نرگس چمن کا یا حسینؑ

پونچھتے ہیں قبر میں مردے انچھو — کر رومال اپنے کفن کا یا حسینؑ

آسماں کوں حال خاکستر کیا
سوز فائض کے سخن کا یا حسینؑ [۱]

۱۷ ویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو کوئی بھی شاعر ہمیں ایسا نظر نہیں آتا جس نے بزرگانِ دین کی خدمت میں اپنا تحفۂ درود و سلام نہ پیش کیا ہو۔ تقریباً ہر شاعر نے تحفۂ درود و سلام بزرگانِ دین کی خدمت میں بھیجنے

---

[۱] دکنی شاعری تحقیق و تنقید از ڈاکٹر محمد علی اثر ص ۱۵۳، ۱۵۴

کی سعادت حاصل کی ہے چاہے وہ صنف مثنوی ہو یا صنف مرثیہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مراثی ہمیں ایسے ملتے ہیں جو صنف سلام کی تعریف میں پورے اترتے ہیں۔ کچھ مراثی ایسے ملتے ہیں جسمیں شاعر نے صنف مرثیہ ہی میں تحفۂ درود و سلام پیش کر کے اپنے دونوں مقاصد کو پورا کر دیا ہے۔ یہ ان مراثی کا تذکرہ ہے جسمیں لفظ سلام، سلامٌ علیک کے استعمال کے باوجود بھی وہ صنف سلام کی تعریف پر پورے نہیں اترتے کیونکہ اسمیں اشعار باہمی مربوط ہیں۔ جیسے

کچھ مراثی ہمیں ایسے دستیاب ہوتے ہیں جسمیں لفظ سلام، سلامی، سلامٌ علیک اور مجرئی کا استعمال نہیں ہوا ہے باوجود اسکے وہ صنف سلام کی تعریف پر پورے اترتے ہیں کیونکہ اسکے اشعار باہمی مربوط نہیں لیکن بعنوان مرثیہ ہی مخطوطات میں ملتے ہیں۔ چونکہ یہ صنف سلام کی تعریف پر پورے اترتے ہیں اسی لئے راقمۃ الحروف نے ایسے تمام مراثی کو صنف سلام میں شمار کیا ہے۔ جیسے

؎ دستا نہیں کروں کیا وہ بیان کربلا کا بھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا (غواصی)

اسی قاعدے کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقمۃ الحروف نے ان تمام سلاموں کو یکجا کیا ہے جو بعنوان مرثیہ دستیاب ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سلام ہیں۔

علاوہ ازایں ایسے سلاموں کو بھی پیش کیا گیا ہے جو بعنوان سلام ہی راقمۃ الحروف کو دستیاب ہوئے۔ جیسے

؎ مومناں دل سیں سمپئیر پہ کہو ملکہ سلام بہر علیؑ ساقئ کوثر پہ کہو ملکہ سلام (حسینی)

بعنوان سلام ہوں یا بعنوان مرثیہ شاعر کا مقصد درود و سلام پیش کرنا ہی تھا۔

جس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے شعراء میں سلام پیش کرنے کا رجحان بدرجہ اتم موجود تھا۔ لہٰذا تحفۂ درود و سلام پیش کرنے کے لئے صنف سلام ہی کی قید نہ تھی بلکہ ہر صنف میں یہ تحفۂ درود و سلام پیش کیا کرتے

لہٰذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقریباً ہر ایک نے ارشاد خداوندی کی پابندی کی ہے اور اسی حکم کی تعمیل میں تحفۂ درود و سلام پیش کیا ہے جو کہ سلسلہ نہ ہی کبھی منقطع ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ٹوٹے گا کیونکہ یہ دوسری اصناف کے برخلاف تقدس لیے ہوئے ہے

ارشادِ خداوندی کی تعمیل کرنا اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازوں کو وا کرنا ہے جس سے تا کہ دین و دنیا دونوں بھی بخیر ہو سکیں چنانچہ اس صنف ہر طبع آزمائی کرنا دنیاوی شہرت کا باعث نہیں بلکہ باعث برکت ہے۔

لہٰذا ہر شاعر نے صنف سلام پر طبع آزمائی کی ہے

سلام کی زمرہ بندی

سلام کی حدیں متعین کرنے کے ساتھ ہی ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مرثیے سے اسے ممیز کرنے کے بعد اسکی زمرہ بندی کس طرح کی جائے گی۔ اس سلسلے میں پھر خلط مبحث کا خطرہ پیدا ہوتا ہے

مرثیہ سے ممیز کرنے کے بعد سلام وہ صنف سخن قرار پائی جسمیں ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ سلام کے اور بہت سے رخ سامنے آئے۔

"درود" بھی سلام کی ایک قسم قرار پائی۔ بہت سارے سلام بحر یا بحری سے شروع ہوئے لیکن ایسے سلام بھی ملے جن میں رثائیت نہیں تھی اسطرح سلام کی دو قسمیں ہوئی۔

رثائی۔ غیر رثائی

رثائی سلام وہی قرار پائے گئے جسمیں واقعات کربلا کا بہر حال تذکرہ ہو

غیر رثائی سلام کی بھی دو جہتیں ہو گئی۔ ایک تو وہ ہوگی جو مثنوی یا کسی دوسری تصنیف سے پہلے حمد، نعت یا منقبت کے بعد یا حمد ہی کے بعد نقیبہ و منقبتی انداز میں محمدؐ یا آل محمدؐ پر درود و سلام بھیجے جانے کی شکل میں ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشعار واضح طور پر سلام کے ہیں، اور اسے سلام نہ تسلیم کرنا ادبی بد دیانتی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سلام ۱۵ اشعار سے کم ہی پر مشتمل ہوتے ہیں اور اکثر تو ایک ہی شعر یا مصرعے میں سلام بھیج دیا جاتا ہے

راقمۃ الحروف نے انہیں تمہیدی سلام کہا ہے اور ایسے اشعار کو مقالے کا

موضوع نہیں سمجھا۔ صرف انکی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

سلام کی دوسری نوعیت وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں صرف سرکار دو عالم پر سلام بھیجا گیا ہو۔ احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا مشہور سلام

؎ مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اسکی سب سے اچھی مثال ہے۔

انہیں نعتیہ سلام کہا گیا ہے۔ نعت میں عموماً اشعار ایک دوسرے سے بڑی حد تک مربوط رہتے ہیں اسی لئے شغلی نے غالباً نعتیہ سلام کا ذکر ہی نہیں کیا۔ راقمتہ الحروف کو نعتیہ سلام بہت کم ملے بہرحال انکی بھی جہاں تہاں نشاندہی کر دی گئی ہے عموماً ایسے سلام عقیدت سے تو بھرپور ہیں مگر ان میں ادبیت تقریباً مفقود ہے۔

سلام کی ایک اور قسم منقبتی سلام ہے۔ منقبت کا اطلاق ائمہ اطہار پر ہوتا ہے لیکن دوسرے بزرگانِ دین کی مدح اور توصیف میں جو اشعار لکھے گئے ہیں۔ انہیں بھی اکثر نقادوں نے منقبت شمار کیا ہے بالخصوص حضرت عبد القادر جیلانی جو غوث پاک کے لقب سے معروف ہیں انکی مدح اور توصیف میں جو اشعار لکھے گئے انہیں بھی منقبتی سلام کہا گیا ہے اول تو ایسے سلام شاذ ہیں۔ انکی ادبی حیثیت بھی نہیں اور وہ سلام کی تعریف پر بھی پورے نہیں اترتے۔ البتہ منقبتی سلام میں وہ سلام جو ائمہ اطہار چہاردہ معصومین کی مدح میں لکھے گئے ہیں ضرور آتے ہیں مگر ایسے سارے سلام بہرحال رثائی پہلو بھی رکھتے ہیں۔ راقمتہ الحروف نے سلام کی زمرہ بندی بھی کی ہے اور سلام کی مختلف نوعیتوں کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ ادبی روایت، شعری مزاج اور ذوق سخن کے اعتبار سے سلام سے مراد رثائی سلام ہیں یعنی وہ سلام جنکا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل اور آزاد ہوتا ہے

اور جنکا داخلی رد و یا قریبہ رشائیت کا ہوتا ہے رسکی وضاحت بے حد ضروری
ہے کہ رواقعتہ الحروف کے خیال میں سلام کے لیئے بہیت مخصوص نہیں کی جا سکتی
اور وہ کسی بھی بہیت میں لکھا جا سکتا ہے یہی سبب ہے کہ جہاں دور
حاضر کا تذکرہ آیا ہے احمد فراز کے سلام کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آزاد نظم
میں ہے۔ سلام کے لیئے صرف یہ ضروری ہے کہ رسکا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل اور
آزاد ہو اور کہیں رشائیت کا داخلی قرینہ ہو۔

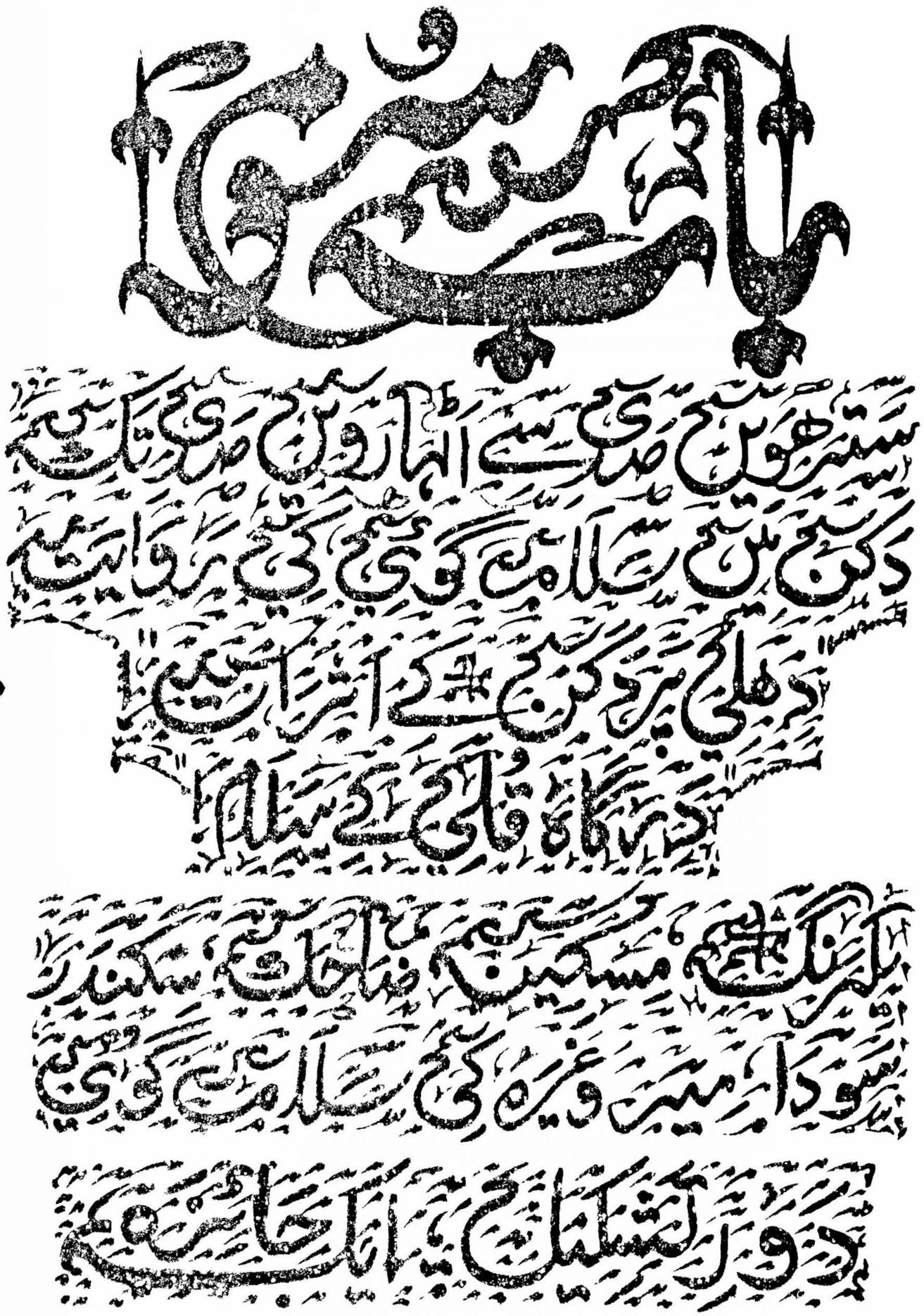

باب سوم

سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک

دکن میں سلام گوئی کی روایت

دہلی پر دکن کے اثرات

درگاہ قلی کے سلام

یلرنگ، مسکین، ضاحک، سکندر

سودا، میر وغیرہ کی سلام گوئی

دور تشکیل، ایک جائزہ

سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک دکن میں سلام گوئی کی روایت کا جائزہ لینے سے قبل راقمتہ الحروف نے لفظ "روایت" کی وضاحت کرنی ضروری سمجھی تاکہ اس باب کا مفہوم بہ آسانی واضح ہو جائے۔

لفظ "روایت" کے لغوی معنی "کسی کی بات کی نقل، اظہار، ذکر اور حکایات کے ہیں علاوہ ازیں فرہنگ آصفیہ میں روایت کے معنی "شہدائے کربلا کا کوئی سنا ہوا "ذکر یا" پرانا ذکر" کے ملتے ہیں۔ اصطلاحی معنی بھی لغوی معنی سے مختلف نہیں۔ طرز قدیم پر عمل آوری سے روایت کا مفہوم واضح ہو جائیگا یعنی کسی بھی امر کو اسیطرح بجا لانا جسطرح وہ زمانۂ قدیم سے انجام پا رہا ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہر دور کے مذاق کے مطابق کچھ نہ کچھ اصولوں کو گلے لگاتی ہوئی یہ روایت آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایت کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ روایت کے آغاز اور اسکے ارتقاء پر روشنی ڈالی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ امور ایسے انجام پاتے ہیں جنھیں قبولیت عام کا درجہ ملجاتا ہے جب یہ قبولیت عام کے درجے پر فائز ہوتے ہیں تو انپر باقاعدہ عمل آوری کیجاتی ہے اور جن امور پر شدت اور کثرت سے

عمل آوری کی جائے وہ صحت مند روایت کا درجہ اختیار کرنے لگتی ہیں۔
جب یہ صحت مند روایت دور اور زمانے کیساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے
تو وہ زمانے کے مذاق کے مطابق کئی اصولوں کو ساتھ لیکر آگے بڑھتی رہتی
ہے۔ اس ضمن کی مندرجہ شعر بھی عکاسی کرتا ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

لیکن اسکے برخلاف کچھ تجربات اور امور ایسے بھی ہوتے ہیں جنکو قبولیت عام
کا شرف نہ ملنے کی وجہ سے روایت کے دائرے تک پہنچتے پہنچتے راستے ہی میں
تھک ہار کر دم توڑ دیتے ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر عطیہ نشاط اپنی تصنیف "اردو ڈرامہ روایت
اور تجربہ" میں اردو ڈرامہ کا آغاز اور پس منظر میں روایت سے
متعلق تحریر فرماتی ہیں۔

"روایت کے تصور میں وضع داری، تقدس اور ماضی پرستی کا
بھی عنصر شامل ہوتا ہے اور اسی لئے اسکی حدیں بعض اوقات
بہت زیادہ مضبوط ہوتی ہیں جن سے انحراف کرنا ہر آدمی

کا کام نہیں ہوتا"۔[۱]

ماضی پرستی سے مراد یہ نہیں ہے کہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی یہ ادب
ہی صدیوں پہلے کے پھولوں کی سختی سے پابندی کرنے اور عہد حاضر کے تقاضوں کو
نظر انداز کر دینے بلکہ ماضی پرستی سے مراد ماضی کی پاسداری کیساتھ اپنے
کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہے یعنی ماضی اور حال میں اسطرح کا ربط رہے۔

جسطرح مرثیے کی روایت تو محمد قلی قطب شاہ سے چلی آ رہی ہے
لیکن رسمی ہیئت بولتی رہی ہے۔ ابتدائی مرثیے غزل کی ہیئت میں ملتے
ہیں بعد ازاں تقریباً ہر ہیئت مرثیے کیلئے برتی گئی یعنی مرثیے کی اندرونی ساخت
یا روح تو برقرار رہی لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ اسکی ہیئت میں
تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ بالآخر مسدس کی ہیئت کو مرثیے کیلئے حرف آخر کا
درجہ ملا۔ بالکل اسطرح سے سلام گوئی کا آغاز تو دکھنی غواصی اور
محمد قلی سے ہوا اور سلام گوئی کی اندرونی ساخت یا روح تو برقرار رہی
ہر دور میں سلام کہے گئے یہاں تک کہ مشہور و معروف غزل گو شعراء
نے بھی اس مقدس صنف پر طبع آزمائی کی اور عقیدتاً تحفۂ درود و سلام

---

[۱] اردو مرثیہ اور تجربہ عطیہ نشاط ص ۱۴

سرکارِ رسالت مآب اور چہاردہ معصومینؑ کی خدمت میں پیش کرتے رہے اور اسکو اپنا سرمایۂ آخرت تصور کرتے رہے لیکن اسکی ہیئت میں ہر شے کی طرح تبدیلیاں آتی رہیں۔ سلام غزل کی ہیئت میں بھی لکھے گئے۔ مثلث اور مربع بھی ہیں، تسدیس، ترجیع بند، مخمس اور مسدس کی ہیئتیں بھی ایسی ہیں جو سلام کیلئے نہ برتی گئی ہوں۔ فرمانے کے ساتھ ساتھ مذاق کے مطابق اسکی ہیئت میں تبدیلی آتی رہی جسکا مطلب یہی ہوا کہ سلام گو کی تن دوریت نے ماضی پرستی بھی کی اور اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے حال کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ رہی۔ اسی فراخدلی کو محترمہ عطیہ نشاط اس مثال سے بڑے خوبصورت انداز میں واضح کرتی ہیں۔

> "جیسے بہتا ہوا دریا جسمیں نئی نئی ندیاں ملتی رہتی ہیں اور دریا کی رفتار میں اپنے سرمایہ سے اضافہ کرتی رہتی ہیں" [1]

ڈاکٹر عطیہ نشاط کے اس خیال کے مطابق ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر نئی نئی ندیاں کسی دریا میں نہ ملیں اور اسکی رفتار

---

[1] اردو نظم روایت اور تجربہ — ڈاکٹر عطیہ نشاط — ص ۱۴۱

میں اضافہ نہو تو معمولی سی رکاوٹ بھی اس دریا کو ساکت کر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

روایت کے سلسلے میں تاریخی شعور کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھا ہے

"روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر اسے کوئی حاصل بھی کرنا چاہے تو اسکے لئے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اول اسکے لئے تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے"۔ [1]

تاریخی شعور کیلئے یہ ادراک کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"تاریخی شعور کے لئے ادراک کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ صرف ماضی کی ماضیت کی بلکہ اسکی موجودگی بھی"۔ [2]

چنانچہ صنف سلام ان شرائط کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ وہ ماضی کی ماضیت کو بھی برقرار رکھتا ہے یعنی اس سے مراد اسکا موضوع ہے جو

---

[1] ارسطو سے ایلیٹ تک۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی [2]

صدیوں پر زنا ہے اور اسکے تحت چہاردہ معصومین علیہ السلام کی خدمت میں تحفۂ درود و سلام پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی صنف سلام زمانہ حال تک اناصنوں کو اور زمانہ کے مذاق کو بھی پیش نظر رکھتا ہے یعنی اسکی ہیت میں ابتدا سے جو متبدل تبدیلیاں عمل میں آئیں وہ زمانے کے شعور کے مطابق ہی تھیں - دورِ حاضر میں غزل کی ہیت صنف سلام کیلئے متعین کی گئی -

چنانچہ مندرجہ بالا شرائط کی پابندی کی بنا پر دکن میں سلام گوئی کی صحت مند روایت ہمیں ملتی ہے اور اس روایت کی قبولیت عامہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا -

سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک دکن میں سلام گوئی کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سلام کیلئے قدیم وابستہ رہا چونکہ اسکی تاکید وہدایت قرآن کریم نے کی تھی - یہی وجہ ہے کہ شعری سفر کے آغاز سے ہی اسکا وجود ملتا ہے چونکہ کتاب خدا میں اسکی تاکید کی گئی ہے لہذا شعراء اسکو مذہبی فرض سمجھکر

ادا نہیں کرتے اور اسمیں عقیدے کو بالادستی حاصل رہی۔ شعراء مقدس ترین ہستیوں پر سلام بھیجکر یہ آرزو کرتے کہ انکے سلام کو درجۂ قبولیت ملجائے چنانچہ اٹھارویں صدی کے دکنی شاعر جنکا نام مسکین ہے سفارش حسین رضوی اپنی تصنیف اردو مرثیہ میں ~~اٹھارویں~~ صفحہ ۲۲ پر اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف کے شعراء کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔ صنف سلام کے آغاز کی بابت فرماتے ہیں اور ساتھ ہی دعاگو ہیں کہ ان کے سلام کو قبولیت کا درجہ مل جائے۔

؎ جب سوں آغاز کیا حق نے دستور سلام — تب سوں اول ہے محمدؐ یہ ہے منظور سلام

وہ محمدؐ کہ ہنوز آدم و حوا بھی نہ تھے — اوسکوں اول سیتے بہجاتا تھا بانور سلام

کاش کہ چہاردہ معصوم کی سبب کے طفیل

ہوئے اس عاصی مسکین کا منظور سلام [1]

مندرجہ بالا سلام نہ ہی غزل کی ہیئت میں ملتا ہے اور نہ ہی اشعار باہمی طور پر غیر مربوط ہیں لیکن پھر بھی یہ سلام اس لئے قرار پائے گا کہ اس میں شاعر سلام کی تاریخ کا مختصر اور جامع طور پر جائزہ لیتے ہوئے خود بھی سلام بھیج رہا ہے اور دعاگو ہے کہ اسکے سلام کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو جائے یعنی شاعر کا مقصد سلام بھیجنا ہے تو پھر

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات — مرتبہ نصیر الدین ہاشمی ص ۶۷۶

ہم کو یہ اختیار نہیں کہ اسکو سلام قرار نہ دیں۔

سفارش حسین رضوی کی رائے کے مطابق ۱۸ ویں صدی کا سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر مرزا گولکنڈوی قرار پاتا ہے جسکا ذکر وہ اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں صفحہ ۱۰۰ پر کرتے ہیں۔

مرزا گولکنڈوی:۔ سلطنت گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ کا درباری شاعر تھا۔ مرثیہ گوئی میں کافی شہرت حاصل کی۔ گولکنڈہ کی تباہی و بربادی سے اتنا متاثر ہوا کہ تذکرۂ شعراء ہندی مؤلفہ میر حسن میں مرزا گولکنڈوی کے تذکرے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند میں بھی اسکی مرثیہ گوئی کا چرچہ تھا۔

"میرزا ابوالقاسم مرزا تخلص از مقربان ابوالحسن تاناشاہ رحمت اللہ علیہ بود۔ چوں فوج ہندوستان آں ملک را تاراج کرد این عزیز بہ مقتضائے غیرت، لباس فقیری پوشیدہ از جہاں عزلت گزیدہ، در کنج تنہائی بہ عبداللہ گنج کہ در حیدرآباد مشہور است بقیہ عمر بہ یاد الٰہی بسر برد و ہماجا مدفون گشت۔ خدایش بیامرزد۔" [1]

---

[1] تذکرۂ شعرائے ہندی تالیف میر حسن تصنیف ۱۱۸۸ھ م ۱۷۷۵ء ص

تذکرۂ میر حسن کی عبارت اسلئے پیش کی گئی کہ جو اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ دکن میں مرزا نامی ایک ہی شاعر گزرا ہے انکی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔

مرزا کے مراثی مختلف عنوانات پر ہمیں ملتے ہیں۔ "قصہ حضرت قاسمؑ" "قصہ امام علی اصغرؑ"، قصہ حضرت امام زین العابدینؑ۔ "قصہ زعفر مہر جناں و بریان" کے عنوانات کے تحت مرزا کے طویل مراثی ملتے ہیں۔

واقعہ نگاری، طرز بیان، اسلوب بیان، رزم و بزم اور منظر نگاری مرزا کے مراثی میں عروج پر نظر آتا ہے۔ حضرت قاسمؑ کے حال کے مرثیے میں حضرت قاسمؑ کی شادی سے لیکر ازرق سے جنگ اور شہادت کے تفصیلی واقعات ملتے ہیں۔

مرزا امیر علی جونپوری مرزا سے متعلق رقم طراز ہیں

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیے کی بنیاد مرزا اور دکنی مرثیہ کہنے والوں نے رکھی ہے اسی بناء پر جناب میر انیس اور مرزا دبیر نے پر شکوہ اور عظیم عمارت تیار کی ہے جسکی وجہ سے مرزا کا مقام تاریخ مرثیہ گوئی میں بہت اہم اور بلند ہے"[1]

مرزا کا سلام بھی بعنوان مرثیہ ہی ملتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ

---

[1] تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو مرزا امیر علی جونپوری ص ۴۴۴

مرثیہ نہیں بلکہ سلام ہے کیونکہ اسکے اشعار میں باہمی ربط نہیں پایا جاتا۔

آستانہ عالی مقام شاہ سلام علیک — ہر دو جہاں کے امام شاہ سلام علیک

مومنِ کامل تمام شاہ سلام علیک — صدق سوں ہر دم مرام شاہ سلام علیک

ایزل و جانِ نبیؐ شاہ سلام علیک — نورِ دو چشمِ علیؑ شاہ سلام علیک

بائی حسینؑ علی شاہ سلام علیک — کامل و اکمل ولی شاہ سلام علیک

توں ہی امامِ زماں نائبِ کون و مکاں — مہر ہر دو جہاں شاہ سلام علیک

نورِ ولی مصطفیٰ معدنِ صدق و صفا — طالبِ خیر و وفا شاہ سلام علیک

سر دیا ہر خاص و عام قصد ہر صبح و شام — مجمع ہر نیک نام شاہ سلام علیک

گوہرِ تاجِ رسولؐ نورِ دو چشمِ بتولؑ — ہر دو جہاں میں قبول شاہ سلام علیک

صاحبِ صدرِ یقیں تختِ خلافت نشیں — زیورِ دنیا و دیں شاہ سلام علیک

نورِ شہادت توئی تاجِ سعادت توئی — شیرِ شجاعت توئی شاہ سلام علیک

تکیہ بروزِ حساب شاہِ دو عالم خطاب — خواجۂ عالیجناب شاہ سلام علیک

زینتِ بحرِ یقیں گوہرِ درجِ کریم — صابرِ دردِ عظیم شاہ سلام علیک

اے شہِ دیں شبیر بر دہر توں تیری نظر — لطف سوں مرزا ادیبؔ شاہ سلام علیک

۱؎ مخطوطہ بیاض ہیراتی مختلف شعراء کتاب نمبر ۴۲ کتابت ۱۱۴۰ھ کتب خانہ سالار جنگ

بہ سلسلۂ قادر گولکنڈوی تعالے کے دوسرے باب میں برہان پور کے ایک مشہور مرثیہ گو ہاشم علی کے اس شعر کو پیش کیا گیا تھا جسمیں وہ مندرجہ شعراء نہونے پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

؎ ہزار حیف نیں شاعران دکن ؛ سو روحی و مرزا و قادر نہیں

اس شعر کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحی، مرزا اور قادر دبستان گولکنڈہ دکن کے نامور مرثیہ گو شاعر تھے جسکی کمی شاعران دکن کیلئے مایوسی کا باعث تھی ان میں سے روحی کا ایک سلام پیش کیا جاتا ہے۔

؎ آج غمناک ہیں چمن کے گل ۔۔۔ بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل

غمزدہ سینہ داغ حیراں ہے ۔۔۔ نرگس و لالہ و سمن کے گل

یوں نہ لائے شفق کے دستے ہیں ۔۔۔ لہو میں ڈوبے ہیں گلگن کے گل

جب سنے رشک کی بات مجلس میں ۔۔۔ جل بوجھے شمع انجمن کے گل

نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا ۔۔۔ سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل

خوش لگے تجھ طبع سیں اے روحی ۔۔۔ دل کے باغاں منے سخن کے گل [1]

مندرجہ بالا اشعار جو مرثیے کے عنوان سے ملتے ہیں دراصل مرثیہ نہیں

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۱۰۶

بلکہ سلام ہیں۔ اسی بند کی بابت ڈاکٹر چراغ علی لکھتے ہیں کہ

"سلام عموماً موضوع کے اعتبار سے مرثیہ کم اور منقبت زیادہ ہوتا ہے اور روحی کے مرثیہ کا جو بند دستیاب ہوا ہے اسمیں رثائی مضامین تو باندھے ہیں لیکن زبان کی فارسیت اور قصیدہ کے آہنگ کی وجہ سے مرثیہ کا رثائی مزاج دب کر رہ گیا ہے۔ [1]

روحی کے سلام کے کچھ اشعار جو بعنوان سلام ہیں راقمتہ الحروف کو ڈاکٹر محمد چراغ علی کی تصنیف سے ہی دستیاب ہوئے ہیں۔

؎ گھر ولایت کا ادک روشن کیا — مرحبا شمع منور مرحبا
سروراں کے تاج کا تو لعل ہے — اے دیناں کا زیب و زیور مرحبا
برق سوں تیرے کھرگ کا تاٹ ہے — مصقلا تس کا سو چندر مرحبا
دین کے صف کوں سدا قائم کیا — کفر کا توڑیا ہے لشکر مرحبا [2]

سلام کے تیسرے شعر میں روحی نے امام حسین علیہ السلام کی تلوار کی تعریف کی ہے جس سے متعلق ڈاکٹر محمد چراغ علی اپنے خیال کا اظہار اسطرح کرتے ہیں کہ دکنی

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں — ڈاکٹر محمد چراغ علی — ص ۱۶۷

[2] اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں — ڈاکٹر محمد چراغ علی — ص ۱۶۸، ۱۶۷

شعرا دمیں صرف روحی اور عابر نے تلوار کی تعریف شعرائے لکھنؤ کیطرح سے کی ہے۔

سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک مرثیہ اور سلام گوئی کے سلسلے میں گولکنڈہ اور بیجاپور ہی کو اہمیت حاصل تھی لیکن اٹھارویں صدی میں اورنگ آباد، گجرات اور برہان پور بھی اسی میں شامل ہو گئے لیکن دلبستان گولکنڈہ اور بیجاپور نے اردو زبان کی بالخصوص صنف مرثیہ کی جو خدمات کی ہیں انہیں تاریخ کے اوراق پر سنہری حرفوں سے بھی لکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قطب شاہی، عادل شاہی و نظام شاہی سلطنتیں جو تقریباً دو سو سال سے حکمران تھیں بالترتیب ۱۵۴۳ء، ۱۶۷۲ء، ۱۶۸۶ء میں مغلیہ سلطنت کی ماتحت ہو گئیں اور انپر مغلیہ تہذیب اثر انداز ہونے لگا۔

شعرا جنہیں قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں شاہی سرپرستی حاصل تھی وہ مغلیہ عہد میں بھی اورنگ زیب سے یا قدر دانی کی امید کئے طبع آزمائی کر رہے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی فتوحات سے فرصت پا کر دکنی شعرا کی صلاحیتوں کو سراہا۔

۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ چنانچہ اورنگ آباد سے گولکنڈہ اور بیجاپور جیسے صدر مقاموں کی جگہ لے لی۔ صدر مقام ہونے کی بناء پر رونق دوبالا ہونے لگی۔ سلطنت مغلیہ کا صدر مقام ہونے کے سبب اورنگ آباد

نہ صرف دہلی کے امراء اور شعراء کیلئے مرکزی حیثیت کا حامل ہوا بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور جیسی ریاستوں کے شعراء نے بھی اسکی مرکزیت کو تسلیم کیا۔ اور رنگ آباد چلے آئے بیجاپور شعر و شاعری کا چرچہ ہونے لگا۔

۱۶۸۶ء میں تقریباً تمام دکن سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو دکن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا مغلیہ حکومت کی طرف سے جو دکن کے صوبیدار مختلف حصوں پر مقرر کئے گئے تھے وہ اپنے علاقوں کو خود مختار حکمران بن بیٹھے، ارکاٹ اور سدھوٹ وغیرہ صوبوں کے ساتھ ہی گجرات سفارش حسین رضوی صنف مرثیہ کے ترقی کے منازل طے کرنے سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"جب دکنی صوبیدار نے حیدرآباد کو اپنا صدر مقام بنایا
تو مرثیے کا مرکز ثقل حیدرآباد کے بجائے گجرات منتقل ہو گیا
اور گجرات خاص طور پر برہان پور میں مرثیے نے اتنی ترقی کی
کہ دکنی بھی گجراتیوں سے مرثیہ لکھوانے لگے"[1]

برہان پور اور گجرات میں صنف مرثیہ کی ترقی کے اسباب تو واضح نظر آتے ہیں لیکن سفارش حسین رضوی کا قول کہ "دکنی بھی گجراتیوں سے مرثیہ لکھوانے لگے" بعید از فہم ہے

---

[1] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۹۸

کیونکہ دکن میں تقریباً ایک صدی سے صنف مرثیہ پر طبع آزمائی ہوتی آرہی تھی چنانچہ دکنی شعراء کو صنف مرثیہ کا ماہر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ دکنی شعراء نے گجراتی شعراء سے مراثی لکھوائے ہوں۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ برہان پور اور گجرات میں اسی عرصے میں مرثیے کو فروغ ہوا چنانچہ اس دور میں گجرات اور برہان پور سے تعلق رکھنے والے مرثیہ گو شعراء زیادہ ہی نظر آتے ہیں۔

دکن پر مغلیہ حکمرانوں کے قبضے سے لیکر عہد آصفیہ کے آغاز تک کی اردو کو نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں مغلیہ اردو سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ عرصہ جملہ ۳۷ سال پر محیط ہے اس دور کے شعراء کی فہرست نصیر الدین ہاشمی نے مرتب کی ہے۔

مغلیہ اردو سنہ ۱۱۰۱ھ تا سنہ ۱۱۳۶ھ

اس دور میں بھی کئی ایک شعراء نظر آتے ہیں جنھوں نے صنف مرثیہ اور سلام پر طبع آزمائی کی اور اس صنف میں شہرت حاصل کی - لیکن ان تمام کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ اس دور کے انہیں شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے روایت سازی کی - صنف سلام کی روایت کو پروان چڑھایا، اور اسکی راہیں ہموار کیں -

ذوقی، کا شمار بھی اس دور کے ان ہی شاعروں میں ہوتا ہے

ذوقی :— سید شاہ حسن ذوقی تخلص کرتے تھے - درویش صفت تھے ان کے مرشد شاہ محمد خاں نے انہیں "بحر العرفان" کا خطاب دیا تھا - ذوقی کو اپنی شاعری پر ناز تھا - مراثی کے علاوہ دوسری اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے - ذوقی کی مثنویاں (۱) وصال العاشقین (۲)، وفات نامہ (۳) عروث نامہ اور مناجات نامہ کے عنوانات سے دستیاب ہوتی ہیں -

ڈاکٹر محمد حیدر اغ علی نے مرثیوں کے علاوہ انکی سلام گوئی کا بھی تذکرہ

کیا ہے - یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر محمد حسین راغ علی ذوقی کو قطب شاہی دور کا شاعر بتلاتے ہیں تو حبیبہ سنوارش حسین رضوی اور مرزا امیر علی جوشنوری اسے عادل شاہی دور کا شاعر بتلاتے ہیں اور ڈاکٹر رشید موسوی ذوقی کے عہد سے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ اورنگ زیب کے عہد ہی میں پیدا ہوئے

بہرحال یہ حقیقت مسلم ہے کہ ذوقی کا شمار ۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ کے شعراء میں ہوتا ہے اور بقول مصنف "دکن میں اردو" ذوقی اپنے آپکو نصرتی سے بڑا شاعر تصور کرتا تھا۔ شاعری میں اسے مہارت حاصل تھی۔ زبان بہت ہی سلیس اور سادہ ہے۔ کلام تقریباً تین سو سال قدیم ہونے کے باوجود بھی سادگی اور سلاست کی بناء پر زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مراثی کو دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا کہ یہ تین صدی قبل کا کلام ہے۔

مندرجہ سلام پر ہمیں تصنیف میں بعنوانِ مرثیہ ہی ملتا ہے لیکن در اصل یہ سلام ہے کیونکہ اسکے اشعار میں باہمی ربط نہیں پایا جاتا۔

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج کیوں نہیں — تاریک ہے تیم بن جبال جلوہ دکھاتے کیوں نہیں

وہ جاہل دو رخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن — جوں برق تیغ صف شکن شعلہ جگمگاتے کیوں نہیں

وہ شمع بزم مصطفےٰ باد اجل سو گل ہوا — سب سوز دل ہوں تن سدا باراں گلاتے کیوں نہیں

چھوڑ دو سگل دنیا کے کام دس دن تلک اے خاص و عام — ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں

سنتے ہو تم آ موسناں تہہ کی شہادت کا بیاں — سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں

ذوقی تمہارا ہے غلام فضل و کرم سے یا امام — اپنی زیارت کو مدام اسکو بلاتے کیوں نہیں [۱]

ذوقی کا سلام بعنوان سلام

شمس الضحیٰ ہر سلام بولو — بدر الدجیٰ ہر سلام بولو

شبیر خوار ہر سلام بولو — آل عبا ہر سلام بولو

ذوقی کہتا ہے صبح و مسا میں

اس رہنما پر سلام بولو [۲]

مندرجہ بالا سلام میں شاعر نہ صرف خود ان مقدس ترین ہستیوں پر سلام بھیجتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی تحفۂ درود و سلام بھیجنے کی ہدایت اور نصیحت کرتا ہے۔

قاضی محمود بحری کا شمار بھی اسی دور کے شعراء میں ہوتا ہے

محمود بحری: — نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ انکے والد کا

---

[۱] دکن میں اردو — از نصیر الدین ہاشمی — ص ۳۲۰

[۲] مخطوطہ یورپ میں دکنی مخطوطات — از نصیر الدین ہاشمی

نام بحر الدین تھا خانہ قاضی محمود نے اپنا تخلص بحری اختیار کیا۔ سلسلۂ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ وطن گوگی (گلبرگہ) تھا۔ والد بحر الدین گوگی سے بیجاپور آئے اور برہان الدین جانم کے کسی خلیفہ کے مرید ہو گئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی عمر کے چالیس سال تک وہ رند مشرب رہے۔

محمود بحری کی عمر لگ بھگ ستّو سال بتائی جاتی ہے چنانچہ نصیر الدین ہاشمی کے کہنے کے مطابق انکی سن پیدائش ۱۰۳۰ھ قرار دی جا سکتی ہے

بیجاپور کا آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ قاضی محمود بحری کا معتقد تھا چنانچہ اسنے اسے جاگیر سے بھی نوازا تھا۔ قاضی محمود بحری اورنگ زیب عالمگیر کی فتح بیجاپور سے قبل ہی حیدرآباد چلے آئے اور بعد ازاں اپنے وطن روانہ ہوئے، اورنگ زیب عالمگیر سے ہوئی۔

قاضی محمود بحری کا انتقال ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء میں ہوا

دکنی اور فارسی زبان میں صنف مثنوی، غزل اور مرثیہ پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ کلام کا ذخیرہ کافی تھا جو کہ تلف ہو گیا مندرجہ اشعار جو مرثیے کے عنوان سے ہمیں دستیاب ہوتے ہیں دراصل مرثیہ کے بیس بند ہیں جو اپنی داخلی ہیئت کی بنا پر سلام کے ہیں۔

؎ جب شاہ کے وجود مبارک پہ غم ہوا — تب سب جہاں کے حرف خوشی کا عدم ہوا

رخ گلرخاں کے غم منے جوں زعفراں ہے زرد — تھا قد الف نمن سواد جنوں دال خم ہوا

گلزار گلستاں بنے غم تے ہو چاک چاک — روتا ہے ہر شجر نہ کہ شبنم تے غم ہوا

دل جلکے راکھ کیوں نہو اچھن کے بن منے — جنوں کہ چنار غم کی اگن کا اگم ہوا

غم تاب لیا نہ آب میں غرقاب لو جہاں — ہو رقم لوط غم تے زمیں میں ہضم ہوا

پیغمبراں میں جنوں کہ محمدؐ سوں ختم ہے — یوں نمازیاں شہ کے عزا ہول ختم ہوا

جب کوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لائے — او دل یقیں کہ حشر کوں باغ ارم ہوا

بحری مدام شاہ کے ماتم میں یو گلے — جوں چاند آسماں پہ گل گل کے کم ہوا [1]

اسی عہد کے ممتاز و معروف شعراء میں سید اشرف کا بھی شمار ہوتا ہے

سید اشرف :- سید اشرف نام تھا۔ اشرف تخلص کرتے تھے حالات کا تفصیلی طور پر علم نہیں ہوتا لیکن مشہور و معروف ہونے کے باعث قدیم تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی غزل کیساتھ ساتھ صنف مرثیہ کی طرف خاص رجحان تھا۔ چنانچہ انہوں نے کئی مرثیے لکھے۔ انکے مراثی سے

---

[1] دکن میں اردو — از نصیر الدین ہاشمی — ص ۳۱۰، ۳۰۹

ہی ان کی صنف مرثیہ سے خصوصی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے - اسنے ایک فارسی مثنوی "جنگ نامہ جریر" کا ترجمہ کیا ہے جو کہ ۱۱۲۵ھ کی تالیف ہے۔ مثنوی کے عنوان ہی سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسکے اصل کردار حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں - جنگ وجدل کے تفصیلات کے ساتھ ہی اس مثنوی میں جگہ جگہ دینِ اسلام کی تبلیغ کا تذکرہ ملتا ہے -

صنف مرثیہ کے عنوان سے دو مراثی ملتے ہیں جن میں سے ایک سلام اسلئے قرار پاتا ہے کہ اس کے اشعار میں باہمی ربط نہیں ہے -

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا
کہاں ہے وہ حسین ابن علی صفدر شکن میرا
اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
بزرگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بکہ تیر ماتم شہ دل میں کاری
شہید کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا

ہوا ہے لکہ زخمی خنجر داغ نجم شہ سوں
ہزرنگ لالہ ہے لبریز خوں دلکا چمن میرا

مہہ و خورشید کے جہلکار سوں لش دن رہے روشن
ضیائے حبِ آلِ مصطفےٰ سوں انجمن میرا

کیا ہوں بیدل یوں مرثیہ حب سوں امامونکا
ہوا مشتاق ہر اک شاعر ملک دکن میرا

جو کوئی ہے صدق دل سوں دوستدار آلِ پیغمبر
اے اشرف اسکے پگ کی خاک ہے کحل نین میرا [۱]

ولی نامی بھی دو شاعر اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سے ایک ولی اورنگ آبادی اور دوسرا ولی ویلوری جو مثنوی روضۃ الشہدا کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

ولی ویلوری: — میر ولی فیاض نام تھا۔ ولی تخلص کرتے تھے ویلور (مدراس) کے متوطن تھے چنانچہ ولی ویلوری کے نام سے شہرت پائی۔ بعد ازاں سدھوٹ آکر ملازمت اختیار کی اور ارکاٹ میں انتقال فرمایا۔

---

[۱] یورپ میں دکنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی ص ۳۴۷، ۳۷۹

ولی کی مثنوی روضتہ الشہدا جو کہ شہادت نامہ کے انداز پر لکھی گئی تھی اور علاوہ ازایں انکے رثائی کلام سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اورنگ آباد سے دور ارکاٹ، سدھوٹ اور ویلور میں قدیم رثائی شاعری کی روایت پروان چڑھتی رہی

ولی ویلوری کی کئی مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں۔ جیسے روضتہ الشہدا، روضتہ الانوار، روضتہ العقبیٰ، دعائے فاطمہ، مثنوی رتن و پدم، وغیرہ، لیکن ان تمام میں روضتہ الشہدا ہی کے سبب اسکی شہرت ہوئی۔ مثنویاں چونکہ طویل ہوتی ہیں اس طرح ان تمام مثنویوں کے اشعار کی تعداد تقریباً ۹ تا ۱۰ ہزار ہوگی۔

ولی ویلوری نے صنف مثنوی کے علاوہ دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیے بھی کہے ہیں جو غزل کی ہیئت میں ملتے ہیں۔

مندرجہ اشعار مرثیہ کے عنوان سے ملتے ہیں لیکن اشعار میں باہمی ربط نہونے کی بناء پر سلام قرار پاتے ہیں۔

؎ اے ہادیٔ سنسار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے نورِ چشمِ مصطفیٰؐ فرزندِ شاہِ مرتضیٰؑ
اے دلبرِ خیر النساء تو کیوں جا بسایا کربلا

تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے تو کیوں جا بسایا کربلا [1]

اس دور میں غزل کی ہیئت کے علاوہ مرثیے مربع بھی ملتے ہیں مربع مرثیے یتیم احمد سے مخصوص ہیں۔

یتیم احمد: — یتیم احمد نام اور تقریباً تخلص بھی یہی کرتا تھا۔ برہان پور سے تعلق رکھتا تھا۔ رشید موسوی نے "سودا" کا ہمعصر قرار دیتی ہے۔ یتیم احمد نے سوائے صنف مرثیہ کے کسی دوسری صنف پر طبع آزمائی نہیں کی۔ اسکے سات مرثیے اڈنبرا میں ملتے ہیں۔

مندرجہ اشعار جو مسدس کی ہیئت میں ہیں بعنوان مرثیہ ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔ ابتدائی چار مصرعوں میں شاعر چونکہ سلام بھیج رہا ہے لہذا یہ سلام ہی قرار پائے گا

؎ اے توں سرورے دوراں سلام علیک — گل باغ جناں سلام علیک
شاہ کشورستاں سلام علیک — قاتل گمرہاں سلام علیک

---

[1] اردو مرثیہ — از سفارش حسین رضوی — ص ۱۱۶

اے شفیع الامم امام ہدیٰ
یوسیتیم احمد کا دوسرا [1]

بالکل یتیم احمد کی طرح ندیم کے پاس بھی سوائے مراثی کوئی دوسری صنف تلاش کے باوجود بھی نہیں ملتی۔

ندیم: ــــ سید شاہ ندیم اللہ حسینی نام اور ندیم تخلص کرتے تھے۔ بیجاپور کے متوطن تھے۔ بلند پایہ اور اپنے دور کے بہترین مرثیہ نگار تھے۔ لیکن انکا کلام ہمیں دستیاب نہ ہوا۔

اس دور میں دستیاب شدہ مراثی اور کلام سے ہم یہ نتیجہ قائم کر سکتے ہیں کہ دلستانِ بیجاپور اور گولکنڈہ کے خاتمے کے بعد معلیہ دورِ حکومت کے ۳۷ برسوں میں بھی مرثیہ نگاری اپنے آب و تاب پر رہی کیونکہ قطب شاہی اور عادل شاہی دورِ حکومت میں اسکی آبیاری کچھ اسطرح ہوئی تھی کہ اب اسکے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس دور میں بھی ایسے شعراء کی کمی جنھوں نے سوائے مرثیہ کے کسی اور صنف پر قلم ہی نہ اٹھایا ہو۔ جیسے یتیم احمد، ندیم اور جلیل وغیرہ

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات ــــ نصیر الدین ہاشمی ص ــــ

جلیل کا شمار بھی اسی دور کے شعراء میں ہوتا ہے۔ بقول ضمیر الدین ہاشمی

سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل سے تعلق رکھتا تھا۔

جلیل :- عبد الجلیل نام اور جلیل تخلص کرتا تھا۔ ہر سال محرم میں بہ پابندی مرثیہ لکھتا اور نہ صرف لکھتا بلکہ انھیں عاشور خانوں میں پڑھتا بھی تھا۔ سفارتیں جس لکھتے ہیں کہ کتب خانۂ سالار جنگ میں اسکے مراثی و سلام کی ایک بیاض دستیاب ہوتی ہے جسمیں مراثی ہر بیت میں ملتے ہیں جو ردیف وار جمع کئے گئے ہیں۔ مرثیہ مسدس کی ہیت میں بھی ملتا ہے جس سے متعلق ضمیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں تحریر کرتے ہیں

"جلیل کے مرثیے طویل اور غزل نما ہونے کے علاوہ ایک مرتبہ مسدس بھی ملتا ہے اس سے واضح ہے کہ مرثیوں کو مسدس میں لکھنے کا طریقہ جلیل نے جاری کر دیا تھا۔" [۱]

جلیل کے مرثیے طویل اور مختصر دونوں بھی ملتے ہیں۔ طویل مرثیے سو سو اشعار پر بھی مبنی ہیں۔ مراثی کی تمام خصوصیات کے ساتھ ہی کلام جذبات سے عاری نہیں۔ ضمیر الدین ہاشمی مراثی کے نمونے پیش کرتے ہیں جن میں سے ایک مرثیہ نہیں بلکہ سلام قرار پاتا ہے کیونکہ اسکے اشعار میں باہمی ربط نہیں ہے۔

---

[۱] دکن میں اردو — ضمیر الدین ہاشمی — صفحہ ۳۵۱

آیا وہی کا چاند اب غم کا جنم ہوا ہے
اس بار غم سوں دیکھو چندر بھی خم ہوا ہے

کی صبح نے گریباں چاک از غم شہیداں
دامانِ گل انجھوں کی شبنم سوں نم ہوا ہے

مکھ لیتے لوح کالا کہتا کہ ہے تلم اب
ماتم میں شہ کے دیکھا لوح و قلم ہوا ہے

روتے ہیجا محمدؐ عترت کے غم سوں لڑ لڑ
سب انبیا کے دل میں بھاری الم ہوا ہے

حوّا و سارہ، مریم بر سر دے کہتیں اے زہراؑ
تجھ رونا دیکھ لڑ لڑ غم ہم کو جم ہوا ہے

عترت کے غم میں رونا کر یاد مصطفیٰؐ کا
امت پہ فرض دس دن یو غم ختم ہوا ہے

ملک عرب عجم تہیں سارا یو غم سوں رونا
اس حادثہ سوں ہر ہم ملک علم ہوا ہے

نہیں کچھ جلیل کوں، در اعدا کی دشمنی سوں
سر دینے شہ کے پگ پر ثابت قدم ہوا ہے [1]

واقعتہ الحروف نے اشبک اس دور کے جن جن شعراء کا تذکرہ پیش کیا ہے وہ اس دور کے مرثیہ گو شعراء مانے جاتے تھے اگرچہ کہ انہوں نے صنف سلام کو بعنوان سلام ہی پیش کیا ہو یا بعنوان مرثیہ لیکن سلام ضرور پیش کیا ہے لیکن اسکا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مرثیہ نگار شعراء ہی کے ہاں ہمیں سلام دستیاب ہوتے ہیں اور وہ شعراء جنھوں نے مرثیہ نہیں کہا انہوں نے سلام بھی نہیں لکھا۔

سلام تو ان شعراء کے ہاں بھی نہیں ملتے ہیں جو مستند غزل گو شعراء کی حیثیت سے مشہور ہوئے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ عقیدتاً بارگاہ نبوی ؐ میں حصول ثواب کیلئے تحفۂ درود و سلام پیش کیا کرتے تھے جن میں ولی اورنگ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔

ولی اورنگ آبادی: ــــ نام ولی محمد تھا ولی تخلص کرتے تھے جسطرح اردو شاعری کے کچھ شعراء کے حالات منظر عام پر نہ آسکے بالکل اسی طرح ولی کے تفصیلی حالات بھی مخفی ہیں، چنانچہ ولی کے نام اور سن پیدائش

---

[1] دکن میں اردو ــــ از نصیر الدین ہاشمی ص ۳۵۳، ۳۵۴ بحوالہ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ ــــ

اور وفات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ ان کا نام شمس الدین بتاتے ہیں اور ولی تخلص۔ لیکن کچھ لوگ محمد ولی نام، ولی تخلص اور شمس الدین لقب بتاتے ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرے میں انکا نام شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں لیکن نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں ولی کا نام ولی محمد لکھتے ہیں جو کہ زیادہ معتبر ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ان کی سن پیدائش ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۸ء بتاتے ہیں جس کے لئے وہ میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعراء" کا حوالہ دیتے ہیں۔

بعض لوگ انھیں گجراتی تصور کرتے ہیں لیکن یہ مستند نہیں۔ نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں لکھتے ہیں کہ شاہ ابو المعالی کے فرزند جو ولی کے ہمعصر تھے اور ساتھ ہی دوست بھی تھے اپنے قلمی دیوان میں ولی کو دکنی شاعر قرار دیتے ہیں۔ گجرات کو جو کہ دکن میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے اسلئے یہ نظریہ بالکل ہی حقیقت پر مبنی ہے کہ ولی گجرات کے متوطن تھے۔

ولی کو اردو شاعری کا بابا آدم اسوقت تک تسلیم کیا جاتا رہا جب تک کہ قبل از ان شعراء کا کلام دستیاب نہیں ہوا تھا

ولی نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ پہلی بار اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں

اور دوسری مرتبہ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں جسکا ثبوت خود اسکا شعر ہے

؎ دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
کوئی جا کہدے محمد شاہ سوں

اور شعرائے دہلی انکے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور یہ ولی ہی کا تاثر تھا کہ شعرائے دہلی نے بجائے فارسی کے اردو زبان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

ولی اورنگ آبادی اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ صوفیانہ خیالات عام ہو رہے تھے اور خود ولی نے بھی صوفی مسلک کو اختیار کیا چنانچہ کلام میں صوفیانہ خیالات زیادہ ملتے ہیں۔ ولی نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے جن میں صنف مرثیہ بھی شامل ہے۔ ہر صنف میں اپنی مہارت اور عظمت کا سکہ منوا یا لیکن صنف غزل میں تو استادِ سخن قرار پائے۔ تختہ گوئی میں بھی کمال حاصل کیا۔ یہی شاعر جذبات عقیدت کیساتھ بارگاہ نبوی میں اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے اسطرح ہدیہ سلام پیش کرتا ہے۔

؎ اس نورِ مصطفےٰ پر بولو سلام یاراں محبوب مرتضیٰ پر بولو سلام یاراں
اس پاک یار صابر حیدر کے دل ربا پر اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں

یو جی ولی فدا کر اس شاہِ کربلا پر　　اس لائقِ ثنا پر بولو سلام یاراں [1]

ولی کے انتقال کی تاریخ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے عبد الحق کی تحقیق کے مطابق ۱۱۱۹ھ صحیح قرار پاتی ہے۔

---

[1] مضمون "سلام کا ارتقائی سفر" از علی جواد زیدی رسالہ العلم مدیر علی جواد زیدی ص ۱۵

سلطنتِ آصفیہ سنہ ۱۱۳۶ھ تا سنہ ۱۲۲۰ھ

سترھویں صدی سے لیکر اٹھارویں صدی عیسوی تک دکن پر مغل اور آصف جاہی حکمران دونوں ہی کی حکومت رہی۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں مغل دکن پر قابض رہے اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کو فتح کرتے اپنے چھوٹے لڑکے کام بخش کو یہاں کا صوبیدار مقرر کیا لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ شہزادہ معظم بہادر شاہ کے لقب سے بادشاہ ہوا لیکن [illegible] ہو گیا۔ اس کا جانشین جہاندار شاہ ہوا جو ایک [illegible] تک حکومت کر پایا۔ بعد ازاں سازش کا شکار ہو گیا۔ بعد ازاں اسکے بھتیجے فرخ سیر نے [illegible] تا سنہ ۱۷۱۹ء حکومت کی جسکو اسکے وزیر قطب الملک نے قید کر کے بہادر شاہ کے پوتے کو محمد شاہ کا خطاب دیکر تخت نشین کیا۔ اسکے عہد میں بھی درباری سازشوں کا [illegible] اور وزیروں وغیرہ میں اختلاف بڑھتا گیا۔ دکن کی صوبیداری پر حسین علی خاں کو مامور کیا گیا۔ رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت پر زوال آتا گیا اور اسکا شیرازہ بکھرتا گیا۔ مختلف ریاستوں میں شورش پسندوں نے سر اٹھایا۔ اسی اثناء میں نظام الملک جسے محمد شاہ کے دور میں مراد آباد اور مالوہ کی صوبہ داری پر فائز کیا گیا تھا آئے دن کی بدانتظامی سے تنگ آکر دکن کا رخ کیا۔ چنانچہ

محمد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے بلا کر قلمدان وزارت انھیں سونپ دیا اور ۱۱۳۴ھ میں اسنے ملک دکن کے انتظام کا بیڑہ اٹھایا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے تو مغلیہ سلطنت کی جڑیں اور بھی ہلا دیں۔

نظام الملک نے حتی الامکان کوشش کی کہ حالت بہتر ہو جائے لیکن اسی زمانے میں نظام الملک اور محمد شاہ کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں چنانچہ آپ نے محمد شاہ سے دوری اختیار کرنے ہی میں بہتری سمجھی اور بادشاہ سے اجازت لیکر ۱۱۳۶ھ میں دکن کا رخ کیا۔ چنانچہ اسوقت کے دکن کے صوبہ دار عماد الملک مبارز خاں کے سپہ سالار عالم علیخاں سے بمقام شکر کھیڑہ مقابلہ ہوا اور کامیابی کیساتھ اورنگ آباد میں داخل ہوئے

اسطرح دکن پر اب تک جو مغلوں کا دور حکومت تھا وہی رب آصف جاہی دور حکومت کا آغاز ہوا۔ نواب آصف جاہ اول ۱۱۳۶ھ تا ۱۱۶۱ھ اسطرح ۲۵ سال حکمران رہے جسکے بعد نواب ناصر جنگ ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۴ھ اور نواب مظفر جنگ ۱۱۶۴ھ تا ۱۱۶۴ھ بہت ہی مختصر عرصہ کیلئے حکمران رہے لیکن انکے مقابلے میں نواب ولایت جنگ کا عہد کسی قدر طویل رہا جو ۱۱۶۴ھ تا ۱۱۷۳ھ یعنی ۹ سال پر محیط رہا۔ بعد ازاں نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی ۱۱۷۳ھ تا ۱۲۱۸ھ کے دور حکومت کا آغاز ہوا اور ان کے دور کے اختتام کے ساتھ ہی ۱۸ ویں صدی کا بھی اختتام عمل میں آیا۔

اٹھارویں صدی کے آصف جاہی دور میں اردو زبان کو بڑی ترقی ہوئی بڑے بڑے باکمال شاعر اس عہد میں نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل اردو زبان میں تذکرے نہیں لکھے گئے تھے تمام تصانیف ہمیں فارسی زبان میں ملتی ہیں لیکن اس دور میں اردو زبان میں بھی ہمیں ایک تذکرہ گلشن گفتار کے نام سے ملتا ہے جسے خواجہ حمید نے مرتب کیا ہے جو ۱۱۶۲ھ میں مرتب کیا گیا اور ۱۱۷۹ھ میں لالہ لچھمی نارائن شفیق نے اپنا تذکرہ مرتب کیا جن سے اردو زبان کی رفتہ رفتہ ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شعراء اور اہل کمال کی سرپرستی ہوئی جس کی وجہ سے سرزمین دکن علم و فن کا گہوارہ بنی رہی۔ دوسرے اصناف سخن کیساتھ صنف مرثیہ بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا چنانچہ اس دور میں بھی ہمیں ہر دو طرح کے شاعر نظر آتے ہیں ایک تو وہ جنھوں نے دوسرے اصناف کے ساتھ ساتھ صنف مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی اور دوسرے ایسے شعراء بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے سوائے مرثیہ گوئی کے کسی اور صنف پر طبع آزمائی نہیں کی۔ حافظ رضی الدین کا شمار بھی ان ہی شعراء میں ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی بیجا نہ ہوگی کہ یہ وہ دور ہے جبکہ دکنی مرثیے کی مجلسوں میں اثر انداز ہو رہے تھے اور اس وقت تک دبستان لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا کوئی ذکر نہیں تھا

یعنی دکن کے مراثی شمال تک اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔

رضی: ــــ حافظ رضی الدین نام رضی تخلص کرتے تھے۔ اس دور کے مرثیہ نگار شعراء میں اہمیت رکھتے ہیں۔ مصنف "دکن میں اردو" نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ رضی کے نو مراثی اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں شامل ہیں۔ یہ تعجب خیز امر ہے کہ سوائے گلشن گفتار کے دکن کے کسی تذکرہ نگار نے اپنے تذکرے میں انہیں جگہ نہ دی۔ مراثی میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ مندرجہ اشعار بعنوان مرثیہ ہی دستیاب ہوتے ہیں لیکن اشعار میں باہمی ربط نہ ہونے کے سبب اسے سلام ہی قرار دیا جائیگا۔

؎ غم سوں ہے بیقرار میرا دل — دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم میں ہے شہداں کے — لالۂ داغدار میرا دل
نت شہیداں کے زخم غم سیں — شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جوں سستے — تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے — ہو کے غم کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضی — کیوں نہو پر غبار میرا دل [1]

اس دور کے مشہور و معروف مرثیہ نگار شعراء میں امامی برہان پوری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

---

[1] دکن میں اردو — از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۳۴

اماقی:— ہربان پور کے رہنے والے تھے چنانچہ اماقی ہربان پوری کہلائے جاتے ہیں۔ عہد آصف جاہی کے ان مرثیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے صرف مرثیہ کی صنف پر ہی طبع آزمائی کی۔ مرثیہ گوئی کے علاوہ دوسری اصناف پر کبھی اپنا قلم نہیں اٹھایا۔ انداز بیان بہت ہی مؤثر ہے۔ بقول نصیرالدین ہاشمی ان کے مرثیے اورنٹیل یونیورسٹی کی بیاض میں ملتے ہیں۔ انکے مراثی میں ہمیں ساقی نامہ بھی ملتا ہے۔ اماقی کے مرثیے مثلث اور مربع دونوں ہیئت میں بھی ہمیں ملتے ہیں۔ سفارش حسین رضوی دو مرثیے میں اسطرح رقم طراز ہیں کہ اماقی کے ۱۱۷ مراثی ملتے ہیں جن میں سے ۳۸ اشعار مثلث کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ غزل کی ہیئت میں انکے سلام نظم ہیں

محشر میں جب محمدؐ شاہِ زمن اوٹھیں گے — سب انبیائے مرسل پیر حزن اوٹھیں گے
حیدرؑ علی لوہو سوں آلودہ تن اوٹھیں گے — لیئے لوہوتے کپاں ہے حسنؑ اوٹھیں گے
آلودہ خاک وخوں میں دندانِ مصطفےٰ لے — لوہو سوں تر بتر سب دستار مرتضےٰ سے
ٹکڑے حسنؑ کے دل کے جامہ حسینؑ کے لے — تربت سے فاطمہؑ جب لے لوہرن اوٹھیں گے
دریائے غم میں ہرگز مرنا نہیں غواصی — ہر چند تو اماقی عالم منی ہے عاصی
امید توقوی ہے پائے گا تو خلاصی — کرتے کلیں شفاعت جب پنجتنؑ اوٹھیں گے

۱؎ دکن میں اردو — نصیرالدین ہاشمی — ص ۴۴۷

ہاشم علی بھی اسی دورِ آصفیہ کا شاعر ہے۔ اسی نے روحی، قادر، مرزا کے بقید حیات نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا تھا۔

؎ ہزار حیف نہیں شاعرانِ دکن
سو روحی و مرزا و قادر نہیں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہاشم علی کا دور ان شعراء کے مابعد کا ہے

ہاشم علی: ـــــ یہ بھی برہان پور سے تعلق رکھتا تھا۔ بلند پایہ مرثیہ نگار شعراء میں اسکا شمار ہوتا ہے۔ "تذکرۂ مرثیہ نگارانِ اردو" میں امیر علی جونپوری اسکا دور سنہ ۱۲۱۰ھ بتاتے ہیں اور نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف "دکن میں اردو" میں اسکے سنہ ۱۱۶۹ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ اسکی شہرت اور اسکی عقیدت کا اندازہ ہم اسطرح لگا سکتے ہیں کہ بقول نصیر الدین ہاشمی اسکے مرثیے سننے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ صلعم خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اڈنبرا یونیورسٹی میں اسکے مراثی بصورت بیاض موجود ہیں جسکا نام اسنے دیوانِ حسینی رکھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ اس دیوان میں ہر ہیئت پر مشتمل ہیں۔ مربع، مخمس اور بہ ہیئت غزل وغیرہ۔ بعض مصنفین نے اسے ولی دکنی کا ہم عصر قرار دیا ہے

مندرجہ اشعار سلام قرار پاتے ہیں

؎ ہوا پھر کو محرم کا مہینہ — نبیؐ کی آل کا ٹوٹا سفینہ

سدھارا تشنہ لب فردوس کوں وہ — جہاں میں کوئی نہ تھا جسکا قرینہ

سلیمان تخت کو چھوڑا ہے روتا — گرا خاتم نبیؐ کا جب نگینہ

سکینہؑ نے کہا وہ دن نہ آئے — جہاں میں بے پدر ہو مجھکو جینا

یہہ دشت کربلا ہے ہائے بابا — کہاں مکہ کہاں جد کا مدینہ [1]

اسکے صرف اور صرف مرثیہ گو شاعر ہونے کا ثبوت خود اسکے ایک شعر سے ملتا ہے

؎ ہاشم علی ہمیشہ ثنا خواں ہے شاہ کا

جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں

بقول سفارش حسین رضوی مصنف "اردو مرثیہ" اسکے اشعار کی تعداد سات ہزار سے زائد ہے جو اس دور کے اعتبار سے خاصی ہے۔ وہ مرزا گولکنڈہ کے بعد طویل مرثیہ نگاری میں ہاشم علی ہی کا نام لیتے ہیں

اس دور کے مرثیہ نگار شعراء میں برہانپور سے تعلق رکھنے والے شعراء زیادہ ملتے ہیں جس سے برہانپور اور اورنگ آباد میں مرثیہ و سلام نگاری میں ارتقاء کا بخوبی

---

[1] مقالہ اردو مرثیہ کا ارتقاء — از سلطانہ بیگم جامعہ عثمانیہ — ص ۴۳

اندازہ لگایا جا سکتا ہے

نظر بھی اسی عہد کا شاعر ہے۔

نظر: نام سید محمد علی تھا اور رنگ آباد کے متوطن تھے سوائے منشی کریم الدین کے تذکرے طبقات الشعراء کے دکن کے کسی اور تذکرے میں انکا ذکر نہیں ملتا۔ اورنگ آباد کے مشہور شعراء میں انکا شمار ہوتا تھا ہر ہفتہ مشاعرہ منعقد کیا کرتے۔ مندرجہ سلام غزل کی ہیئت میں نہیں بلکہ مربع میں ملتا ہے

؎ یاراں ہزار حیف رسولؐ خدا نہیں ۔ اور فاطمہؑ علیؑ و حسنؑ مجتبیٰؑ نہیں

تنہا حسینؑ رن میں کوئی آشنا نہیں ۔ بازو نہیں، رفیق نہیں دلربا نہیں

اڑ پچھاڑ کھا کے اوٹھے بول سب جنے ۔ بابا ترا شہید ہو پونچا ہے حق کنے

سوگند ہے خدا کی ترا پایہ جگ منے ۔ ذرّا نہیں، دریغ نہیں حسرتا نہیں

اصغرؑ کوں شہ نے گود میں لیکر منگے جو نیر ۔ ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر

بیداد کیا کیا تری تقصیر یو صغیر ۔ سیانا نہیں، زبان نہیں دست و پا نہیں

کہنے لگا ہے جب سوں الم کے نظم میں بیت ۔ دنیاں کوں دل سوں مٹ کے تول بول اس الم میں بیت

دو جگ منے نظر کوں بجز حب اہلبیت ۔ قصد نہیں، مراد نہیں، مدعا نہیں ؎۱

؎۱ اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۱۲۸

اورنگ آباد کے مرثیہ نگار شعراء میں مبتلاؔ کا نام بھی شہرت کا حامل ہے قبل ازایں جن شعراء کی سلام گوئی کا تذکرہ کیا گیا وہ صرف وہی شاعر تھے جنھوں نے رثائی شاعری کے علاوہ دوسری اصناف سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ لیکن ہم ایسے شعراء کے تذکرے کو پیش کرتے ہیں جنھوں نے دوسرے اصناف کیساتھ ساتھ سلام پر بھی توجہ کی۔

مبتلاؔ: ـــــ الفت علیخاں نام اور مبتلاؔ تخلص کرتے تھے۔ اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ اسد علیخاں تمناؔ کے قریبی دوست اور ہمعصر تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار جو پیش کئے گئے ہیں باہمی ربط نہ ہونے کی بناء پر سلام قرار پاتے ہیں۔

؎ غم کوں کملائے سب چمن کے گل — بلکہ جل گئے جو کدن کے گل
حیف یاراں کیوں گئے کملا — مصطفےٰؐ کے انجمن کے گل
مبتلاؔ اس دوکھ میں روتا — ہر کروستے یونین کے گل [1]

اس عہد کی مرثیہ نگاری کا اندازہ ہم اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ غیر مسلم شعراء نے بھی صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی جنمیں ذرّہؔ اور شفیقؔ قابل ذکر ہیں۔

ذرّہ: ـــــ بالک جی ترمبک نام اور ذرّہ تخلص کرتے۔ صاحب دیوان شاعر مانے جاتے تھے۔ برہان پور سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ کہ زبان بہت سادہ لیکن پر اثر ہے مرثیہ اپنے تمام اجزاء کی پوری پوری پابندی کرتا ہے

---

[1] اردو مرثیہ۔ سفارش حسین رضوی ص ۱۴۲

تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قصیدہ ان کے ہاں نہیں ملتا۔ آپکا شمار اعلیٰ درجہ کے مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے مرثیہ نگاری میں بھی ہر ہیئت کو انہوں نے برتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں ذرّہ سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ تک انکے بقید حیات رہنے کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کا دور حکومت تھا۔ برہانپور سے اورنگ آباد آکر سکونت اختیار کی چنانچہ سراج اورنگ آبادی کے تلامذہ میں نظر آتے ہیں لیکن یہ بذات خود سراج اورنگ آبادی کے شاگرد نہ تھے بلکہ رسا انکے استاد ہیں جنکا ذکر وہ اپنے کلیات میں اکثر کرتے ہیں۔ نہ صرف ذکر کرتے ہیں بلکہ اسپر فخر کرتے ہیں جسکا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے

ذرّہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے
مضموں کا اسکے رنگ پڑا ہے رسا کے ہاتھ

ذرّہ نے صنف غزل کے علاوہ صنف مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی چنانچہ دو یا تین چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہمیں ذرّہ کے نام سے نظر آتی ہیں۔ کلیات سے متعلق جناب سفارش حسین رضوی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں انکے تعاقب سے متعلق لکھتے ہیں کہ

بالک جی ترمبک نایک ذرّہ کا کلیات حیدرآباد کے
سرکاری کتب خانہ میں ہے جسے دیکھنے کے بعد کوئی اسے

غیر مسلم تو الگ رہا، غیر شیعہ بھی نہیں مانے گا۔ [۱]

مندرجہ اشعار کو سفارش حسین غزل کے بتاتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غزل کے اشعار کا یہ عالم تو مرثیہ کا اندازہ کیا ہوگا۔ [۲] لیکن یہ اشعار غزل سے زیادہ سلام کے معلوم ہوتے ہیں۔

؎ خدا کو صورتِ انساں میں دیکھا — علیؑ کو منظرِ قرآں میں دیکھا

تصورِ حسنِ حسینؑ اور شہِ حسنؑ کا — سراپا سورۂ رحمٰن میں دیکھا

خیالِ فاطمہؑ کو میں نے دل میں — تو بسم اللہ الرحمٰن میں دیکھا [۳]

متذکرہ بالا شعراء جنوبی ہند یعنی دکن سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہدایت اللہ ہدایت جنوبی ہند سے نہیں بلکہ شمالی ہند سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد از آں حیدرآباد آکر یہیں قیام کیا جعفر شمس العلماء کی سرپرستی حاصل رہی۔ ہجو اور قصائد دونوں کہا کرتے تھے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ قصائد میں ہدایت اور ہجو میں رفیق تخلص کیا کرتے تھے۔ قصائد میں چونکہ آنجہانی کے عہد کے حالات درج ہیں اسی لئے کلام تاریخی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔

---

[۱] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۲۳

[۲] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۲۴

پدم شری علی جواد زیدی ابتدائی دور کی سلام گوئی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"ابتدائی سلاموں میں شیخ ہدایت اللہ ہدایت

(م۔ قبل ۱۱۵۱ھ کا مندرجہ سلام ملتا ہے)" ۱؎

؎ السلام اے صاحب محراب و منبر السلام — السلام اے صاحب سلمان و قنبر السلام

السلام اے سبط احمدؐ نور چشم مرتضیٰؑ — درمیاں در رزم گہہ افتاد پیکر السلام

السلام اے آنکہ بر نوک سناں شد راس تو — قرۃ العین بتولؑ و جان شبرؑ السلام ۲؎

ہدایت اللہ چونکہ شمالی ہند سے تعلق رکھتے تھے شائد یہی وجہ تھی کہ پدم شری علی جواد زیدی انکا شمار شمالی ہند کے شعراء میں کرتے ہیں اور اسی لئے اسے ابتدائی سلام قرار دیتے ہیں۔

دکن میں ایسے شعراء کے سلام بھی ملتے ہیں جنکے تفصیلی حالات پردۂ اخفاء میں ہیں لیکن جنکا تذکرہ، تذکرۂ شعرائے دکن اور تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو میں ملتا ہے لیکن دکن میں اردو میں ان شعراء کا تذکرہ نہیں ملتا جن میں معجز، اور نوا دکنی شامل ہیں چونکہ ان دونوں شعراء کے بھی سلام ہمیں ملتے ہیں اسی لئے روا قمتہ الحروف نے انکا تذکرہ کر دینا ہی مناسب سمجھا کیونکہ سفارش حسین رضوی

۱،۲؎ رسالہ العلم دو ماہی مرثیہ و سلام نمبر جو ۹۳ء مدیر علی جواد زیدی مضمون سلام کا ارتقائی سفر ص ۱۴

نے ان شعراء کا ذکر اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں کیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اگرچہ ان شعراء کا تذکرہ نہیں کیا لیکن باوجود اسکے

"یورپ میں دکنی مخطوطات" میں سلام کے اشعار ملتے ہیں

معجز :— نام اور مقام کا پتہ نہ چل سکا

؎ نبیؑ کے نور عین پر کہو درود و سلام — علیؑ کے سرو چمن پر کہو درود و سلام

اسیر درد و محن پر کہو درود و سلام — شہید سرخ کفن پر کہو درود و سلام

ہمیشہ مصرعہ معجز رہو از ایں غم ناک — شہ زمین و زمن پر کہو درود و سلام [1]

ندا دکنی کا شمار بھی ان ہی شعراء میں ہوتا ہے جنکے تفصیلی حالات کا علم

نہیں ہوتا لیکن باوجود اسکے اسکا نمونہ سلام ملتا ہے

ندا :—

؎ اولاً محبوب رب العالمینؑ اوپر سلام — اس حبیب اللہ ختم المرسلینؑ اوپر سلام

خشک لب، خستہ جگر، تشنہ دہن، مغموم جاں — سر بریدہ کشتۂ شمشیر کیں اوپر سلام

بعد ازاں کہہ اے ندا ہر روز و شب دلسے مدام — شاہ کے قبہ مبارک اور زمیں اوپر سلام [2]

آصف جاہی عہد کے نامور شعراء میں کاظم علیخاں کاظمؔ کا بھی شمار ہوتا ہے

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو امیر علی جونپوری ص ۴۵۷ بحوالہ یورپ میں دکنی مخطوطات

[2] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو امیر علی جونپوری ص ۴۸۷ " "

جسکا تذکرہ تقریباً ہر مصنف نے آصفجاہی دور کے سلسلے میں کیا ہے۔ کاظم کا شمار نہ صرف آصفجاہی دور کے شعراء میں ہوتا ہے بلکہ یہ اس دور کے امراء میں سے تھے بعد ازاں حیدر دلال کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

کاظم علی خاں کاظم :۔ ضمیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ "حیدر آباد کے ایک صاحب ذوق امیر زادے تھے"[۱۵]

"انکا کلیات جو سنہ ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا ہے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کلیات میں عام دواوین کی ترتیب کے خلاف زمانہ تصنیف کی ترتیب سے نظمیں، غزلیں، مرثیے اور مثنویاں وغیرہ درج ہیں۔ کلام میں آورد اور تصنع نہیں بلکہ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے"[۱۶]

مشہور و معروف مرثیہ گو شاعر تھا۔ غیر مرثیہ گو شعراء نے بھی جب محض اعتقاد کی بنا پر تحفۂ درود و سلام پیش کیا ہے تو مرثیہ گو شعراء کا سلام نہ کہنا تو بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً کاظم نے بھی سلام ضرور کہے ہونگے لیکن افسوس کہ یہ دستیاب نہ ہو سکے۔ بالکل اسی طرح اس دور کا ہم شاعر احسان ہے۔ اسکا بھی مرثیہ تو ملتا ہے لیکن سلام مل نہ سکا۔

---

۱۵ دکن میں اردو ضمیر الدین ہاشمی ص ۴۲۱

آصفجاہی عہد سے تعلق رکھنے والے شعراء میں مرزا علی نقی خاں ایجاد کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ایجاد :- نام علی نقی تھا عرف نقد علی اور ایجاد تخلص کرتے تھے۔

مرقع سخن جلد دوم میں میر سعادت علی رضوی کا ایجاد سے متعلق تفصیلی مضمون ملتا ہے جسکے مطابق ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایجاد آصفجاہ اور ناصر جنگ شہید کے عہد میں یہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے جسکے صلے میں نقد علیخاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ برہانپور سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۸۵ھ میں انہوں نے وفات پائی لیکن انکی نعش کربلائے معلیٰ روانہ کی گئی جہاں پر وہ دفن ہوئے جسکی آرزو وہ اپنے قصیدہ کے ایک شعر میں اسطرح کرتے ہیں۔

؎ ہے ابتداء سیس اس کوں شہادت کی آرزو
مدفون کربلا میں کرو وقت انتہا

تذکرہ نگار ایجاد کو ایک بلند پایہ شاعر مانتے ہیں۔ مادری زبان فارسی تھی لیکن فارسی کے علاوہ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے علاوہ منقبت، قصیدہ اور مناجات سبھی لکھا کرتے تھے۔ کلام کتب خانہ سالار جنگ

میں محفوظ ہے۔

بہ سلسلۂ ایجاد امیر علی جونپوری اپنے تذکرے اردو مرثیہ نگاروں میں ایک سلام پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ میر حسن نے اپنے تذکرے "تذکرہ شعرائے ہندی" میں بھی ایک علی نقی نامی شاعر کا ذکر کرتے ہیں جو لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے، جنکا تخلص محشر تھا۔ ایک سلام پیش کیا گیا ہے لیکن علم نہیں کہ یہ کونسے علی نقی کا ہے

جب کربلا میں پہنچے وہ سرورِ شہیداں — مارے یزیدیوں نے بیعت کا قول برہم
نوروز تک رکھا آلِ نبیؐ کو پیاسا — واں ابنِ سعد ملعوں لشکر کوں لا فراہم
اس قوم بے حیا کو وہ حجت الٰہی — اول کئے انہوں کے نامے دکھا کے ملزم
الزام پا کے پھر بھی قتل و محاربے پر — باندھے کمر ستم میں سارے گروہ اظلم
لشکر میں زورِ بازوئے باس کا علم تھا — انکو کئے سرفراز حضرت نے دیکے پرچم
قاسمؑ کی کتخدائی قسمت میں تھی دلہن کی — یہ شادی اس غمی میں جلوہ کئے بہت کم
اب تک بھی آسماں ہے خونِ شفق سے گریاں
محشر تلک رہیگا روئے زمیں پہ ماتم [1]

نوازش علیخاں شیدا بھی بحیثیت مرثیہ گو مشہور و معروف شاعر تھے۔ مراثی تو ملتے ہیں مگر سلام نہیں ملتا۔

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — امیر علی جونپوری ص ۱۳۵

عہد آصف جاہی میں اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے شعراء میں سراج اورنگ آبادی ہیں جو تقریباً اس دور کے آخری شاعر ہیں۔

؎ تجھ مثل سراج بعد ولی
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

ایک دیوان ریختہ کا ملتا ہے جسمیں تقریباً پانچہزار اشعار ہیں جو صرف پانچ سال میں تیار ہوا۔ درویش صفت اور پاکباز انسان واقع ہوئے تھے۔ ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک مثنوی "بوستان خیال" بھی ہے جو ۱۱۷۳ھ میں مکمل ہوئی۔ اسکے علاوہ کسی اور دیوان کا پتہ نہیں، لیکن رسالہ "العلم" مرثیہ و سلام نمبر میں جناب رفعت رضوانہ صاحبہ اپنے مضمون "دیوان سلام سراج" کے عنوان کے تحت سراج کے دیوان سلام کا انکشاف کیا ہے جو انہیں کتب خانہ مخطوطات آصفیہ میں اردو مخطوطات کی فہرست سازی کے دوران جو انکے سپرد کی گئی تھی "دیوان سلام سراج" جسکا مخطوطہ نمبر (۲۵۷۵) ہے اسمیں ردیف وار سلام ہیں جسمیں جملہ (۱۰۱) سلام ہیں۔ رفعت رضوانہ صاحبہ اس دیوان کو دیکھکر یہ اندازہ قائم کرتی ہیں کہ سراج کوئی پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے، کیونکہ بہت کم شعراء نے سلام کے ردیف وار دیوان مرتب کئے ہیں۔ ردیف وار سلام کا دیوان مرتب کرنے والے شعراء کے نام گنواتے ہوئے لکھتی ہیں کہ خلیق، دلگیر میر انیس اور مرزا دبیر نے ردیف وار سلام کے دیوان مرتب کئے ہیں لیکن

اس سلسلے میں مداح کا دیوان سلام "جو گنجینہ آخرت" کے نام سے موسوم ہے
اور جو ۱۲۱۵ھ میں شائع ہوا ہے جسکا انہوں نے تذکرہ بھی کیا -

مداح کا ذکر ہمیں تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد دوم میں ملتا ہے
امیر علی جونپوری مداح کا نام خان بہادر سید اولاد حسین رضوی اور وطن
بھرت پور بتاتے ہیں لیکن زیادہ تر قیام آگرہ میں ہوا کرتا تھا سن پیدائش
سنہ ۱۸۲۶ء اور سن وفات سنہ ۱۳۲۳ھ ہے - مرزا دبیر کے شاگرد تھے - امیر علی جونپوری
نے بھی انکی سلام گوئی کا ذکر کرتے ہوئے اور نمونتاً ایک سلام بھی پیش کیا ہے -

القصہ رفعت رضوانہ صاحبہ اس نتیجے پر نہیں پہنچیں کہ یہ سراج کون ہیں؟
وہ اردو شاعری کے تین شاعر المتخلص بہ سراج کا تذکرہ کرتی ہیں جو درج ذیل ہیں -

۱ - مولوی سراج الدین سراج باشندہ ضلع فریدپور مقیم ضلع مرشدآباد
۲ - سراج الدین دکنی بعض تذکروں میں انکا نام "قمر علی" بتایا گیا ہے
۳ - سراج الدین علی شاہ اورنگ آبادی درویش تھے -

انکے علاوہ ایک اور سراج الدین پانی پتی ہیں، جو کریم الدین مصنف
"طبقات شعرائے ہند" کے والد ہیں انکی کہی، تین، آبدار نسخے میں دیوان سلام سراج شامل ہیں
ہے - چنانچہ سراج کا پتہ لگانا بالبتہ ہی مشکل امر ہے -

بہرحال سراج کا کلام جذبات عقیدت اور والہانہ جذبات سے معمور ہے -

سراج اپنا سخن مثل گہر غلطاں
ثنائی شہ ہے مقبول خاص و عام ہوا

رفعت رضوانہ صاحبہ سراج کے دکن میں قیام پذیری اور اہلِ دکن سے اپنے کلام کی قدر ناشناسی کے تعلق سے کچھ اشعار حوالے کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

؎ بے آبرو ہیں ملک دکن میں سراج ہم — یاں گوہرِ سخن کا کوئی قدرداں نہیں

کیا پوچھتے ہو حال زمانے کا اے سراج — ہو بے کمال، اہل ہنر اس دکن میں ہے

سراج اب کس طرح قدر سخن ہو — جہاں میں مبتلا عنقا قدرداں ہے[۱]

ان اشعار سے سراج کا دکن میں قیام پذیر رہنا تو واضح ہو جاتا ہے لیکن انکے ذریعہ ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ آیا یہ مستقل دکن ہی کے متوطن تھے یا کچھ دن انہوں نے دکن میں قیام کیا تھا۔ سلام کی زبان تو بالکل عام فہم ہے۔

؎ دیر شہر پیمبر علیؑ ہے — جو در نرخفی ہے یہاں منجلی ہے

مجھے ظلمت قبر سے کیا ہو پروا — میری شمع مرقد ولائے علیؑ ہے

پئے حفظ دیں نقش ہے نام حیدرؑ — مرا قلب گویا کہ نادِ علیؑ ہے

بھروں کیوں نہ دم شق حیدرؑ کا ہر دم — مرے آب گل میں ولائے علیؑ ہے

ثنائے علیؑ سے چمن ہے طبیعت — زباں اپنی ہر دم شگفتہ کلی ہے

نہیں تشنگی قیامت کا دھڑکا — وہاں ساقی آب کوثر علیؑ ہے

بشر سے بھلا اسکا کیا وصف ہووے — خدا خود ثنا خوانِ مولا علیؑ ہے

سراج اپنا آقا شہ ہر دو عالم
جو کعبہ میں پیدا ہوا وہ علیؑ ہے[۲]

---

[۱] رسالہ العلم مرثیہ و سلام نمبر مدیر علی جواد زیدی۔ مضمون دیوان سلام سراج رفعت رضوانہ ص ۱۹۳

بہرحال سراج اورنگ آبادی کے بعد دکن کے مشہور و معروف شعرا و شمالی ہند یعنی دہلی پہنچے گئے جہاں پر کہ اردو شاعری کا رواج ہی نہ تھا، جبکہ دکن میں اسکا آغاز ہو کر تین سو سے زائد صدیوں کا عرصہ گزر چکا تھا۔ دکنی شعرا کی دہلی اور شمالی ہند کے شعرا کی دکن میں آمد و رفت کے سلسلے کا آغاز اسطرح ہوا کہ جب اورنگ زیب نے دکن کو فتح کیا تو شمالی ہند کے لوگ دکن آئے اور دکنی شمالی ہند پہنچے۔ بالکل اسی طرح دکن کے شعرا بھی اپنے کلام کیلئے دہلی پہنچے جہاں پر کہ اردو کلام کو [illegible] اور یہی شمالی ہند کے شعرا کے لئے نمونہ بنا جاہے وہ مرثیہ ہو یا کوئی اور صنف۔

صنف مرثیہ سے متعلق ڈاکٹر سید موسوی نے اپنی تصنیف "دکن میں مرثیہ اور اور عزاداری" میں لکھتی ہیں کہ قلی خان شاہی کے مرثیے بھی شمالی ہند پہنچے جبکہ یہ قلی خان شاہی نہیں بلکہ درگاہ قلی خان ہیں کیونکہ قلی خان کے نام سے بھی دکن میں دو شعرا گذرے ہیں جن میں سے ایک قلی خان شاہی ہے تو دوسرا درگاہ قلی خان

قلی خان شاہی کا تذکرہ قبالہ ہذا کے دوسرے باب میں ۱۷ ویں صدی تک کے شعرا میں کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی تصنیف "دکنی ادب کی تاریخ" صفحہ ۱۰۱، ۱۱۰ پر شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شمالی ہند کے شاعر فارسی زبان میں طبع آزمائی کرتے کرتے تھک چکے تھے اسلئے کہ فارسی ایک غیر زبان تھی اسمیں انھیں کوئی شہرت بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی اسلئے انہوں دکنی زبان کو گلے لگایا اور اسے

قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا۔

اردو شاعری میں ریختہ گوئی کے آغاز پر میر کے اس شعر سے روشنی پڑتی ہے

؎ خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

وہ لوگ جو شاعر نہیں تھے باوجود اسکے باذوق تھے۔ وہ جنوبی ہند کی بیش بہا تصانیف کیساتھ دہلی پہنچے جسکے نتیجے میں شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ شعراء میں ولی اورنگ آبادی کا کلام بے حد مقبول ہوا۔ ولی اورنگ آبادی نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا اور جس بار یہ اپنے دیوان کیساتھ گئے تو شمالی ہند کے شعراء کو بے حد متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دبستان شاعری دکن سے دہلی منتقل ہو گیا، کیونکہ شمالی ہند کے شاعر اردو شاعری میں خاصی دلچسپی لینے لگے۔ کئی شعراء نے ولی کا تتبع کیا۔ جو شعراء براہ راست طور پر ولی سے متاثر ہوئے ان میں حاتم اور آبرو کے نام بھی شامل ہیں۔

اگر حاتم نے خود اپنی مرثیہ گوئی کا تذکرہ "دیوان زادہ" کے دیباچے میں نہ کیا ہوتا تو ہم انھیں مرثیہ گو شاعر ہی نہ مانتے۔ سفارش حسین اپنی تصنیف میں "دیوان زادہ" کا اقتباس پیش کرتے ہیں جسمیں حاتم خود اپنی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتا ہے

"از فکر قدیم و جدید کہ از مذاق ماضی و حال از و خبر دہد، از ہر ردیف دو سہ غزلے و از ہر غزل دو سہ بیتے و رائے مناقب و مرثیہ و مخمس و مثنوی وغیرہ" [1]

---

[1] اردو مرثیہ از سفارش حسین، ص ۲۱۲، ۲۱۳، بحوالہ "دیوان زادہ"

حاتم اور آبرو، ولی اورنگ آبادی کے ہمعصر شعراء تھے چنانچہ یہ کہنا بھی نامناسب نہیں کہ ولی کی بدولت ہی دہلی میں مرثیہ گوئی کا چرچہ ہوا چنانچہ فضل علی فضلی کی طویل مثنوی دہ مجلس (کربل کتھا) ملتی ہے جو ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی جو تفصیلی طور پر واقعات کربلا پر مبنی ہے۔

ضمیر اختر نقوی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" ص ۴۳، ۴۵ میں اپنے خیال کا اظہار اسطرح کرتے ہیں کہ باقاعدہ شاعری اور ساتھ ہی مرثیہ نگاری کا آغاز بھی محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت سے ہوا۔ لیکن ان سے قبل کے مرثیہ نگار شعراء کا ذکر بھی ہمیں دکھنی تذکروں میں ملتا ہے لیکن انکا نمونۂ کلام ہمیں نہیں ملتا۔ ضمیر اختر لکھتے ہیں کہ محمد شاہی عہد حکومت سے قبل کے مرثیہ نگار شعراء کے کلام میں ہندی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت ملتی ہے لیکن عہد محمد شاہی کے شعراء کے کلام میں عمومی زبان نظر آتی ہے۔

اس دور کے شعراء میں علی قلی ندیم، آبرو، یکرنگ، شاہ حاتم اور آرزو شہرت کے حاصل ہیں۔

سفارش حسین رضوی نے اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں قائم دہلوی کو پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیا ہے جسے محمد شاہ بادشاہ سے قبل کا شاعر بتلاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسکی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ قائم دہلوی سے قبل روشن علی سہارنپوری نے روضۃ الشہداء کے انداز کی ایک طویل نظم "عاشور نامہ" کے نام سے لکھی جو ۱۱۰۰ھ میں لکھی گئی اس طرح یہ فضل علی فضلی کی تصنیف "کربل کتھا" سے ۴۵ سال قبل کی تصنیف قرار پاتی ہے

سفارش حسین کلہتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں تقریباً سو اشاعر
مرثیہ گو گزرے ہیں جنکا تذکرہ ہمیں اسلئے بھی ملتا ہے کہ یہ مشہور ریختہ گو شاعر بھی تھے
ورنہ ہمیں ان شعراء کا تذکرہ ہی نہیں ملتا جو محض مرثیہ گو ہی رہے ہیں اور صنف پر
قلم آزمائی نہ کی چنانچہ میر محمد مہدی مکین کا تذکرہ بھی ہمیں بحیثیت مرثیہ نگار نہ ملتا
اگر درگاہ قلی نے ان کا تعارف نہ کروایا ہوتا۔

درگاہ قلی خاں جو دلی کے سرہ آوردہ امیر اور عربی فارسی اور اردو
کے شاعر اور مرثیہ نگار تھے یہ بھی دہلی گئے جہاں انہوں نے اپنے سفر نامے میں
تفصیلی طور پر لکھا ہے اور ساتھ ہی اس دور کے شعراء مکین، حزیں اور عمایں
کی نشاندہی بھی کی ہے۔

اگرچہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہو رہا تھا اور یہ اپنی عمر کے
ابتدائی منازل طے کر رہی تھی لیکن اسکے باوجود تقریباً تمام شعراء کے ہاں ہمیں
سلام ملتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان سلاموں کے متون ہمیں نہ ملتے ہوں اور سلام کی
بحیثیت صنف شناخت نہ ہوئی ہو لیکن کوئی بھی شاعر ایسا نہیں جسنے بزرگ و
برگزیدہ ہستیوں اور بزرگان دین کی خدمت میں تحفۂ درود و سلام پیش نہ کیا
ہو۔ بالخصوص درگاہ قلی کے سلام جہاد و مصدمین کی خدمت میں تحفۂ درود و سلام
پیش کرتے ہیں اور جذبۂ عقیدت سے بھرپور ہیں۔

اسم گرامی درگاہ قلی خان اور درگاہ تخلص کرتے تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تخلص عموماً شاعر کے نام کے بعد ہوا کرتا ہے لیکن درگاہ درگاہ قلی کے ہاں ابتداء ہی میں تخلص دکھائی دیتا ہے۔ خاندان قلی خاں سے تعلق رکھتے تھے۔ مومن الدولہ سالار جنگ خطاب تھا۔

خاندان سر سالار جنگ کے مورث اعلیٰ گزرے ہیں۔ آصفجاہ اول کے زیر سایہ تربیت حاصل کرنیکا شرف ملا۔ آصفجاہ اول کے امراء میں انکا شمار ہوتا تھا۔ دکن کی رثائی شاعری میں خاص مقام رکھنے کے باوجود ڈاکٹر محمد چراغ علی نے اپنی تصنیف "اردو مرثیہ کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں" درگاہ قلی خاں کا تذکرہ نہیں کیا جو کہ ایک تعجب خیز امر ہے۔ اس تصنیف کے علاوہ دوسری اور تصانیف میں درگاہ قلی کی مرثیہ نگاری کا تفصیلی طور پر ذکر ملتا ہے۔ مرثیے مربع، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند ہر ہیئت میں ملتے ہیں۔

کتب خانۂ سالار جنگ میں آپکے مراثی موجود ہیں۔

خطاب پانے کے سلسلے میں نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں لکھتے ہیں کہ

بیس سال کی عمر سے آپ آصفجاہ اول کے ہمرکاب رہنے لگے

راقمتہ الحروف نے رسالہ "العلم" کے مرثیہ اور سلام نمبر میں بھی آپکے سلام پیش کئے ہیں۔

نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانے میں

آپکے مدارج میں مزید ترقی ہوئی خطاب

سے سرفراز کئے گئے" [1]

مرثیہ نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مرزا امیر علی بیگ جونپوری لکھتے ہیں:—

"زبان میں روزانی و عام فہم ہے۔ شستہ الفاظ

ہر جستہ ترکیبیں اور استعارات و محاورات بر محل

استعمال کئے ہیں" [2]

اگرچہ کہ درگاہ قلی خاں کے کئی اک سلام ہمیں کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوتے لیکن باوجود اسکے کسی مصنف نے بھی درگاہ قلی کی سلام نگاری کے تعلق سے اپنی تصنیف میں تذکرہ نہیں کیا۔ مرثیہ ہی کیطرح درگاہ قلی کے سلام بھی ہر ہیت میں ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔

راقمۃ الحروف نے درگاہ قلی جنکے سلاموں کو پیش کیا ہے وہ کتب خانہ سالار جنگ کی بیاض مراتی سے حاصل کئے گئے ہیں جو ۱۱۶۹ھ کی تصنیف ہے جن میں بہ ہیت غزل مربع، مخمس سلام ہمیں ملتے ہیں۔ درگاہ قلی نے اپنے سلاموں میں زیادہ تر چہاردہ معصومین پر تحفہ درود و سلام بھیجنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

---

[1] دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی — ص ۱۸۶

[2] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — مرزا امیر علی بیگ جونپوری — ص ۱۲۵

؎ اس روح پر فتوح پیمبر پہ فاتحہ
اس ذاتِ پاک فاتحہ خیبر پہ فاتحہ
اس بضعۃ رسول مطہر پہ فاتحہ
شبیر پر محبت شبّر پہ فاتحہ

سردار مومنین و سرافراز مسلمیں
سلطانِ فاتحین و شہنشاہِ رازبیں
سالار ساجدیں و شہیدانِ عابدیں
اس افتخارِ مسجد و منبر پہ فاتحہ

شاہنشہ سریر امامت بعلم و فضل
مسند نشینِ شرع محمد بداد و عدل
کیا افتخار اصل ہے کیا اعتبار نسل
حضرت امام باقر اطہر پہ فاتحہ

حامی دین برحق و مفتی علم حق
کیا جہد کر کے دین پہ کوں دیا نسق
بے شک و ریب علم لدنّی کا مہ صدق
مرآتِ صدق حضرتِ جعفر پہ فاتحہ

صادق کے بعد تھا خلف الصدق مقتدا

احکام دیں کا ناظم و عالم کا پیشوا

دریائے عفو کشتئ رحمت کا ناخدا

میر و امیر و بہتر و مہ تر بہ فاتحہ

سلطانِ اتقیا و شہنشاہِ اولیاء

شاہِ فلک سپاہ علی موسیٰ رضا

نو الہدا چراغ شبستانِ اولیاء

محوِ رضائے خالقِ اکبر بہ فاتحہ [1]

مندرجہ سلام بعنوان سلام ہی ملتا ہے

مندرجہ ذیل سلام غزل کی ہیئت میں ہمیں اس بیاض میں دستیاب ہوتا ہے چونکہ صنف مرثیہ ہی کی طرح صنف سلام کے لئے بھی اس عہد تک کوئی مخصوص ہیئت متعین نہو پائی تھی جسکے باعث ہر ہیئت میں ہمیں سلام دستیاب ہوتے ہیں۔ بالخصوص درگاہ قلی کے ہاں ہمیں مرثیہ ہو کہ سلام ہر ہیئت میں نظر آئیں گے چاہے کسی بھی ہیئت میں ہو وہ چہاردہ معصومین علیہ السلام کی خدمت میں عقیدتاً اپنا ہدیہ سلام پیش کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی خوبی سے کامیاب ہوتا ہے۔

---

[1] مخطوطہ بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ کتب خانہ سالار جنگ

چونکہ چہاردہ معصومین علیہ السلام کی خدمت میں ہر یہ سلام پیش کرتا ہے چنانچہ دوسروں کی بہ نسبت درگاہ قلی کے سلام کافی طویل ہیں۔

سلام بہ عنوانِ سلام (بہ ہیئت غزل)

ادب سیس فاتحہ پڑھکر کہو نبی پہ سلام
نبی کے قوتِ بازو علیؑ ولی پہ سلام

جنابِ اقدس خاتونِ حشر پر صلوات
شہید جرعۂ زہر ہلاہلے پہ سلام

شہ سریر شجاعت مہابلی پہ سلام
یتیم و بیکس و مظلوم ابن سجاد
وہ نور چشم و جگر گوشۂ علی پہ سلام

محیط علم لدنی محمد باقرؑ
پناہ روز قیامت ۔ ۔ ۔ ۔ پہ سلام

امام جعفر صادق منور ملت
شعاع آئینہ دین صیقلی پہ سلام

امام موسیٰؑ کاظم قسیم نار و نعیم
بہار نادعلی و منجلی پہ سلام

امام ضامن و ثامن گل ریاض رضا
شہ سریر زکے رضی پہ سلام

امیر و ملک سخاوت شہ جواد کریم

تقی و متقی و مہتدی نرکے پہ سلام

گل حدیقہ احسان امام ہر دو جہاں

بہار باغ ولایت علی نقی پہ سلام

حسام لشکر و صمصام خونفشاں مصاف

بر . . . . . اسلام عسکری پہ سلام

امام قائم بالحق خلیفۂ رحماں

امیر ہادی و مہدی و مہتدی پہ سلام

ادب سیں . . . درگاہ پہنچتا ہے غلام

جناب اقدس اثنا عشر ولے پہ سلام [1]

علاوہ ازایں اور سلام بھی ہمیں ملتے ہیں جو بعنوان سلام ہی ہیں۔ طوالت کے سبب صرف مطلع اور مقطع ہی پیش کیا جا رہا ہے (غزل کی ہیئت میں)

؎ سلام جسپہ کرمسیں کیا خدائے کریم

کلام خاص ہے ناطق و سلّمو تسلیم

کمینہ بندۂ درگاہ نے بصدق و خلوص

کیا ہے مسکن دار السلام کے تصمیم [2]

---

[1] مخطوطہ بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] مخطوطہ بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ کتب خانہ سالار جنگ۔

(مربع) السلام اے ساکنانِ روضۂ دارالسلام

السلام اے وارثانِ زمزم و رکن و مقام

السلام اے طوف درگاہ رفیعت التجا

بہ کمال آرزو ہے اور اسے مدعا

دل ہوا ہے کربلا کے سمت کا قبلہ نما

قبلۂ من جلد پہنچے یہ علام مستہام ۲

اک اور سلام بھی مربع کی ہیئت میں ملتا ہے

جا کہہ صبا شتاب بہ ساحت حرب سیس مجرا

جس پاس آملا تک کرتے ادب سیس مجرا

اس مظہر العجائب والانسب سیس مجرا

خیر النساء عالم قدسی لقب سیس مجرا ۲

اس کے علاوہ اور کئی سلام ملتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی ایک سلام دستیاب ہوتا ہے اگرچہ کہ مقالہ موضوع کے اعتبار سے صرف اردو زبان و ادب کی شاعری کا احاطہ ہے لیکن عربی سلام کا ذکر یہاں [illegible] کی ایک خصوصیت کی بناء پر کیا جا رہا ہے کہ یہ سلام سورۂ انا انزلنا کی آیتوں پر مشتمل ہے۔ ترجیع بند کی طرح ہر بند کے آخر میں مندرجہ اشعار ہیں۔

---

۲۶ مخطوطہ بیاض مراثی کتاب نمبر ۵ کتب خانہ سالار جنگ

بقول الانس وجن فی لیلۃ القدر

سلام ہی حتیٰ مطلع الفجر ۔ ۱

یہ عربی زبان کا بلند پایہ اور مایہ ناز سلام قرار پائے تو بیجا نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں فارسی زبان میں بھی درگاہ قلی کا کلام دستیاب ہوتا ہے جس سے ہم اس نظریہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر زبان میں اسے مہارت حاصل تھی۔

درگاہ قلی کے مندرجہ سلاموں پر نظر ڈالنے کے بعد جب ہم دہلی میں صنف سلام کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس حقیقت پر پہنچتے ہیں کہ دہلی والوں میں بھی بزرگانِ دین آئمہ اور چہاردہ معصومین پر تحفۂ درود و سلام بھیجنے کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس دور میں ہمیں نعتیہ اور رثائی دونوں طرح کے سلام ملتے ہیں لیکن کچھ شعراء جو محض مرثیہ نگار شعراء کی حیثیت مشہور و معروف تھے انکے ہاں صرف رثائی سلام ہی ہمیں ملیں گے اگرچہ کہ مسکین محض مرثیہ گو شاعر تھے لیکن باوجود اسکے انکے پاس ہمیں نعتیہ سلام بھی ملتے ہیں۔ مندرجہ قطعہ صنف سلام سے متعلق ہے اور ساتھ ہی مسکین کے جذبات عقیدت کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

اگر سلام کہوں میں قیام قدرت کا
ادائے حق نہیں شاہا تیری صحبت کا
سلام لفظ مرکب ہے چار حرف سے تیں
میں اس میں کیا کہوں کچھ حق تیری حقیقت کا ۔ ۲

---

۱ مخطوطہ بیاض مراثی کتاب بند ۔ کتب خانہ سالار جنگ ۔

۲

سکین کے اس قطعہ سے اس دور کے شعراء کے جذبات عقیدت کی مکمل عکاسی ہوتی ہے کہ شعراء جب قدت تحفۂ درود و سلام ان بزرگ ترین ہستیوں کی خدمت میں پیش کرتے تو انکا دلکا پیمانہ جذبات عقیدت سے لبریز ہوتا۔ چنانچہ "سلام" جو صرف چار حروف کا مجموعہ ہے وہ انکے جذبات عقیدت کے اظہار کا حق ادا نہ کرتا۔

میر انیس بھی اپنی ایک رباعی میں عظمت خداوندی اور مناظر قدرت کی حسن و دلکشی سے متعلق بالکل اسی طرح کے مضمون کو بیان کرتے ہیں۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر طرف تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھ سے کیا کیا دیکھوں

حاتم اور آبرو کا شمار شعرائے دہلی کے متقدمین میں ہوتا ہے۔ انکے مراثی تو ملتے ہیں لیکن سلام نہ مل سکا لیکن مصطفیٰ خاں یکرنگ کا سلام ہمیں ملتا ہے جو کہ رثائی ہے۔

مصطفیٰ خاں یکرنگ: — یکرنگ کا شمار محمد شاہ بادشاہ کے درباری امیروں میں ہوتا تھا۔ سفارش حسین کے مطابق انکا شمار خوش قسمت شعراء میں ہوتا ہے کیونکہ تذکروں میں انکی مرثیہ گوئی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ سفارش حسین نے یکرنگ کو خوش قسمت اسلئے قرار دیا ہے کہ تذکرہ نگار شعراء کی مرثیہ گوئی کا ذکر معیوب سمجھتے

تھے کیونکہ وہ مرثیہ کو صنف سخن سمجھتے ہی نہیں تھے چنانچہ ایسے شعراء جو محض مرثیہ گو ہی تھے انکا تذکرہ ہمیں کسی بھی تذکرے میں نہیں ملتا۔ یکرنگ کی زبان بالکل ہی سیدھی سادی ہے علاوہ ازیں ایک یا دو لفظ ایسے استعمال کرتے ہیں جنکا استعمال دور حاضر میں متروک ہو چکا ہے

؎ زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہیں بیابان کربلا

کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی سے مہمان کربلا

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

یکرنگ کا سلام اسلئے پیش کیا گیا کہ اٹھارویں صدی میں شمالی ہند میں سلام گوئی کی تشکیل کا جائزہ لینے میں سہولت ہو سکے کیونکہ یہ دور سلام گوئی کی تاریخ میں نوعمر کی حیثیت رکھتا ہے۔

میر عبداللہ مسکین جو محض مرثیہ نگار شاعر ہیں، لیکن اردو ادب میں درگاہ قلی نے متعارف کروایا۔ انہوں نے صرف تنہا ہی مرثیہ گوئی کے میدان کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ساتھ دو اور شاعر بھی تھے جن میں سے ایک حزیں تھے دوسرے عملیں۔ یہ دونوں بھی مرثیہ گوئی کے میدان میں مسکین کیساتھ ساتھ رہے لیکن قبولیت، عوام کا جو شرف مسکین کو حاصل ہوا وہ ان دونوں کا نصیب نہ ہوا۔

مسکین:۔ میر عبداللہ نام اور مسکین تخلص کرتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے پہلے نصف سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف مرثیہ گو کی حیثیت سے ابھرے۔ محمد شاہی عہد کے شاعر تھے علی جواد زیدی ابتدائی دور کی سلام نگاری سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"شروع کے سلاموں میں بس ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی ہے اور زبان و بیان تک کی حیثیت ثانوی ہے۔ ممدوح کیلئے عقیدت اور والہانہ محبت کا اظہار ہی اصل محرک ہے۔ دھیرے دھیرے اسمیں ادبی عناصر کی آمیزش ہوئی ہے۔ معاملات ذہنیہ یا واردات قلبیہ کا ادبی اظہار دور بعد کی ترقی۔ ہے [1]

بقول علی جواد زیدی کا یہ اقتباس (۹۰) فیصدی تو حقیقت پر مبنی ہے مسکین کے مندرجہ ذیل سلام اسکی نمائندگی کرتے ہیں۔

---

[1] انیس کے سلام — علی جواد زیدی ص ۲۱

؎ اے مدینے کے ستارے السلام — کربلا کے سر اتارے السلام [1]

؎ یا شاہ جتے تن ہی تمہیں کرتے ہیں سلام — کیا روح کیا بدن ہی تمہیں کرتے ہیں سلام [2]

لیکن مسکین کے مندرجہ ذیل سلام میں واردات قلبیہ کا کسی قدر ادبی اظہار ہمیں ملتا ہے۔ اس سلام میں اک نیا خیال بہ آل محمدؐ کی خدمت میں بہ نفس نفیس سلام نہیں بھیجتے بلکہ باد صبا جسکا گزر روزانہ محمدؐ اور آل محمدؐ کے روضوں پر ہوتا ہے اس سے اپنا سلام عقیدت ان بزرگ و برتر ہستیوں تک پہنچانے کی خواہش کرتے ہیں اور نام بہ نام ہر ایک کی شناخت ان کے اوصاف سے کرواتے ہیں۔

؎ اے باد صبا جا کے عدن میں تو گزر کر — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے ختم پیمبر

اے باد صبا پھر تو نجف میں ذرا جانا — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے ساقی کوثر

اے باد صبا گنج شہیداں میں تو جانا — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے نور پیمبر

اے باد صبا فاطمہ دکھیا کی قبر پر — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے حضرت شبر

اے باد صبا چھوٹی سی لاش بھری خون — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے حضرت اصغر

اے باد صبا مار رہے جسے بر لب دریا — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے عباس دلاور

اے باد صبا وہ جو ہے ہمشکل محمد — کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے حضرت اکبر

اے باد صبا سہرا بندھا خون میں ڈوبا

کہہ جا کے سلام اسکو جو ہے قاسم بے پر [3]

[1،2] انیس کے سلام علی جواد زیدی ص ۲۱۔

[3] حسین پر سلام مرتبہ سید علی رضوی ص ۶۷۔

اس دور کے شعراء میں غلام حسین ضاحک کا بھی شمار ہوتا ہے نہ صرف شاعر بلکہ ضاحک کو ایک بلند پایہ شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے

ضاحک :- غلام حسین اور ضاحک تخلص کرتے تھے۔ ضاحک کو میر انیس جیسے بلند درجہ مرثیہ گو شاعر کے پردادا ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔

اگرچہ کہ سنہ ۱۱۹۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن جب دہلی اجڑ گئی تو یہ فیض آباد چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ چونکہ مرزا محمد رفیع سودا کا بھی یہی دور ہے لہذا ان دونوں میں شاعرانہ چشمک ہوا کرتی۔ ضاحک سودا پر ہجویں کہیں تو ضروری تھا کہ سودا بھی ان پر ہجویں لکھیں۔ لیکن سودا اپنے صاحب ایمان ہونے کا ثبوت اسطرح دیتے ہیں کہ ضاحک کے انتقال کے بعد وہ محفل تعزیت میں شریک ہوتے ہیں اور میر حسن سے اپنے کئے کی معافی مانگتے ہیں اور اپنے دیوان سے وہ تمام ہجویں نکال کر چاک کر دیتے ہیں، جسکے جواب میں میر حسن بھی اسی عمل کو دہراتے ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب اپنی تصنیف "اسلاف میر انیس" میں لکھتے ہیں کہ "معاصر" میں میر ضاحک کے تیس ۳۰ سلام شائع ہوئے ہیں جن میں سے ایک مثنوی کی طرز کا ہے اور باقی تمام سلام غزل کی ہیئت میں ہیں۔ مسعود حسن رضوی ان تیس ۳۰ سلاموں کو مکمل طور پر تو نہیں پیش کرتے بلکہ کسی کا مطلع، کسی کا مقطع اور کسی سلام کے چند شعر پیش کرتے ہیں تاکہ ہیئت اور مفہوم کا اندازہ ہو سکے۔

وہ سلام جو غزل کی ہیئت میں ہمیں ملتے ہیں مختصراً درج ذیل ہیں۔

سلام

۱۔ سبطِ محمد شاہ شہیداں صلی اللہ علیہ وسلم — قتل ہوا با خویش و رفیقاں صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ حسین ابنِ حیدر سلامٌ علیک — حسن کے برادر سلامٌ علیک

۳۔ شاہِ اہلِ کرم سلامٌ علیک — یا امام امم سلامٌ علیک

۴۔ کہے ہے ماہِ محرم سلام لاکھ درود — حسن کو با دل پر غم سلام لاکھ درود

۵۔ سید المرسلین کو مجرا — اس امام مبین کو مجرا

۶۔ امین وحیِ خدا کے اوپر صلوٰۃ ہر دم درود پیہم
شفیع روزِ جزا کے اوپر صلوٰۃ ہر دم درود پیہم

۷۔ سید اطہر کو میری بندگی اور کورنش
شافع محشر کو میری بندگی اور کورنش

۸۔ برجِ اسد کے ماہ کو تسلیم اور سلام — زہرا کے کج کلاہ کو تسلیم اور سلام

۹۔ بنی ہاشمی صلوات تم پر — تہامی[1] ابطحی صلوات تم پر

۱۰۔ اے شہ عالی نسب تم پہ صلوٰۃ و سلام — خسرو والا حسب تم پہ صلوٰۃ و سلام
مشرق سے لے تا بغرب اور جنوب و شمال — بھیجیں عجم اور عرب تم پہ صلوٰۃ و سلام
مالک ملک عرب والی مصر حلب — ترک و حبش بولیں سب تم پہ صلوٰۃ و سلام

---

[1] تہامہ:۔ وہ خطہ جس میں مکہ معظمہ واقع ہے۔

دل سے سدا یہ غلام تمکو کہے ہے مدام — بھیجے ہے ہر روز و شب تم پہ صلوٰۃ و سلام

۱۱۔ اے شمس ذوالجلال ہمارا سلام لے — اے بدر بے مثال ہمارا سلام لے

شمس و قمر میں نور تمہارے سے مستنیر — خورشید بے زوال ہمارا سلام لے

روز ازل سے تا بہ ابد تم سا نہیں ہوا — محبوب ذوالجلال ہمارا سلام لے

کچھ قیل و قال مجھ کو نہیں آتی یا حسین — تو قبل قیل و قال ہمارا سلام لے

۱۲۔ علی عالی ولی کے اوپر درود واجب سلام سنت

نبی کے عاشق وصی کے اوپر درود واجب سلام سنت

۱۳۔ اے مصدر فیوض الٰہی سلام لے — اے زیب تاج مسند شاہی سلام لے

جتنے سیاہ پوش ہیں ماتم میں یا حسین — بختوں کے انکے دھوکے سیاہی سلام لے

میں بندۂ حسنؑ ہوں غلام حسینؑ ہوں — دیتے ہیں کل عباد گواہی سلام لے

۱۴۔ تمہارے قبہ اقدس کو یا امام سلام — کرے ہے شام و سحر مہر و مہ مدام سلام

تو وہ خدا کا ہے محبوب جسکے مجرے کو — کریں ملائک صف باندھ صبح و شام سلام

تمام جن و بشر حور عین و کل غلماں — کریں ادب سے جھک جھک علی المدام سلام

علاوہ ازایں ایک سلام درج ہے جو مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔

۱۵۔ سلام لیجئو یا شاہ کربلا میرا — سلام لیجئو اے شافع جزا میرا

سلام لیجئو اے بادشاہ ہر دو جہاں — سلام لیجئو اے نور دیدۂ امکاں

سلام لیجئو اے مصطفےٰ کے نور بصر — سلام لیجئو اے مرتضیٰ کے لخت جگر

مندرجہ بالا تمام سلام بقول سید مسعود حسن رضوی ادیب "معاصر" میں شائع ہوئے لیکن سید علی رضوی نے بھی "حسین پیر سلام میں" ضاحک کے مندرجہ سلام کو پیش کیا ہے۔

۵ قلم نے لوح پہ جب مصطفےٰ کا نام لکھا — وصی شاہ اسی مرتضےٰ کا نام لکھا

انہی کے پاس لکھا اسم حضرت زہرا — انہی پہ عصمت و عفت کو احتشام لکھا

انہی کے پاس حسن کو لکھا بہ خلق حسن — شہ سریر زبر جد بہ احترام لکھا

جو چاہا نام مبارک حسین کا لکھے — قلم سے خون بہا چہرہ لعل نام لکھا

پھر اسکے بعد لکھا نام پاک زین عباد — صبور کرب و بلا، اصبر الانام لکھا

امام ہر دو طرف باقر علوم خدا
سخی خواجۂ عالم بلا کلام لکھا [1]

---

[1] حسین پیر سلام — سید علی رضوی — ص ۷۳

سکندر بھی اسی دور کا شاعر تھا۔ مرثیہ گو بھی تھا۔ لیکن دراصل اسکا میدان عمل ضمن مرثیہ تھا چنانچہ مرثیہ گوئی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اردو ادب میں ہمیں مسدس مرثیہ کی ابتدا کے متعلق جو چار نظریات ہمیں ملتے ہیں ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ سکندر سب سے پہلا مسدس مرثیہ گو تھا۔

سکندر بن خلیفہ محمد علی نام اور سکندر تخلص کرتا، پنجاب کا رہنے والا تھا لیکن پرورش دہلی میں ہوئی۔ شاکر ناجی کے شاگرد رشید تھے۔ لیکن ضمن مرثیہ میں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ بعض تذکروں میں تذکرہ نگاروں نے اسے مسکین سے بھی زیادہ بلند پایہ شاعر بتایا ہے۔ جیسے قائم نے کہا ہے۔

"مرثیہ ہائے گفتہ دے در خاک پاک ہندوستان بلکہ
در تمام جہاں اشتہار تمام دارد" [1]

بہ سلسلہ اولین مسدس مرثیہ گو افضل حسین ثابت اپنی تصنیف "حیات دبیر" میں اسے سب سے پہلا مسدس مرثیہ گو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین بھی اس خیال کے حامی تھے چنانچہ وہ اپنی کتاب "ادب اور زندگی شاہان اودھ" میں اپنے اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے سکندر ہی کو سب سے پہلا مسدس مرثیہ گو شاعر قرار دیتے ہیں لیکن بعد ازاں وہ اپنی دوسری تصنیف "نرہم نگاران" میں اپنے اس خیال سے متفق نہیں بلکہ وہ میتن ہرہانپوری

---

[1] اردو مرثیہ — نثار حسین رضوی صفحہ ۲۲۳ بحوالہ "مجموعہ نغز"

کو سب سے پہلا مسدس مرثیہ گو شاعر قرار دیتے ہیں۔ اتفاق تو یہ ہے کہ مسدس مرثیہ گو سے متعلق جتنے بھی نظریات ملتے ہیں وہ تمام شعراء ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سکندر کے مراثی کافی معیاری ہیں۔ ہر طرح کی ہیئت میں مراثی ملتے ہیں جنھیں قبولِ عام کی سند مل چکی ہے۔ سکندر کا مشہور مسدس مرثیہ مندرج ہے

؎ ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول — اس شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول

جس محلہ میں بہم رہتے تھے حسنین و بتول — ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول

خط لیے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار

ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

پروم شری علی جواد زیدی سلام کے ارتقائی سفر کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"میر، سودا، سکندر، احسان جیسے مرثیہ نگاروں نے مربع، مستزاد، مخمس، مسدس، ترکیب بند وغیرہ شکلوں میں نسبتاً طویل مرثیے لکھ کر سلام اور مرثیے کے مابین ایک واضح خط کھینچ دیا۔" [1]

اگرچہ سکندر کی سلام گوئی کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن باوجود تلاشِ بسیار کے راقمۃ الحروف کو سکندر کے سلام دستیاب نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سکندر نے ہر ہیئت میں مراثی کہے ہیں تو اس نے سلام بھی یقیناً کہا ہوگا۔

---

[1] رسالہ العلم مرثیہ و سلام نمبر مضمون سلام کا ارتقائی سفر از علی جواد زیدی ص ۲۰

باوجود اس کے کہ سکندر نے ہر ہیئت میں مراثی کہے ہیں لیکن مصحفی اور جرأت کے ہم عصر رنگین نے ہیئت کو مخصوص شاعر کے ساتھ منسوب کیا ہے جس میں وہ مربع کو سکندر کی طرز قرار دیتے ہیں جو کہ حقیقت سے بعید ہے کیونکہ سکندر کے ہاں تقریباً ہر ہیئت ملتی ہے اور ایک نظریہ کے تحت انہیں سب سے پہلا مسدس مرثیہ گو قرار دیا گیا ہے

میر اور سودا کی عہد آفریں شخصیتیں اردو کی ادبی تاریخ کو وزن و وقار عطا کرتی ہیں۔ یہ زمانہ میر و سودا کے عہد سے موسوم ہے۔

سودا: — مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص کرتے تھے۔ انکی تاریخ پیدائش ۱۷۰۷ء سے لیکر ۱۷۱۵ء تک بیان کی جاتی ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے مروجہ علوم حاصل کئے نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان پر بھی عبور تھا بلکہ شاعری کا آغاز فارسی زبان ہی سے کیا تھا۔ شیخ چاند مصنف "سودا" شاہ حاتم کو سودا کا استاد بتاتے ہیں۔ سودا کا وطن دہلی تھا۔ یہیں پر اپنی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ انہوں نے گزارا لیکن باقی ماندہ عمر فرخ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ میں بسر ہوئی لیکن جہاں پر بھی یہ گئے انہیں شاہی تقرب حاصل رہا، اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ چنانچہ شجاع الدولہ کے عہد میں سودا کا طوطی بول رہا تھا۔

امیر علی جونپوری سودا کی شخصیت کو بہت اہم قرار دیتے ہیں اسلئے کہ

اردو مرثیہ کی ابتدا تو جنوبی ہند میں وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ شمالی ہند میں یہ صنف اپنی ارتقائی منازل کی سمت آہستہ آہستہ گامزن تھی اس "آہستہ روی" کو تاریخی موڑ عطا کرنے والی شخصیت سودا کی تھی حالانکہ سودا سے قبل شمالی ہند میں بھی اسکا آغاز ہو چکا تھا۔ درگاہ قلی، یکرنگ، مسکین اور سکندر نے رثائی ادب کی طرف متوجہ کیا تھا۔ لیکن سودا کے ہاتھوں پہنچکر صنف سلام صرف جذبات عقیدت کا نمائندہ نہیں بلکہ ادبی وزن اور وقار سے بھی ہم آہنگ ہوئی۔ دوسرے تمام اصناف کیطرح صنف سلام بھی سودا کے ہاتھوں پہنچکر ارتقائی منزل کیطرف گامزن ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سودا نے اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے صحیح راہوں کی نشاندہی کی۔

کلیات سودا جلد دوم میں انکے مراثی کی تعداد بہتر اور سلام کی تعداد بارہ مرثیہ و سلام کی تعداد سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سودا کو کربلا والوں سے کتنی عقیدت اور وابستگی تھی۔

سودا کے سلام میں تین سلام مربع کی ہیئت میں ملتے ہیں اور باقی سلام غزل کی ہیئت میں۔

سلام

؎ ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام
قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام

تو وہ امام ہے جس پر کہ روح نبیوں کی — درود بھیجے ہے دن رات صبح و شام سلام

پری و دیو و دد و آدمی جن و ملک — ہر ایک بھیجے ہے تجھ پر علی الدوام سلام

جو عرش پر ہے مخاطب یہ جبرئیل امین — ہمیشہ بھیجے ہے تیرا وہ کیلئے نام سلام

تو وہ امام ہے جس پر نماز کے بعد از — جو مقتدی ہو سو بھیجا کرے مدام سلام

قبول ہو نہ عبادات روزہ داروں کی — نہ تجھ پہ جب تئیں بھیجے مہ صیام سلام

جناب اقدس خالق سے روح کو تیری — ہمیشہ بھیجے ہے اے شاہ دیں پیام سلام

رکھیں میں بات سے تیری یہ آرزو ملکوت — کہ سرنگوں ہوں کریں کیلئے اس سے جام سلام

غرض زمیں سے تا آسمان کی خلقت تک — سبھوں پہ دیں تری بندگی ہے دام سلام

تیری وہ ذات مکرم ہے اے امام شہید — کہ تجھ پہ بھیجیں گے تا حشر خاص و عام سلام

یہ سودا عرض بہ عجز و نیاز کرتا ہے

شروع مرثیہ ہونیکو اب تمام سلام

سلام کے اس آخری شعر کی وضاحت قصائد کے قبل از ایں باب میں بھی کہی گئی ہے کہ عہد حاضر میں مرثیہ خوانی سے قبل شہدائے کربلا یا پھر آئمہ اطہار کی جو خدمت میں تحفۂ درود و سلام پیش کیا جاتا ہے۔ اسکے اولین نقوش سودا کے عہد ہی سے ملتے ہیں۔ چنانچہ سودا یہی مرثیے کے آغاز کے پیش نظر اپنے سلام کو اختتام کی منزل پر پہنچاتے ہیں

سودا کے اور سلام درج ذیل ہیں

۲۔ ؎ حسین تجھ کو یہ عرش بریں کرے ہے سلام — وہاں سے آن کے روح الامیں کرے ہے سلام

فقط نہ گردوں ہی تسلیم میں ہے تیرے خم — تجھے تو عیسیٰ گردوں نشیں کرے ہے سلام

سلام کل ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے لیکن طوالت کے سبب آخری شعر پیش ہے

تیری جناب میں ہووے قبول یا شہ دیں

ادب سے سودا الصدق و یقیں کرے ہے سلام

۳۔ ؎ کہیں ہیں ساکن جنت بزیب و زین سلام — تیری جناب میں یا حضرت حسین سلام

علی کے لخت جگر اور نبیؐ کے نور بصر — ہماری حضرت زہرا کے دل کے چین سلام

امیدوار شفاعت کا تم سے ہے سودا

قبول ایک سے ہو اسکا تا بہ عین سلام

کل ۷ اشعار

۴۔ ؎ تجھ پہ بر و رو جب کے ابر سیہ پوش السلام — بولے اسکے ساتھ برق شعلہ بر دوش السلام

ماہ ادھر دیکھا محرم کا کہ ادھر غم ترا — بولتا ہے ہو کے ہر دل سے ہم آغوش السلام

اس چمن میں جب بڑھی سودا نے تجھ اوپر صلوٰۃ

بولا اس آواز کو کر گل نے در گوش السلام

کل ۸ اشعار

۵۔ ؎ نبیؐ کے نور بصر پر ہو درود و سلام — علی کے لخت جگر پر ہو درود و سلام

کہے ہے عرش کے سکاں سے جبرئیل سدا — امام جن و بشر پر ہو درود و سلام

شجر جو باغ نبیؐ میں ہے بہتر از اشجار — اب اس شجر کے ثمر پر ہو درود و سلام

خدا کا امر ہے لے آدمی سے تا بہ ملک — سحاب دیں گے گہر پر کہو درود و سلام

ہوا ہے سبقہ سیارہ تک یہی اب حکم — کہ فاطمہ کے قمر پر کہو درود و سلام

امام برحق و مطلق پہ حق تعالےٰ کا — ہے امر شام و سحر پر کہو درود و سلام

یہ جبرئیل کا مطلب ہے یعنی اے سودا

حسین تشنہ جگر پر کہو درود و سلام

۶۔ ص — میں بھیجتا ہوں تجھے فاطمہ کے لال سلام — علی کے باغ کے اے سرو نونہال سلام

ص ۷ اشعار

صبح حور و ملک صبح و شام جنت میں — کہیں ہیں دیکھ ترا سرخ رو جمال سلام

نہیں ہے بدر ہی تجھ در پہ کچھ جبیں فرسا — تری جناب میں جھک جھک کرے ہلال سلام

غلام از دل و جاں ہے ترا جو یہ سودا

بدن کا اس کے تجھے بھیجے بال بال سلام

۷۔ ص — درۃ التاج ہل اتےٰ پہ سلام — مغنی حرف انما پہ سلام

ص ۱۹ اشعار

صدق دل سے یہ کہتا ہے سودا

ہر دم اس شاہ انبیاء پہ سلام

۸۔ ص — ہر سحر لیجا ادب سے اے صبا میرا سلام — پہنچے انکو جو میں دیں گے رہنما میرا سلام

اولاً لیجا پیمبر کے تئیں میرا درود — بعد ازاں نزد علی مرتضیٰ میرا سلام

جا کے پھر مدفن پہ اوسکے دے بصد عجز و نیاز — جو ہوا ہے کشتۂ سم دغا میرا سلام

کل ۱۳ اشعار

تجھ سے کہتا ہے یہ [illegible] اس سخن کو دمبدم
مہدی ہادی سے ہے صبح و مسا میرا سلام

اس سلام میں سودا نے کل ۱۲ اماموں کی خدمت میں تحفۂ درود و سلام پیش کیا ہے

۹۔ اے محمد کی دو عالم میں نشانی السلام — وے امام رہنما حیدر کے ثانی السلام
کہتے ہیں قرآن ناطق شیر حق کی ذات کو — اس کلام اللہ کے تم ہو معانی السلام
فخر ہے آدم کی خلقت کو تمہاری ذات سے — اے خدا کے مظہر راز نہانی السلام
بضعۃ منی کہا خیر النساء کو مصطفیٰ — اس سرور سینۂ احمد کے جانی السلام
کہتے ہیں جسکو شہادت رتبۂ اعلیٰ ہے وہ — اے امام رتبۂ اعلیٰ کے بانی السلام
عرصۂ دنیا یہ ہے سایہ تر اتار و زیر حشر — نور چشم شاہباز لامکانی السلام

دین و دنیا میں یہی امید ہے اے شاہ دیں
کر کھئے سودا پر تو اپنی مہربانی السلام

علاوہ ازیں تین سلام مربع کی ہیئت میں ملتے ہیں۔

۱۰۔ ادب سے دور ہے اسجا پہ اے محرم سلام اپنا — خدا اسمیں کے کہتا ہے جو واں عالم سلام اپنا
خدا بھیجے ہے جن اشخاص کو ہر دم سلام اپنا — کریں جز بندگی واں عرض کس منھ ہم سلام اپنا

غلامی بندگی چھٹ کہہ نہ اے سودا کچھ اسجا کہہ — کہ رتبہ ہے امامت کا کہاں اور ہے کس جا کہہ
نظر چشم عنایت کی کرے وہ مہرباں جا کہہ — سمجھ واں خاک کے ذرے سے بھی تین کم سلام اپنا

---

۱۱ بند

اس منبع حیا پہ خدا کا سلام ہے — اس معدن سخا کو خدا کا سلام ہے
اس راضی برضا کو خدا کا سلام ہے — اس شاہ دیں ملک کو خدا کا سلام ہے
سودا خموش اب کہ جگر آب ہو بہا — جز اشک بعد ازیں مری آنکھوں میں پانی نہیں رہا
جس شاہ اولیاء کا تمہیں ماجرا — اس امر اتقیا کو خدا کا سلام ہے

۱۲ بند

حسنین کے جناب کا جو کوئی غلام ہے — اس کے غلام کا یہ غلام اب مدام ہے
واں عرض بندگی کا مری صبح و شام ہے — جن کے جناب بیچ خدا کا سلام ہے
خلقی ہے کائنات جہاں زیر آسمان — تجھ پر فدا ہے تیرے خلف شاہ انس و جاں
سودا ترا غلام ہے اس شاہ دو جہاں — اس خاکپائے اہل ولا کا سلام ہے

جس طرح میر انیس اپنی شخصیت پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

سکہ ہو جیسی تمغی تیرا ذرہ ذرہ شعر
مثل زر میں نے پرتو گہر ڈھل کر دیا

بالکل اسی طرح میر اور سودا کی شخصیت پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رثائی شاعری میں ادبی شان پیدا کر کے اسے بھی دوسری ادبی اصناف کے برابر جگہ دلا دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صنف مرثیہ کو تمام اصناف پر تقدم حاصل ہے اور یہ ادبی حقیقت ہے کہ میر اور سودا کے عہد تک رثائی شاعری نے آغاز کو صدیاں بیت چکی تھیں اور نامور اور مشہور و معروف شعراء نے مرثیے اور سلام کہے تھے لیکن اسکے باوجود نہ تو

نگاروں نے رثائی شاعری کی قدر و قیمت نہ جانی اور اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ شعرا کی مرثیہ نگاری یا سلام گوئی کا تذکرہ کریں لیکن سودا اور میر کے رثائی رنگ مرثیہ کے بجائے ادب و رثا بہر رنگ مرثیہ کے نظریے پر عمل پیرا ہو کر مرثیہ و سلام کو ادبی درجے میں لا کھڑا کیا۔

میر تقی میر — اسم گرامی میر محمد تقی اور میر تخلص تھا۔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دور میں سراج الدین علیخاں آرزو سے ارتباط رہا۔ اردو اردو میں لفظ طبع آزمائی کرتے۔ صفحہ ۲۵ مطابق خان آرزو نے مرثیہ، مرثیہ سودا سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہے۔ میر کی زندگی چونکہ مصائب و آلام کا مجموعہ رہی لہذا ان کی شاعری میں درد، تڑپ، حسرت و یاس کے مضامین ملتے ہیں جس سے انکی غزل میں تاثر پیدا ہوتا ہے۔ انکی غزلوں میں اتنی تڑپ اور درد پایا جاتا ہے تو مرثیہ یقینی رنج و غم اور حسرت و یاس، تڑپ اور درد کی بہترین عکاسی کرتا ہوگا۔

میر نے مرثیہ اور سلام کہے۔ اس میں شک نہیں کہ سودا کے مقابلے میں میر کے مراثی کی تعداد کم ہے۔ انہوں نے صرف چار مرثیے لکھے لیکن میر کے مراثی میں نشتریت درد، تڑپ ملتی ہے لیکن اسے صرف رثائی حد تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے وزن اور ادبیت عطا کی۔

پروفیسر شریف علی جواد رئیسی لکھتے ہیں کہ

"ان استادوں کے ہاتھوں [illegible] ہنچکر سلام، قصیدے کی بلند آہنگی اور غزل کے گداز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ بے جھول اور صاف ستھرا انداز بیان اختیار کر لیتا ہے" [1]

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

ے اے بدخشاں نبیؐ کے لعل احمر السلام — اے گلستان علی کے لالۂ تر السلام

ے اے گل خوش رنگ گلزار شہادت السلام — تیری مظلومی کی سب دینگے شہادت السلام

ے ساقیٔ کوثر کے پیارے السلام — تشنہ لب سید ہمارے السلام

ے الوداع اے افتخار نوع انساں الوداع — بادشاہ کم سپاہ اہل ایماں الوداع

[1] مرثیہ تو میر تو کہتا ہی تھا پر اب کی یہ — کیا کہی ہے اے غمناک مژگاں الوداع

سودا اور میر نے صنف سلام کی ہیئت میں بھی تجربے کئے اور ہر ہیئت کو سلام کیلئے استعمال کیا چنانچہ مربع کی ہیئت میں بھی میر کے سلام ہمیں ملتے ہیں۔

ے اے سبط مصطفیٰؐ کے تجھ کو سلام پہنچے — اے جان مرتضیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے

اے حکم کش قضا کے تجھ کو سلام پہنچے — اے غمزدہ سرا کے تجھ کو سلام پہنچے

بیٹے، بھتیجے، پیارے یار و رفیق سارے — کوثر کے ساقی آگے کیا تشنہ لب سدھارے

پانی جوان نے مانگا سو تیر تجھ کو مارے — اے خستہ دل جفا کے تجھ کو سلام پہنچے

---

[1] العلم مرثیہ و سلام نمبر جون ۹۳ء مدیر اعلیٰ علی جواد زیدی ص 19

تو تشنہ کام و تنہا یہ رنج یہ مصیبت ۔ اے مبتلائے بلا تجھ کو سلام پہنچے

اللہ ری تیری عزت، مرحبا جو تو نے ٹھانا ۔ زنہار منفعل نہ پھیرا گو گھر گیا زمانہ

آنا ہے کس سے ایسا، بیکس ہو سر کٹانا ۔ اے دل زدہ رضائے تجھ کو سلام پہنچے

ہر سو کی تیغ لیکن تو نے نہ پیر نہ کی ۔ دریا بہا گیا پر تو نے نظر نہ کی

کیا کہئے جب تو جبہہ ہی جاں پر نہ کی ۔ کشتہ ہیں اس وفا کے تجھ کو سلام پہنچے

تسلیم کا رضا کا دیکھا ترا عجب ڈھب ۔ وقت بریدن سر سجدے میں تھا مودب

یہہ بندگی الٰہی، یہہ انکسار یا رب ۔ اے شوق کش خدا کے تجھ کو سلام پہنچے

مجلس میں گر نہ پیر تھا گر آتش کا پیالہ ۔ چھینٹیں پڑیں جو تجھ پر سب ہو گیا اجالا

غصہ کو کھا لیا تو منہ سے نہ کچھ نکالا ۔ اے صاحب حیا کے تجھ کو سلام پہنچے

تعریف سے بالا تر سید تری ایسا کا ۔ سائستہ معرکے میں تو ہی تھا اپنا جا کا

اب نقش ہے دلوں پر تیرا ثبات پا کا ۔ اے باب صبر شکر کے تجھ کو سلام پہنچے

درویشیں بے اضاعت بے میرؔ سب کو تو نے ۔ عنبر از سلام تحفہ کر تقسیم ہے کچھ وہ

ہر لحظہ اور ہر دم ہر گام اور بے گہہ ۔ اے شاہ دوسرا کے تجھ کو سلام پہنچے [1]

جنوبی ہند یعنی دکن میں تو سلام گوئی کی روایت ہمیں سولھویں صدی عیسوی سے ملتی ہے لیکن شمالی ہند تک پہنچتے پہنچتے دو صدیاں بیت گئیں۔ شمالی ہند یعنی دہلی میں سلام گوئی

---

[1] العلم مرتبہ وسلام منیر جون ۱۹۳۳ء مدیر اعلیٰ علی جواد زیدی صد ۳۰۰

کی روایت ہمیں اٹھارویں صدی سے ملتی ہے جسمیں درگاہ قلی خان کا بڑا حصہ ہے۔ شمالی ہند والوں نے اسے قبول تو کیا لیکن جوں کا توں نہیں اور نہ ہی انہوں نے دکنی سلام کی نقل کی بلکہ یہ لوگ اپنے طور پر اس پر صبح آزمائی کرنے لگے۔

سفارش حسین رضوی نے اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں اٹھارویں صدی عیسوی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں بہت کم یعنی ۱۳ مرثیہ گو شعراء کا ذکر ملتا ہے اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تعداد بڑھتے ہوئے چار گنا زیادہ ہو گئی۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس صدی کے پہلے نصف میں سلام کی ابتداء ہوئی اور دوسرے دور میں اسکا ارتقاء عمل میں آیا، یعنی بہ حیثیت صنف اسے شعری اصناف میں مقام ملا۔ ابتدائی دور میں ہمیں ہر قسم کے سلام ملتے ہیں۔ نعتیہ، منقبتیں اور رثائی وغیرہ لیکن ان تمام میں اعتقاد کی فضا چھائی ہوئی ہے لہذا شعری رنگ و آہنگ صرف موزونیت تک ہے۔ ادبی چاشنی کم ہے

شعرائے دہلی کے متقدمین میں حاتم اور آبرو سرفہرست ہیں۔ انکے مراثی تو ملجاتے ہیں لیکن سلام دستیاب نہیں۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے سلام بھی ضرور کہے ہونگے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تک رسائی ممکن نہ ہو سکی۔

عام طور پر شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد ہی سے باقاعدہ اردو شعر و ادب کی ابتداء ہوتی ہے لیکن اس سے قبل بھی کچھ شاعر ضرور ہیں جنکا کلام رثائیت پر

مشتمل ہے۔ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ شمالی ہند میں شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی شعراء کے ہاں سلام نظر آتے ہیں۔ کوئی شاعر بھی ایسا نہیں جس نے جذبات عقیدت کا نذرانہ بزرگانِ دین اور مہارر معصومین پر تحفۂ درود و سلام نہ بھیجا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدت مندی اور اعتقاد کے جذبات سے معمور ہیں۔ ان شعراء نے شہدائے کربلا اور چہاردہ معصومین کے کردار کی بلندی اور عظمت کے پیش نظر ان کی خدمت میں سلام عقیدت پیش کرنا ہی اپنا فریضہ سمجھا۔

دلبستانِ دہلی اور دلبستانِ لکھنؤ کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ دلبستان دہلی سے وابستہ شعراء نے خیال کی ادائیگی اور خیال کی گہرائی کو پیش نظر رکھا اور الفاظ کے انتخاب اور موثر انداز بیان پر زیادہ زور دیا۔ بالکل اسی طرح ابتدائی دور میں دہلوی شعراء کے کلام میں ادعیت مفقود رہی۔ والہانہ عقیدت کا اظہار اہمیت اہمیت کا حامل تھا۔ اور سلام میں زیادہ تر لفظ سلام، سلامٌ علیک، مجھ پر کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ بیشتر سلام شعراء کے اسی جذبے کے تحت لکھے گئے، جس میں نعتیہ اور ثنائیہ دونوں شامل ہیں۔ نعتیہ سلام میلاد دہلوی کے جشن کے سلسلے میں پڑھے جاتے اور ثنائی سلام ظاہر ہے کہ ایام عزا میں پڑھے جاتے تھے، جس میں عقیدت کے ساتھ ساتھ اظہارِ تعزیت بھی ہوا کرتا تھا۔

مندرجہ سلام نعتیہ سلام کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں۔

؎ سید المرسلین کو مجرا — اس امام مبین کو مجرا (ضاحک)

اے شمس ذوالجلال ہمارا سلام لے — اے بدر بے مثال ہمارا سلام لے (ضاحک)

جبکہ مندرجہ سلام رثاء پر مشتمل ہیں

؎ زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا — گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا (یکرنگ)

؎ اے مدینے کے ستارے السلام — کربلا کے سر اتارے السلام (مسکین)

؎ کربلا کے قتیل تم پہ سلام — راہ حق کے دلیل تم پہ سلام (ضاحک)

مرثیہ جسطرح ایک عرصے تک ہیئت کا پابند نہیں رہا بالکل اسی طرح سلام سلام بھی ایک عرصے یعنی اٹھارویں صدی تک ہیئت کا پابند نہیں رہا۔ شعراء نے ہر ہیئت میں سلام لکھے ہیں۔

کربل کتھا کے مؤلف اور مترجم فضل علی فضلی کے بارے میں پرم شری علی جواد زیدی تحریر فرماتے ہیں کہ

بعض شاعروں نے اچھی خاصی تعداد میں سلام کہے ہیں "کربل کتھا" کے مؤلف اور مترجم فضل علی فضلی کے بارے میں ان کے بھائی کرم علی نے لکھا ہے کہ انکو سلام گوئی سے خاص لگاؤ تھا۔ [1]

اس تعلق سے کرم علی لکھتے ہیں کہ انکو سلام گوئی سے خاص لگاؤ تھا۔

---

[1] العلم مرثیہ و سلام نمبر مدیر اعلیٰ علی جواد زیدی ص ۱۵

؎ کیا ہے صرف جو عمر اپنی تجھ محبت میں ۔ مواظبت تھی اسے اے فلک جناب سلام

یوں تو ہر ہیئت منفردہ مثلث اور مخمس میں سلام ملتے ہیں لیکن میر اور سودا کے عہد میں مربع میں سلام زیادہ ہیں۔ ان اساتذہ سخن کے عہد تک تقریباً ہر شاعر عقیدے کے تحت نبیؐ و آل نبیؐ پر تحفۂ درود و سلام بھیجتا رہا اور ادبی روایت کا آغاز میر و سودا سے ہوا۔ اس خصوصیت کی وجہ سے نہیں کیا گیا کہ وہ شہنشاہ غزل اور شہنشاہ قصیدہ تھے بلکہ اسلئے کہ سلام میں بھی سودا اور میر نے نئے نئے تجربے کئے۔ اس میں ادبی شان پیدا کی اور مضمون میں تخیل کی بلندی کا خیال رکھا اور انکے دور تک آتے آتے صنف سلام کی ادبی حیثیت آہستہ آہستہ تسلیم کیجانے لگی تھی۔ اب شعراء میں بحیثیت صنف سلام کے لئے تنقیدی شعور پیدا ہو چکا تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب یہ صنف دوسرے اصناف کے ہم پلہ قرار دی جانے لگی تھی۔

عہدِ میر اور سودا صنفِ سلام کے لیے تشکیلی حد و قرار پاتا ہے جس میں بحیثیت صنف سلام کی اپنی شناخت اور پہچان متعین ہونے لگی۔ سلام میں ادبیت کی جو بھی کمی بیشی میر اور سودا نے تکمیل کر دی اور ہر بیت میں صنفِ سلام کو پیش کر کے یہ واضح کر دیا کہ سلام ہو یا مرثیہ یہ موضوعاتی اضاف ہیں۔ ہیت کی تبدیلی ان اصناف کو متاثر نہیں کر سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ اسکے بعد صنفِ سلام کو مسدس کی ہیت مخصوص ہو گئی۔

بہرحال میر اور سودا کی ادبی کاوشیں صنفِ سلام کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں جس پر بعد کے شعرا نے خلیق اور ضمیر نے اپنی عمارتیں کھڑی کیں۔

عہدِ ضمیر و خلیق پر نظر ڈالنے سے قبل دبستانِ لکھنؤ کا سرسری طور پر جائزہ ضروری ہوگا۔ یہ کہنا کہ سلام گوئی کی روایت کو مستحکم کرنے میں متذکرہ عہد دورِ تعمیر قرار پاتا ہے جس سے اس عہد کے شعرا گداز، حسنِ ادا، فصیح اور ضمیر کے علاوہ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ مبرا نہیں ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کا قیام اسی عہد میں آیا کہ مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا بہت کمزور ہو چکے تھے جو اپنے آئے دن سیاسی اور سماجی جھگڑوں سے نبرد آزما تھا۔ ایسے حالات میں نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء (بہت پہلے) اور احمد شاہ ابدالی کا حملہ ۱۷۶۱ء (بعد میں) دہلی کی سلطنت کو آخری ضرب لگانے میں کامیاب ہوئے۔ ان حملوں کے نتیجہ میں دہلی میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہندو مسلمانوں کی قتل و غارتگری سے دہلی کی ہنستی کھیلتی تہذیب ویران ہو گئی۔ امرا و شرفا اور دیگر اہلِ فن و کمال کی روک تھام کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کو تحفظ دے سکے۔ نتیجتاً عام

بد امنی پھیل گئی جس کی وجہ سے اودھ کے شعرا دہلی چھوڑ کر دوسرے مقامات پر جانے لگے۔
یوں تو میر اور سودا کے عہد سے ہی دبستان دہلی کا چراغ گل ہو رہا تھا کیونکہ شعرا
سماجی و سیاسی حالات کے بہتیں نظر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کر رہے تھے۔ چنانچہ
میر اور سودا نے بھی دہلی کو خیرباد کہنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اب دہلی میں کوئی قدردان
سخن باقی نہ تھا، اور اسکے مقابلے میں دبستان لکھنؤ علم و ادب کیلئے گویا ایک مرکز خیر
خطے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ کہ لکھنؤ قبل ازیں سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ تھا
لیکن جب شاہان اودھ کا اقتدار کسی قدر بہم ہونے لگا تو صوبہ لکھنؤ کے صوبہ دار خود
مختار ہو گئے، اور اسطرح سلطنت لکھنؤ کا قیام عمل میں آیا جسکا آغاز سنہ ۱۱۳۲ھ م
سنہ ۱۷۲۰ء میں سعادت خاں برہان الملک سے ہوتا ہے اور اسکا اختتام سنہ ۱۲۷۳ھ م
سنہ ۱۸۵۶ء میں واجد علیشاہ کے دور پر ہوتا ہے۔ اسطرح ایک سو چھتیس سال کے عرصے
میں کل گیارہ حکمرانوں نے حکومت کی۔ یوں تو تمام حکمران نہ صرف علم و ادب کے
قدردان تھے بلکہ ان میں سے اکثر کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ بھی ایک سبب
تھا جو اجڑے ہوئے دیار دہلی کے شعرا کے لئے کشش کا باعث بنا۔ چنانچہ دبستان
دہلی کے بلند پایہ شعرا میر، سودا، میر حسن، انشاء، مصحفی وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ
چلے آئے۔ اسطرح مرقہ لکھنؤ بھی دربار دہلی کا جانشین بن گیا۔ مہاجرت نے
مجموعی امتیازی اوصاف پیدا کر دئے نہ آہستہ آہستہ شعر و سخن اور علم و فن کے
متفرد نمونے ملنے لگے، اور یہ اردو ادب میں دبستان لکھنؤ کے نام سے موسوم کیا گیا

خیال کیا میر، سودا، میر حسن، انشا اور مصحفی دبستانِ لکھنؤ کے دورِ اول کے شعرا قرار پائے ہیں جنہیں مہا جرین شعرا بھی کہا جاتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ میں شاعری کے آغاز سے متعلق رام بابو سکسینہ اپنی تصنیف "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں لکھتے ہیں کہ

"اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دلی والوں نے روشن کیا اور شاعری کا مذاق یہاں انہوں نے پھیلایا۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہ تھا۔" [۱]

مذکورہ عہد میں دبستانِ لکھنؤ صرف دو ہی اصناف کی نمائندگی کرتا ہے جن میں سے پہلی صنف غزل اور دوسری صنف مرثیہ ہے۔ واسوخت، ریختی وغیرہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔

ابتداءً صنف غزل پر ہی طبع آزمائی ہونے لگی۔ صنف مرثیہ کو دبستانِ لکھنؤ میں خصوصیت لیا تھا فروغ ہوا۔ عہدِ آصف الدولہ ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء میں رثائی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس عہد میں صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کرنے والے زیادہ تر وہی شعرا تھے جو ترکِ وطن کر کے دلی سے لکھنؤ آئے تھے۔

میر اور سودا دبستانِ لکھنؤ کے دورِ اول کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے رثائی شاعری کا آغاز کیا۔ ضمیر، خلیق، دلگیر، ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کی کاوشیں دبستانِ لکھنؤ کے دوسرے دور کی قرار پائیں جو صنف سلام کیلئے دورِ تعمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[۱] ہسٹری آف اردو لٹریچر — رام بابو سکسینہ، ص ۲۲۱

دبستانِ دہلی میں جس طرح محمد شاہ کے عہد سے باقاعدہ مرثائی شاعری ملتی ہے بالکل اسی طرح دبستانِ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد سے مرثائی شاعری ملتی ہے۔

اس دور میں شعراء کا ایک گروہ ملتا ہے جن کے کلام ان کے جذبات عقیدت کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہیں۔

پدم شری علی جواد زیدی اپنے رسالے میں مرثائی اور منقبتی ادب سے متعلق رقمطراز ہیں کہ

"دلّی میں بہادر شاہ ظفر کا دور اور لکھنؤ میں ضمیر و خلیق کا دور لٹتی ہوئی سرکاروں کا دور تھا اس دور میں منقبتی اور مرثائی ادب اپنے عروج کو پہنچا۔" [1]

لکھنؤ میں مرثیے کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں اپنی تصنیف اردو مرثیے کا ارتقاء ابتدا سے انیس تک" میں مرثیے کے آغاز و ارتقاء کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ تصنیف کے دوسرے باب میں مرثیے کے دورِ آغاز کے تحت حیدری اور گداز کا ذکر ملتا ہے تو خلیق و ضمیر فصیح اور دبیر کا تذکرہ دورِ تعمیر کے تحت کرتے ہیں۔

---

[1] رسالہ "علم" مرثیہ و سلام نمبر جون ۱۹۷۳ء مضمون "سلام کا ارتقائی سفر" ص ۲۱

میر حیدری: ــــ میر حیدری کے سلسلے میں، اکثر تذکرہ نگار غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ جن میں بقول آثر حیدری کشمیری مولوی کریم الدین، نصیر حسین خیال، ثابت لکھنوی اور ڈاکٹر میسح الزماں بھی شامل ہیں۔ ان سبھوں نے میر حیدری کو حیدر یا حیدر شاہ دکنی قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ

"میر حیدری کو مولوی کریم الدین، نصیر حسن خیال، ثابت لکھنوی اور ڈاکٹر مسیح الزماں وغیرہ نے غلطی سے قوم دکنی حیدر یا حیدر شاہ سمجھ لیا ہے حالانکہ کسی تذکرے سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حیدر یا حیدر شاہ دکنی مرثیے بھی کہتے تھے۔ مسیح الزماں صاحب کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے حیدر یا حیدر شاہ دکنی کو اودھ کا پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیا۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ شاعر کا نام حیدر تھا یا حیدر شاہ اور پھر انہوں نے غلط فہمی کے عالم میں حیدر یا حیدر شاہ دکنی کو سبک جنبش قلم اودھ کا میر حیدری تسلیم کیا، اور انکا زمانہ ۱۰۲۷ھ / ۱۶۱۷ء تا ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء مقرر کیا ہے"۔ [۱]

ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری، مولوی کریم الدین اور سید افضل حسین ثابت لکھنوی کے بیان کو ڈاکٹر مسیح الزماں کی غلط فہمی کا سبب قرار دیتے ہیں کہ پہلے تو وہ "حیات و ہنر" میں سکندر اور سودا کو پہلے مرثیہ گو شاعر قرار دیتے ہیں پھر بعد میں نصیر حسین خیال کے بیان کی اپنی رائے بدلتے ہوئے حیدری کو پہلا مرثیہ گو شاعر قرار

---

[۱] اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء — ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری — ص ۲۴۷

دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اب مجھے نواب نصیر حسین خاں خیال
کے عنایت نامہ سے معلوم ہوا کہ یہ فخر حیدری مرثیہ گو
شاعر کو ہے جو ان دونوں صاحبوں (سکندر اور سودا)
سے تقریباً سو برس پہلے گزرا ہے اور جو ولی دکنی کا معاصر ہے"[1]

نصیر حسین خاں خیال کے اس عنایت نامہ کی بنا پر ثابت لکھنوی کی رائے کی تبدیلی کا سبب بھی کریم الدین کا تذکرہ ہی بتاتے ہیں۔

میر حیدری کی بحث بہت ہی گنجلک ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری مولوی کریم الدین کی اس غلط فہمی کا سبب علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے تذکرہ گلزار ابراہیم کو قرار دیتے ہیں لیکن خلیل کے ہاں حیدر دکنی کی مرثیہ گوئی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جس کے تعلق سے ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری اپنی تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ

"مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں دکنی حیدر یا حیدر بادشاہ قادری کا ترجمہ تو لکھا ہے لیکن انہوں نے اپنی طرف سے انکو مرثیہ گو شاعر کہا ہے اور اودھ کے میر حیدری کے ایک مرثیہ کا انتخاب کیا اور حیدری کا تصور کر کے طبقہ سوم کے شعر میں درج کیا ہے دراصل یہ ایک ہی مرثیہ کا انتخاب ہے جو اودھ کے شاعر میر حیدری کے مرثیے کا ہے۔ میر حیدری کا یہ مرثیہ ۳۴ بند پر مشتمل ہے اور اس کا ایک قلمی اور

---

[1] حیات دبیر افضل حسین ثابت لکھنوی ص ۱۱۷ بحوالہ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء

غیر مطبوعہ نسخہ جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے
میں محفوظ ہے۔ یہ ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء کا مکتوب ہے" [۱]

مولوی کریم الدین نے نصیر حیدری کے سلسلے میں خلط ملط کیا ہے۔ نام حیدر یا حیدر شاہ بتاتے ہیں جسے دکنی قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اسے مرثیہ گو بھی بتاتے ہیں جبکہ چراغ علی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ کا ارتقاء" گولکنڈہ اور بیجاپور میں حیدر یا حیدر شاہ نامی کسی شاعر کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں کل تین حیدر نامی شعراء کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے پہلا شاعر محمد حیدر ہے جسنے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" میں تین سو شعر کا اضافہ کیا ہے۔ دوسرا شاعر جسکا نام فقیر اللہ تھا اور حیدر تخلص کرتا تھا جو حافظ شجاع الدین کا مرید تھا جسنے دو مثنویاں لکھیں۔ "تناول" ۱۲۴۴ھ میں لکھی گئی "نظم النوادر" دو ہزار سے زیادہ اشعار پر مبنی مثنوی ہے اس شاعر کی مرثیہ گوئی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

تیسرا شاعر حیدر سید حیدر بادشاہ قادری ہے جو ۱۲۹۸ھ میں تولد ہوا۔ پہلے ہاتف اور توفیق سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن بعد ازاں ضامن کنتوری سے اصلاح لینے لگے۔ شاعری میں صنف غزل کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی نے انکی کسی اور صنف کا تذکرہ نہیں کیا گویا انکے بھی مرثیہ گو ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری ڈائرکٹر آرکائیز آف انڈیا کی رائے میں یہ تینوں حیدر ایک ہی شاعر کے مختلف ادوار ہیں۔

"تعجب کی بات ہے کہ مسیح الزماں نے بھی اپنے
تحقیقی مقالے میں مولوی کریم الدین کی بنیاد پر دکنی
حیدر شاہ کو شمالی ہند کا میر حیدر سمجھکر اپنی پہلی
مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے" [1]

ڈاکٹر مسیح الزماں کی حیدری سے متعلق رائے پر اکبر حیدر کشمیری
اظہار تعجب کرتے ہوئے درج ذیل ہے۔

"حیدری کے بارے میں جو اندراجات
بعض جگہ ملتے ہیں انکی بنیاد پر اسے اودھ
کا قدیم ترین مرثیہ گو قرار دینا چاہیئے" [2]

آگے اکبر حیدر کشمیری لکھتے ہیں۔

"غرض یہ کہ وہ کریم الدین صاحب ہوں یا ہمارے
محترم مسیح الزماں صاحب حیدر دکنی کو حیدری
لکھنوی کہنا درست نہیں ہے میر حیدر کے بارے میں
تذکرے خاموش ہیں" [3]

---

[1] اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء — ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری — ص ۲۵۱
[2] اردو مرثیے کا ارتقاء — ڈاکٹر مسیح الزماں — ص ۱۴۷
[3] اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء — ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری — ص ۲۵۲

ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری، جہاں مولوی کریم الدین، ڈاکٹر مسیح الزماں، ثابت لکھنوی اور نصیر حسین خیال کے خیالات کی تردید کرتے ہیں وہیں پر وہ سید مسعود حسن رضوی کی رائے سے متفق نظر آتے ہیں۔ نہ صرف رضوی صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں بلکہ اسے مستند قرار دیتے ہوئے عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جو درج ذیل ہے

"حیدری کا زمانہ صراحت کیا تھا تو معلوم نہیں لیکن اسکی زبان اسکے سلاموں اور مرثیوں کی شکل انکی طوالت انکے مضامین اور انکی تاریخ کتابت سے اسکا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے سامنے حیدری کا جو کلام موجود ہے اسمیں دو سلاموں کی کتابت سنہ ۱۲۲۳ ہجری ۱۸۰۹ء میں ہوئی اور چھ مرثیوں کی کتابت بالترتیب سنہ ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ء، سنہ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء، سنہ ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۳ء، سنہ ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء اور سنہ ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء میں ہوئی۔

ان تاریخوں پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے ربع میں حیدری کا کلام مقبول ہو چکا تھا۔ دوسرے قرینے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے انکی بناء پر قیاس کہتا ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کے پہلے دور میں افسردہ، مقبل، گدا، احسان کے ساتھ حیدری کا شمار بھی ہونا چاہیئے"۔ [1]

ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری میر حیدری کے رثائی کلام سے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ

---

[1] نیا دور مطبوعہ لکھنؤ اگست ۱۹۶۳ء (حیدری مرثیہ گو)

"حیدری کے مرثیے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں جناب
سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں انکے
اکیس مرثیے ہیں۔ بیس مسدس اور ایک مربع
ہیں۔ انکے علاوہ دو سلام بھی ہیں" ۱؎

سفارش حسین رضوی مصنف "اردو مرثیہ" بھی میر حیدری کے تعلق سے
خلط ملط کرتے ہوئے میر حیدری کا نام حیدر بخش بتاتے ہیں اور انہیں دہلوی
قرار دیتے ہیں اور انہیں فورٹ ولیم کالج سے متعلقہ شخصیت حیدر بخش حیدری
قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اردو دنیا میں حیدری فورٹ ولیم کالج کے اردو
دفتر کے ممتاز منشیوں کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں
مگر اس بات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ مرثیہ
بھی کہتے تھے۔ اسکے مرثیہ سے متعلق حسینی نے اپنے
ایک سلام کے مقطع میں اشارہ کیا ہے"؛ ۲؎

بخشئے حیدری، افسردہ و احسان و گدا!
اور حسینی کو یہ سرور کے عزادار میں پانچ

میر حیدری کا دہلی سے تعلق اور حیدر بخش حیدری کا افسردہ، احسان اور

۱؎ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری ص ۲۵۳
۲؎ اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۲۸۰

گدا کا ہم عصر ہونا بعید از فہم معلوم ہوتا ہے لیکن حسینی کے مندرجہ بالا شعر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ گدا، افسردہ اور احسان کے ہمعصر تھے۔

آگے سفارش حسین لکھتے ہیں کہ

"برٹش میوزیم میں اسکے مرثیوں کا مجموعہ ہے
جسکا نام گلدستہ حیدری ہے" ۱؎

مجموعہ کے پہلے مرثیہ کا مطلع نمونتاً پیش کرتے ہیں جو کہ سلام کا مطلع ہے

؎ صلواۃ بھیجتا ہوں میں اب اس امام پر
جسنے کہ سر کٹا دیا امت کے نام پر

سفارش حسین رضوی نے بھی تاریخ پیدائش نہیں لکھی لیکن فورٹ ولیم کالج کا قیام تو ۱۸۰۰ء میں ہوا اور اسکے تمام مصنفین گویا ۱۹ ویں صدی ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی کے بیان کے مطابق حیدری کے مراثی اور سلام کی کتابت انیسویں صدی ہی میں ہوئی ہے۔ اس بناء پر شک کی بھی گنجائش ہے کہ شائد یہ وہی حیدری ہو کیونکہ ضمیر احمد نقوی اسے سکندر کا ہمعصر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"سکندر کے ہمعصر مرثیہ گو حیدری بھی اودھ کے قدیم ترین مرثیہ گو ہیں۔" ۲؎

لیکن حیدری کے قیام سے متعلق ضمیر اختر نقوی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے لکھتے ہیں کہ

۱؎ اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۲۸۰
۲؎ اردو مرثیہ پاکستان میں — ضمیر اختر نقوی — ص ۷۳

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسقدر طویل بحث کے باوجود بھی میر حیدری کی شخصیت اردو کیلئے ایک عنیر مانوس شخصیت ثابت ہوئی ہے جسکے بارے میں تمام نقاد یہ تو مانتے ہیں کہ اودھ کے قدیم ترین مرثیہ گو شاعر تھے۔ لیکن کوئی نقاد بھی انکے اصل نام، مقام اور عہد کے بارے میں مستند حوالہ پیش نہیں کر سکتا حتیٰ کہ ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری بھی حیدری کے مقام اور عہد کے بارے میں کوئی مستند حوالہ پیش نہیں کرتے چنانچہ حیدری کے تعلق سے ابھی بہت گوشے ایسے ہیں جو تحقیق طلب ہیں کیونکہ اب تک حیدری سے متعلق کسی نقاد کا کوئی ایسا بیان نہ ملا جسے حرفِ آخر قرار دیا جائے۔

گدا:-

گلشنِ حیدری، افسردہ و احسان و گدا

اور حسینی کو یہ سرورِ سخن آرا دیں داغ

حسینی کے مندرجہ شعر سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ گدا کا عہد افسردہ، احسان و حیدری سے الگ ہیں۔ میرزا گدا علی نام اور گدا تخلص کرتے تھے نام کا علم ہمیں ناسخ کے اس قطعہ وفات سے ملتا ہے

رفت چوں میرزا گدا اے علی — زجہاں سوئے سید الشہدا

سالِ تاریخ گفت دل رفتے — مرثیہ گوئے سید الشہدا ۱۲۳۴ ہجری

۲۸

ضمیر اختر لکھنوی گدا کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس عہد کے معروف مرثیہ نگار گدا صفوں نے

خاصی طویل عمر پائی جو سودا کے عہد سے ناسخ کے

عہد تک مرثیہ کہتے رہے" [1]

ضمیر اور اختر لکھنوی لکھتے ہیں کہ گدا کے ہاں ہندوستانی رسومات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ امیر علی

جونپوری مرثیہ نگارانِ اردو" میں میرزا گدا کے تعلق سے لکھتے ہیں

"اپنے وقت کے مشہور کہنے والوں میں تھے۔ فن مرثیہ

گوئی کے رموز سے واقف تھے جسکی وجہ سے آپکے مرثیے

بہت اثر اور وقت آمیز ہیں" [2]

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں — ضمیر اختر لکھنوی — ص ۷۵

[2] مرثیہ نگارانِ اردو — امیر علی جونپوری — ص ۲۱۵

"اردو مرثیہ کا ارتقاء" میں مسیح الزماں ان کا زمانہ کم و بیش ۱۷۴۵-۱۸۱۶ / ۱۱۵۸-۱۲۳۳ بتاتے ہیں گدا کے کلام میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ تشبیہوں اور استعارات کو بھی گدا نے استعمال نہیں کیا اور نہ ہی تصنع پایا جاتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے بھی گدا، افسردہ، احسان، ناظم، دلگیر اور دبیر کا تذکرہ "فسانۂ عجائب" میں دربارۂ لکھنؤ میں کیا ہے۔

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاحب ... باطن نیک، ضمیر خلیق فصیح
مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا اللہ کے کرم سے
ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان
اہل دل نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا" [1]

سید علی رضوی مصنف "حسین پر سلام" نے گدا کے سلام کا نمونہ پیش کیا ہے لیکن میرزا گدا علی کے بجائے میر گدا علی لکھا ہے۔

سلام

عاشقِ صادق ہو تم نورِ الٰہی السلام
کربلا کے دشت کے بیجاں سپاہی السلام

سر کیا در راہ دلبر تم نثار اے شاہِ دیں
جز رضا معشوق کی دیگر نہ چاہی السلام

کس کو طاقت تھی کہ اس راہِ رضا تسلیم سوں
دیکے سر اپنے کو سوئے بادشاہی السلام

دین احمد کا کیا سر دے کے تم نے استوار
جو دقیق نکتے بھی تھم اس کو سبھی السّلام
پیر تو تجھ نور کا تیرہ ذرّہ ہے گا آفتاب

دین دنیا میں نہ وہ محتاج ہو ہرگز کہیں
جس اوپر ہے تجھ کرم کے سب لگا ہی السّلام
یہ گدا ہے تجھ غلاموں کا غلام امیدوار
اسکے خط پر ہو دے تجھ شہ کی گواہی السّلام [۲] ۹

پیش رو ان خلیق و ضمیر میں صرف گدا اور حیدری کا تذکرہ کیا جائے اور مرثیہ علی بیگ افسردہ کا نام نہ لیا جائے تو یہ سراسر ناانصافی اور ادبی کوتاہی ہوگی۔

افسردہ:- مرثیہ علی بیگ نام اور افسردہ تخلص کرتے تھے۔ ایک پیرگو شاعر تھے اپنے کلام کا بیش بہا ذخیرہ مرثیہ و سلام کی شکل میں چھوڑا ہے۔ سلام کے دیوان "دار السلام" اور "باب السلام" کے نام سے ملتے ہیں۔

مسیح الزماں اپنی تصنیف "اردو مرثیہ کا ارتقاء" میں افسردہ کی مرثیہ نگاری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

ضمیر اور خلیق کے دور کے بعد افسردہ نے مرثیہ کے

---

[۱] فسانۂ عجائب — مرتب علی بیگ سرور — ص ۸۵
[۲] حسین پیر سلام — سید علی رضوی — ص ۸۷

فن کو ترقی کی منزلیں طے کرائیں، اور اپنے عہد کے ادبی

معیار کے مطابق اسمیں شاعرانہ نزاکتیں پیدا کریں" [1]

یہ جملے ان کی سلام گوئی پر بھی صادق آتے ہیں۔

افسردہ کو شاہی تقرب اسطرح حاصل کہ یہ سلطنت لکھنؤ کے تیسرے حکمران

شجاع الدولہ کی بیگم "بہو بیگم صاحبہ" کے وکیل تھے اور ساتھ ہی خزانے کے داروغہ بھی۔ عمر

کسی قدر طویل پانے کا ثبوت اکثر تذکروں سے اسطرح ملتا ہے کہ یہ غازی الدین حیدر کے

دربار میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے جسکا عہد ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء ہے

مسیح الزماں نے افسردہ کی تاریخ پیدائش ۱۱۶۴ھ م ۱۷۵۱ء اور تاریخ وفات

۱۲۵۰ھ م ۱۸۳۴ء بتائی ہے

سفارش حسین رضوی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں افسردہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"افسردہ کی مرثیہ گوئی مقصد اور فن دونوں کے اعتبار

سے کامیاب ہے، اسلئے افسردہ کو اپنے درجے کا

مرثیہ گو کہہ سکتے ہیں" [2]

افسردہ کی سلام گوئی کے تعلق سے علی جواد زیدی لکھتے ہیں کہ سلام کے دو دیوان

"دار السلام" اور "باب السلام" مرتب کئے تھے۔ انکی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دواوین

کا واحد نسخہ ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں ملتا ہے جسمیں کل ۱۱۲۹ سلام موجود ہیں۔ یہ دونوں

---

[1] اردو مرثیے کا ارتقاء — مسیح الزماں — ص ۱۰۱

[2] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۲۷۰

دیوان سلام گوئی کی روایت میں تاریخی حیثیت کے حامل ہیں سلام گوئی سے متعلق لکھتے ہیں کہ سلام کے قدیم اور روایتی انداز کے محدود دائرے کو عبور کرنیکی انہوں نے کسی حد تک کوشش کی ہے۔ سلام کا قدیم انداز جسمیں سلام خالص رثائی ہوتے اور لفظ مجرائی سے اسکا آغاز ہوتا لیکن افسردہ نے سلام میں حمد، نعت اور منقبت کو بھی جگہہ دی ہے۔ غم کی عظمت کو بیان کرتے ہیں اور شوق زیارت کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی رثائی اور بینیہ عناصر بھی ملتے ہیں۔

انکے سلام غزل کی ہیئت کے علاوہ مسدس، مربع اور ترکیب بند میں بھی ملتے ہیں۔

مندرجہ سلام مربع کی ہیئت میں ملتا ہے

سلام

سلامی جو شہ کی ثنا کر چلے — وہ سب کام اپنا بنا کر چلے
جو اس غم میں آنسو بہا کر چلے — ہر اک اسکے حق میں دعا کر چلے

یہ اسکا ہے غم اے محبو سنو — جو کہتا تھا یہ مرتے دم شاد ہو
نہیں غم ہے اب سر کوئی کاٹ لو — کہ ہم حق کا سجدہ ادا کر چلے

چلے اب چھری شوق سے حلق پر — جھکائے ہوں میں اپنا سجدے میں سر
گئے سر دیا ہوئے برباد گھر — یہ امت کو ہم بخشوا کر چلے

کہی ظالموں نے بُری یا بھلی — وہ جیسی تھی انکی انہیں تک رہی
بڑی ہم کو دولت یہ حاصل ہوئی — کہ ہمتو خدا ہی خدا کر چلے

ہماری تو اچھی کٹی زندگی — عبادت میں اوقات یاں صرف کی
رکھی چلتے چلتے خدا کی خوشی — کوئی ان سے پوچھے کہ کیا کر چلے [1]

ایک سلام مسدس کی ہیئت میں ملتا ہے جو نعتیہ رنگ میں ہے اسکی نشاندہی پدم شری علی جواد زیدی اپنے رسالہ العلم میں کرتے ہیں

سلام

ثنا خواں ہے جسکا غفور الرحیم — وہ ہے کون یعنی رسولِ کریم
مکاں جسکا ہے یار و عرشِ عظیم — وہ ہے ذات ایسی خدائے عظیم
شفیع مطاع نبی کریم
قسیم، جحیم، نعیم و سیم [2]

افسردہ کا ایک اور سلام پیش ہے

سلام

لکھو سلام شہ پہ اے دل لفظِ بسم اللہ کا — تا محمد ہو بسم اللہ مو آہ کا

---

[1] رسالہ العلم دو ماہی مرثیہ و سلام نمبر جون ۱۹۹۳ء ص ۱۳۴
[2] رسالہ العلم مرثیہ و سلام نمبر علی جواد زیدی ص ۱۳۵

کہہ درود کبریا اس مہر دیں کی شان میں — جسکے اعلائے میں ادنیٰ معجزہ ہے ماہ کا

شاہ وہ بے مثل تھا یا وہ نبی بے نظیر — جسطرف دیکھو عیاں اک نور ہے اللہ کا

شاہزادی گر نہ ہوتی فاطمہ بنت النبی — پھر کہاں دنیا میں تھا بیوند حضرت شاہ کا

جس میں دونوں تھے برابر ہم حسینؑ و ہم حسنؑ — حوصلہ یوسفؑ کو ہے جنت میں انکی چاہ کا

عرش کے دو گوشوارے شبّر و شبیر ہیں — مرتبہ یہ کون پاوے انکے عز و جاہ کا

ہو گئے مظلوم دونوں زہر و خنجر سے شہید — راز یہ عالم ظاہر ہے ہر ایک پر از حق آگاہ کا

ہیں محمدؐ سے محمدؐ تب جبھی کے رہنما — کام ان سب نے بنایا ہے خدا کی راہ کا

انکی عصمت وہ ہے جو عصمت ہے خدا کی انبیاء — جسمیں مضمون نظم ہو انکے عجز جانکاہ کا

ہو ملیں افسردہ در پر جاردہ معصوم کا
ہے اسی در پر ٹھکانہ اسی دولت خواہ کا [1]

افسردہ کے اس سلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کا سلام ہے جبکہ ان کا دیوان مرتب نہیں ہوا تھا۔ القصہ افسردہ کی یہ خواہش پوری ہوئی اور اس نے بجائے ایک کے دو دیوان سلام کے مرتب کئے جو صنف سلام کے لئے بیش بہا شاہ پاروں کے مانند ہے۔

اس دور کے مایہ ناز مرثیہ گو شعراء میں خلیق کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ یہ دور خلیق و ضمیر کے دور ہی سے اپنی شناخت کرتا ہے۔

---

[1] حسین بر سلام — سید علی حیدر نظم طباطبائی — ص ۸۷

خلیق نے خوشحال ضیب خاندان میر انیس کے کہ اسکی ہر لیٹیت سے مدح اہلبیت کو اپنا شعار بنایا اور اپنا سر دربار حسین پر جھکا کر ہمیشہ کے لیئے سرخرو ہوئے۔ بقول میر انیس

یا لجوں لیٹت ہے شبیر کی مداحی میں

اس مناسبت سے خلیق جو تھی لیٹیت کی نمائندگی کرتے ہیں میر حسن کے لڑکے اور میر انیس کے والد محترم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

میر مستحسن نام خلیق تخلص کرتے تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری گھٹی میں پڑی تھی۔ سولہ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد ازاں مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔

مصحفی اپنے شاگرد کے بارے میں اپنے تذکرے میں جو فارسی زبان میں ہے لکھتے ہیں جسکا ترجمہ پیش ہے۔ "شعر سے انکی طبیعت کی مناسبت دیکھکر ان ہی دنوں میں یہ دیا تھا کہ اگر زمانہ فرصت دیگا

تو یہ خوب کہیں گے" [1]

چونکہ شاعری گویا وراثتاً چلی آئی تھی لہذا زبان پر ملکہ حاصل تھا۔ اور انکی زبان محاورہ اور روزمرہ کے اعتبار سے لکھنؤ کی مستند زبان سمجھی جاتی تھی جسکا ثبوت محمد حسین آزاد کی عبارت سے ملتا ہے کہ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے

"زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے ہاں جایا کرو" [2]

---

[1] تذکرۃ الشعراء معروف بہ تذکرۂ ہندی — مصحفی — ص ۱۲۶

[2] آب حیات — محمد حسین آزاد — ص ۲۶۰

جسکا اعتراف میر انیس اس طرح کرتے ہیں۔

؎ حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ

؎ خلق میں مثلِ خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب

نام لے دھوئے زباں کوثر و تسنیم سے جب

خلیق کا سن ولادت تو کسی تذکرے میں نہیں ملا کہیں تاریخ وفات تقریباً ہر تذکرے میں ہے مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ

"طویل عمر پا کر لکھنؤ میں ۱۲۶۱ھ میں انتقال کیا" ؎۱

رزم نگاران کربلا میں ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں کہ

"سولہ سال کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ابتداء میں جو کچھ کہتے اپنے والد کو دکھا لیتے تھے لیکن جب ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء میں مصحفی لکھنؤ پہنچے تو میر حسن نے انہیں مصحفی کے سپرد کر دیا" ؎۲

مندرجہ عبارت سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ خلیق نے شاعری کے آغاز کے کچھ عرصہ یعنی چار یا پانچ سال بعد ہی مصحفی لکھنؤ آئے اور انہوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی اس طرح سن ولادت ۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۳ء کے درمیان قرار پاتا ہے۔

افسردہ کیطرح خلیق کے سلام کا مجموعہ بھی دیوان کی شکل میں مرتب کیا گیا۔

؎۱ مرثیہ کا ارتقاء — ڈاکٹر مسیح الزماں — ص ۱۸۷

؎۲ رزم نگاران کربلا — ڈاکٹر صفدر حسین — ص ۶۶

مسعود حسن رضوی اپنی تصنیف "اسلاف میر انیس" میں تحریر کرتے ہیں کہ

"اسکا بہت سا حصہ دیمک نے برباد کر دیا۔ جتنا محفوظ تھا وہ نقل کر لیا گیا تھا۔ اس نقل میں ۸۷ سلام تھے کچھ پورے کچھ ادھورے" [1]

مسعود حسن رضوی اس دیوان کی ضخامت اور اشعار کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"صفحات کی تعداد بہتر (۷۲) اور اشعار کی ساڑھے بارہ سو سے کچھ زیادہ تھی۔ صرف چار سلام مربع اور باقی مل سلام غزل کی شکل کے تھے۔ بعض سلاموں میں مسلسل نظم کی شان تھی۔" [2]

مندرجہ عبارت سے ہم یقین کی اس منزل پر پہنچتے ہیں کہ موضوعی اضافت کیلئے ہیئت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مربع کی ہیئت میں بھی سلام کہا جا سکتا ہے۔ مخمس اور مسدس کی بھی اور غزل کی ہیئت میں بھی جسمیں ہر شعر انفرادی حیثیت اور اپنے مقام پر مکمل معنی رکھتا ہے لیکن اسکے علاوہ اسے بھی سلام ہی کہا جائیگا جو غزل کی ہیئت میں نہیں لکھا گیا بلکہ ایک مسلسل نظم کی ہیئت میں لکھا گیا کیونکہ شاعر کا مقصد کربلا والوں کی خدمت میں سلام عقیدت پیش کرنا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ سودا اور میر سے پہلے تک سلام صرف رثائی ہوا کرتے جسکا مقصد یقیناً رونا اور رلانا ہی ہوا کرتا لیکن میر اور سودا نے صنف سلام میں ادبی شان

---

[1] اسلاف میر انیس — مسعود حسن رضوی ادیب — ص ۱۴۸

[2] اسلاف میر انیس — مسعود حسن رضوی ادیب — ص ۱۴۸

پیدا کی اور بحیثیت صنف اسے امتیاز عطا کیا۔ سودا اور میر کے بعد صنف سلام ادبی حیثیت اور ادبی شان کا حامل ہو گیا اور تقریباً ہر شاعر نے اسکی حتی الامکان کوشش کی کہ سلام صرف رثائی نہ رہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسکا ادبی مقام بھی برقرار رہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خلیق کے سلاموں میں شائد ہی اسکی پابندی کی گئی ہے۔ زیادہ تر واقعات کربلا کا بیان ہی ملتا ہے جن سے سلاموں کے مطلع بھی عاری نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خلیق کے سلاموں کا مقصد صرف رونا اور رلانا ہے جسکا ثبوت خود انکے سلام کے مقطع سے ملتا ہے۔

کیا سلام آج پڑھا تو نے پر احوال خلیق
کون سی بیت تھی دل سب کا جو تڑپا نہ گئی

اور اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ جس در سے وابستگی ہے وہ کبھی رائیگاں نہیں جائیگی اور انکا مقصد "رونا اور رلانا" میں محبوں کا رونا بھی انکے لیئے باعث نجات ہو سکتا ہے جسکا اظہار سلام کے مقطع میں اس طرح کرتے ہیں۔

؎ ہنگامۂ محشر میں خلیق آئے گا سنتا
ضائع نہیں جائے گا محبوں کا رولانا

سلام کی رثائیت سے متعلق علی جواد زیدی تحریر کرتے ہیں

"ضمیر و خلیق جبتک متقدمین کی پیروی کرتے رہے انکے یہاں دہلوی رنگ سلام نمایاں رہا۔ یہ رنگ بنیادی طور پر رثائی تھا" [1]

---

[1] رسالہ العلم مضمون سلام کا ارتقائی سفر از علی جواد زیدی صد ۲۴

لیکن ساتھ ہی یہ کھلے دل سے دوسروں کی بڑائی کا بھی اعتراف کرتے ہیں ایک سلام کا مقطع ملاحظہ ہو۔

؎ غرّہ مت کر کہنے والے شاد کے غم کے خلیق
ہو گئے ہیں اور ہوں گے تجھ سے بہتر سیکڑوں

اب کچھ مطلع ملاحظہ ہوں

؎ کیوں نہ ہو شبیر بیکس یا رب کوئی نہ ہو — کون آ مجرا کرے غم خوار جب کوئی نہ ہو

؎ سلام کر کے جو شبیر کو چلا عباسؑ — حرم پکارے ارادہ یہ کیا کیا عباسؑ

؎ میدان میں جب تیر سے مارے گئے اصغرؑ — تا دیر گئے اسکو پکارے گئے اصغرؑ

؎ صغرا یہی کہتی تھی کہ شبیر گھر آوے — یا رب میرے بابا کی شتابی خبر آوے

؎ سلام کرنیکو شبیر کے جب آئی بہن — پکاری شام کو جاتی ہے دن سے بھائی بہن

خلیق کا مقصد سلام صرف غم حسین میں رونا اور رلانا ہی نہیں بلکہ وہ کربلائے معلیٰ کی زیارت کے شوق میں بے چین نظر آتے ہیں جسکا اندازہ ہمیں انکے سلام کے ان اشعار سے ہوتا ہے

؎ حسرت مجھے آتی ہے خلیق آتا ہے کوئی — شبیر کے جب روضۂ انور کی طرف سے

؎ ہے کربلا کا شوق تو یہ یاد رکھ خلیق — پھر سوئے ہندواں کبھی جا کر نہ آئیو

یہ جذبات عقیدت اور وابستگی کا اظہار ہے جو کہ عروج پر نظر آتے ہیں۔ عمر کی آخری منزلوں میں خلیق کے سلام صرف اور صرف رثائیت ہی تک محدود نہیں ہے۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

خلیق کا عہد پیری کا کہا ہوا ایک سلام بتاتا ہے کہ آخر عمر میں ان کے سلام

واقعہ کربلا کے گریہ خیز مضامین میں محدود نہیں رہے اور عبرت و موعظت وغیرہ کے سنجیدہ مضامین بھی ان میں شامل ہو گئے،، [1]

سلام

بحرائی طبع کند ہے لطفِ بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہرِ تیغِ زباں گیا

لیکر قدِ خمیدہ کو اپنے کہاں پھریں
گوشہ ہی پھر ہے خوب جو زورِ کمال گیا

عالی پڑیں ہیں شہر میں کتنی عمارتیں
یاں کس مکیں کے ساتھ بتاؤ مکاں گیا

جھک جھک گئیں بہشت میں طوبیٰ کی ڈالیاں
جس وقت رن میں فوجِ خدا کا نشاں گیا

فضلِ خدا جو ہو نہیں کچھ بہشت دور
دیکھو نصیبِ خُر! کہ کہاں سے کہاں گیا

اترا جو سر تو حلقِ شہِ دیں نے دی صدا
شکرِ خدا کہ روش سے بارِ گراں گیا

گزری بہارِ عمرِ خلیق اب کہیں گے سب
باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا۔ [1]

شبیر کے روضے کی جدائی نہیں جاتی
اے مجرئی طالع کی برائی نہیں جاتی

فرماتے تھے جب نہر سے پیاسے پھرے حضرت
کوثر کے سوا پیاس بجھائی نہیں جاتی

یہ سبطِ پیمبر ہی کا تھا حوصلہ ورنہ
گردن تہِ شمشیر جھکائی نہیں جاتی

کہتا تھا علمدار کٹیں بازو تو کٹ جائیں
پر ہاتھ سے دریا کی ترائی نہیں جاتی

کہتے تھے حرم، ہاتھ سے سجادِ حزیں کے
گرتی ہے تو زنجیر اٹھائی نہیں جاتی

اس ظلم پہ شہ کرتے نہ تھے شکوۂ اعداء
نیکوں کے کبھی دل میں برائی نہیں جاتی

---

[1] اسلاف میر انیس — سید مسعود حسن رضوی — ص ۱۵۱

اکبر نے دمِ نزع کہا بانو سے اماں — بے جان لیئے اب اجل آئی نہیں جاتی
ہے طبع خلیق ان دنوں ہر چند مکدر — پر بندشِ مضموں کی صفائی نہیں جاتی

مجرائی بانو کہتی تھی اکبر نہ آئیو — بابا پہ بے نثار کئے سر نہ آئیو
کوفہ سے خط میں شاہ کو مسلم نے یہ لکھا — آنے میں یاں دغا ہے برادر نہ آئیو
کہتے ہیں اور کچھ تو یہ کہتے ہیں اور کچھ — لکھنے پہ ان کے نائبِ حیدر نہ آئیو
مسلم کی زوجہ کہتی تھی بیٹو لینے رن سے گھر — جب تک نہ آئیں سبطِ پیمبر نہ آئیو
مرنے کی میں ابھی سے رضا دے چکی تمہیں — پھر پوچھنے کو مجھ سے مکرر نہ آئیو
زینبؑ بلائیں لے لیکے بیٹو لینے کہتی تھی — لو واری رن کو جاؤ بس اب گھر نہ آئیو
مامول تمہیں کہیں گے کہ مل آؤ مال سے اب — تم جیتے قتل گاہ سے پھر کر نہ آئیو
حضرت نے وقتِ قتل کے زینبؑ کو دی صدا — چلتا ہے میرے حلق پہ خنجر نہ آئیو
یاں بیٹیاں ہیں فاطمہؑ زہرا کی ظالمو — ان کے سروں سے چھین لے چادر نہ آئیو
ہر کربلا کا قصد تو یہ یاد رکھ خلیق — پھر سوئے ہندواں کبھی جا کر نہ آئیو۔ [1]

یہ سلام اگرچہ مربع کی ہیئت میں نہیں بلکہ غزل کی ہیئت میں لکھا ہے لیکن اسکے باوجود اس سلام کے چند اشعار آپس میں مربوط ہیں۔ یہ کیفیت سلام بے انتہا متاثر کن اور رقت آمیز ہے۔

---

[1] بزمِ ماتم (مجموعہ سلام) — سید علی حسین — ص ۴۸، ۴۹

خلیق و ضمیر کے دور کے نامور مرثیہ و سلام گو شعراء میں فصیح بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں۔

فصیح:۔ میرزا جعفر علی نام فصیح تخلص کرتے تھے فیض آباد میں ۱۱۹۷ھ م ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ فصیح کے تعلق سے سب سے قدیم تذکرہ مصحفی کا ہے کیونکہ مصحفی نے اپنا تذکرہ "ریاض الفصحا" فصیح کے دوران حیات ہی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ قوم قریش اور اولاد عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام سے ہیں چونکہ انکے بزرگ ایران میں رہتے تھے اسلئے مرزا مشہور ہوگئے۔ انکی ماں سیدانی تھیں۔ انہوں نے جو لکھا اسپر شیخ امام بخش ناسخ سے اصلاح لی بلکہ یہ انکے شاگردوں میں سرفہرست ہیں۔ انہوں نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اور علم عروض اور قافیہ پر دستگاہ رکھتے ہیں حدیث اور دینی کتابیں انہوں نے میر دلدار علی سے پڑھی ہیں ایک بار ائمہ معصومین کی زیارت کیلئے گئے تھے۔ اب پھر اسی ارادے سے کلکتہ کی طرف گئے ہیں" [1]

زیارت کیلئے روانگی کا مستند ثبوت ہمیں فصیح کے ایک شعر سے ملتا ہے۔

؎ کربلا میں تو فصیح آیا خوشا حال تیرا
اب تو شبیر کا بحرائی بھی زوار بھی ہے

---

[1] تذکرہ ریاض الفصحاء مصحفی ص ۲۵۳

فصیح مدینہ منورہ بھی گئے تھے جسکا ذکر اس طرح کرتے ہیں

فصیح اگلے برس تھے ہم سمیر کے مدینے میں

کبھی روضے میں رہتے تھے کبھی بیت الحزن میں تھے ۔

فصیح کی عقیدت مندی کا اظہار اسطرح ہوتا ہے کہ فصیح نے ہمیشہ کیلئے لکھنؤ سے حج بیت اللہ کو ہجرت کی اور سالہا سال وہاں کے کلید بردار بھی ہوئے ۔

فصیح کا کلام فصاحت اور روانی میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیا محسوس ہوتا ہے کہ اسی فصاحت کی بنا پر ہی انہوں نے اپنا تخلص فصیح اختیار کیا۔

فصیح سے متعلق ضمیر اختر نقوی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" لکھتے ہیں

"عام طور سے خیال یہی ہے کہ میر انیس سے بہتر مرثیہ کہنے والا کوئی ہو گزرا نہیں گزرا لیکن یہ خصوصیت فصیح کے یہاں پہلے سے موجود ہے صرف عہد اور زبان کا فرق ہے" [1]

اکبر حیدری کاشمیری اپنے مضمون "اردو مرثیہ لکھنؤ میں" قبل انیس و دبیر

میں فصیح کی دو جلدیں شائع ہو سکنے کا ذکر کرتے ہیں لیکن ان دونوں کو نا پید بھی بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صفدر حسین اپنی تصنیف "رزم نگاران کربلا" میں لکھتے ہیں

"فصیح کے مراثی کی تین مطبوعہ جلدیں ہماری نظر سے گزری تھیں جن پر مطبع کا نام نہیں تھا۔ ان میں کم و بیش اسّی مراثی تھے۔ یہ مرثیے عموماً مجالس سالانہ میں زیادہ طویل نہیں تھے" [2]

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں — ضمیر اختر نقوی — ص ۸۹

[2] رزم نگاران کربلا — ڈاکٹر صفدر حسین — ص ۶۲

مراثی وسلام کی ایک جلد راقمۃ الحروف کے ہاں موجود ہے جو کہ ناقص الاول اور ناقص آخر ہے جسکی وجہ سے سن اشاعت اور مطبع کا علم نہو سکا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم نہو سکا کہ یہ جلد اول ہے یا دوم یا سوم۔ اس جلد میں مراثی کیساتھ ہی بائیس سلام بھی موجود ہیں جنکے مطلع درج ذیل ہیں۔ سب سے پہلا سلام ناقص الاول ہے جسکی بنا پر اسکا مطلع تو پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ سلام کل ۳۱ (اکیس) اشعار پر مشتمل ہے۔ اسکا گیارھواں شعر درج ہے۔

؎ قاسم نے کہا زخم کی بدھی تو پہن لوں — گردن میں پنھاوے نہ مرے ہار ابھی سے

بقیہ تمام سلاموں کے مطلع اسطرح ہیں

؎ ایام مصیبت شہ والا کے پھر آئے — اے مجرئی دن گریۂ زہرا کے پھر آئے

اس سلام کا مطلع یوں ہے

؎ افسوس فصیح آتا ہے دلمیں کہ سوئے ہند — کیوں روضۂ شبیرؑ تلک جا کے پھر آئے

سلام کے مندرجہ مقطع سے ہم یقین کی منزل پر پہنچتے ہیں کہ فصیح نے صرف اپنی عمر میں ایک ہی بار زیارت روضۂ حضرت شبیر سے مشرف نہیں ہوئے بلکہ بار بار جاتے رہے جو ان کی عقیدت مندی کی دلیل ہے۔ دوسرے سلاموں کے مقطع اس طرح ہیں۔

؎ جو کرے سلام بصد ادب شہ تشنہ لب کی جناب میں — وہ روز حشر عجب نہیں جو رواں ہو شہ کی رکاب میں

؎ مجرئی شہ کے عجب یار تھے سبحان اللہ — کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ

؎ سلامی کہتی تھی زینبؑ علی اکبر خدا حافظ — چلے ہو رن کو اے ہم شکل پیغمبر خدا حافظ

؎ سلام اسپہ جو ہے ابن بوتراب حسین — ہوا شہادت عظمیٰ سے کامیاب حسین

؎ مجرائی کیوں خدا کا ہو اگھر سیاہ پوش — اور رقبۂ مزار پیمبر سیاہ پوش

؎ مجرائی آکر پکارے در پہ سرور الوداع — ہم چلے مرنے کو اے آل پیمبر الوداع

؎ مجرا اُسے جو شاہ کا دلدار ہے سجاد — قیدی ہے مصیبت میں گرفتار ہے سجاد

؎ طفیل مدح علی ہے مرا کلام لذیذ — سلام اُسپہ جو چکھا نہ تھا طعام لذیذ

؎ مجرائی فغاں کرتی تھی ہر آن دولھن رانڈ — رنڈسالے کا پاتی نہیں سامان دولھن رانڈ

؎ سلام اسپر جو کہتی تھی آؤ اصغر جاں — وہ اپنا چاند سا مکھڑا دکھاؤ اصغر جاں

؎ حرم میں آپکو کرتا ہوں میں سلام حسین — جہاں رہوں میں تمہارا ہوں یا امام حسین

؎ مجرائی سبط پیمبر مجھے یاد آتا ہے — مراتون روتا ہوں سرور مجھے یاد آتا ہے

؎ سلامی جب ہوئی اصغر کی گردن تیر سے زخمی — تو لپٹا مسکرا کر سینۂ شبیر سے زخمی

اسطرح بقیہ سلام طوالت کے پیش نظر نہیں لکھے گئے۔

مراثی و سلام کے اس مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقیناً اسکے علاوہ بھی اور مجموعے ہونگے کیونکہ فصیح کا مشہور سلام اسمیں موجود نہیں ہے۔

سلام

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبے کے سنگ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

زمیں بالوں سے جھاڑتی ہے بتول بھیرتی ہے کرنیں

شمیمِ گیسوئے عنبریں سے تمام صحرا مہک رہا ہے

لٹا جو قاسمِ حسن کا پیار تو آنِ در حرم سب نے دیکھا

ادھر کو بیٹے تڑپ رہے ہیں ادھر کو اژدر لپک رہا ہے

حسین کہتے ہیں غائروں سے وہ حوضِ کوثر ہے تشنہ کامو

وہ حورِ ساغر لیے کھڑی ہے وہ آبِ کوثر چھلک رہا ہے

گھرے ہیں بادل سے شام کے دل کھنچی ہے حیدر کی سیفِ قاطع

گھٹا میں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے

کفن میں لپٹا ہوا ہے قاسم نہ لال سہرا نہ زرد کنگنا

سپید تحت الحنک بندھی ہے سیاہ شملہ لٹک رہا ہے

پکارے اکبر لٹو نگاہیں نکر جلائے دیتی ہے دھوپ یا رب

گرفت مشکل ہے ہاتھ بھنبتا ہے لیا قبضہ دمک رہا ہے

سکینہ پیاسی تڑپ رہی ہے پڑی ہے خاموش بنتِ مسلم

ادھر کو اصغر سسک رہا ہے ادھر کو باقر بلک رہا ہے

پکاریں زینب قیامت آئی حسین ہوتے ہیں ذبح لوگو

چھدے ہیں سجدے میں میرے بھائی قفا پہ خنجر چمک رہا ہے

تڑپ کے ہاتھوں سے ماں پھوپھی کے نکل گیا ہے حسن کا مہرو
پھٹی ہے ٹوپی کھلے ہیں گیسو بدن میں کرتا مسک رہا ہے

کہا پھوپھی نے یہ حال کیا ہے تمہارا عابد تو رو کے بولے
بدن میں لرزہ ہے تپ چڑھی ہے سحر سے ماتھا دھک رہا ہے

کہا یہ عابد نے کاش نیزہ جگر پہ لگتا تو خوب ہوتا
نہ سنتے اعدا کی تلخ باتیں کلیجہ طعنوں سے پک رہا ہے

لگن میں رکھا ہے شاہ کا سر بزیر تخت یزید فاسق
شقی کو پاس ادب نہیں ہے جو منہ میں آتا ہے بک رہا ہے

خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے
فصیح مشتاق اسقدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے [1]

کسی بھی ادبی تخلیق کیلئے ضروری ہے کہ اسمیں حرکت کا احساس ہو۔ ادبی تخلیق کسی مادی شئے کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ صرف ذہنی ہوتی ہے۔ فصیح کے اس سلام کا مطلع جسمیں حرم میں بیٹھکر سلام کا لکھنا، قلم سے زمزم کا ٹپکنا، کعبتہ اللہ کے سیاہ پردے کا سنگ در سے اپنا سر ٹکرانے کو شائد ہی کوئی مصور اپنی تصویر میں اسقدر ماہرانہ انداز میں پیش کر سکتا ہے کہیں شاعر کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ سلام مجموعی طور پر بہت سی اثر انگیز اور پر درد ہے۔ سلام کے مطلع سے بالکل اسطرح حرکت کا احساس ہوتا ہے جسطرح سودا کے اس شعر سے

---

[1] بحوالہ حسین پر سلام — سید علی رضوی — ۱۱۹۰

ے کیفیت چشم اسکی تجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

حضرت قالسم کے تعلق سے فصیح کا مندرجہ سلام بہت ہی شہرت کا حامل ہے جو مجالس میں عموماً پڑھا جاتا ہے۔ جہاں کہیں شہزادہ قالسم کی مجلس برپا ہوتی ہے وہاں پر اس سلام کا پڑھا جانا ناگزیر ہے۔

ے سلامی کربلا میں جب بنا ابنِ حسن دولھا
جو دیکھا آرسی مصحف بہت روئے دولھن دولھا

علاوہ ازاں فصیح کا ایک اور سلام جو تقریباً عام ہے

ے کفن پہنے شہ مظلوم کے انصار سوتے میں
سلامی چاند سے چہرے وہ تابندہ کفن میں تھے

قطع — فصیح اگلے برس ہم تھے پیمبر کے مدینہ میں
کہیں روضہ پہ زائر تھے کہیں بیت الحزن میں تھے

جس طرح سے خلیق کی سن پیدائش کہی تذکرے میں کبھی نہیں ملتی بالکل اسی طرح فصیح کے سنِ وفات کا صحیح اندراج کہیں نہیں ملتا۔ ہے۔

اکبر حیدری کاشمیری اسکا قیاساً سنِ وفات ۱۲۶۳ھ اور ۱۲۶۹ھ بتلاتے ہیں۔

دبستان لکھنؤ میں سلام گوئی کا آغاز اگرچہ کہ دبستانِ دہلی کے بعد ہوا بہت جاری ہی دبستانِ لکھنؤ کے شعراء نے اپنا رنگ جمایا اسی طرح اردو نثر کا آغاز نثر نظم سے پہلے ہوا لیکن

نظم کا ارتقاء نثر سے قبل ہوا۔ خلیق، فصیح، ضمیر، دلگیر جو رثائی شاعری کے چار اہم ستون قرار پاتے ہیں۔ ان میں کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کا تصور نامناسب ہے۔ انکی شاعری میں زیادہ عرصے تک دبستانِ دہلی کی رثائیت اور دبستانِ لکھنؤ کی ادبیت کا حسین امتزاج اس دور کے سلام کی انفرادیت ہے۔

ضمیر نے اردو مرثیے میں چہرے اور سراپا نگاری کا آغاز کیا۔ رزم و بزم سے بھی اردو مرثیہ آشنا ہوا۔ بحیثیت رثائی صنف سلام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ غیر محسوس طور پر سلام بھی وجود میں آئے

(۱) سوز خوان کے سلام (۲) تحت اللفظ کے سلام

ان دونوں میں نمایاں فرق یہ رہا کہ سوز خوانی کے سلام میں رثائیت اور تحت اللفظ کے سلام میں اخلاقیات اور ادبیت پائی جاتی ہے۔ عصر حاضر میں بھی سوز خوانی اور تحت اللفظ پڑھنے کا رواج برقرار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تحت اللفظ جسمیں بالکل سیدھے سادے انداز میں خواندگی ہوئی البتہ موقع کی مناسبت سے الفاظ کی ادائیگی میں آواز کے اتار چڑھاؤ کو بڑا دخل ہوتا تاکہ سامعین کو متاثر کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں آنکھ اور ہاتھ کے ہلکے سے اشارے بھی بڑے کارگر ثابت ہوتے میر ضمیر سے قبل یہ طرز خواندگی نہیں ملتا۔ میر ضمیر کے دور ہی سے اسکا پتہ چلتا ہے۔ اسکے برخلاف سوز خوانی انفرادی نہیں بلکہ افرادی ہوتی جسمیں ایک لئے کارفرما رہتی۔ یہ طرز بھی اس عہد میں مقبول عام تھی

میر ضمیر :- میر مظفر حسین نام اور ضمیر تخلص کرتے تھے۔ میر قادر علی کے لڑکے تھے۔

کم سنی ہی سے شاعری کا بڑا شوق تھا جسکا ثبوت ان کی مثنوی "مظہر العجائب" کے اشعار سے ہوتا ہے

یہہ جو ہے بندۂ فقیر حقیر — کمترین ذاکر حسین ضمیر
شعر کہنے کا اسکو شوق ہوا — سن دہ سالگی سے ذوق ہوا

ضمیر کے شوق شاعری سے متعلق سفارش حسین رضوی لکھتے ہیں

"اردو شاعری کیلئے وہ کیسی نیک ساعت تھی جب میر ضمیر کو شعر کہنے کا شوق اسلئے پیدا ہوا کہ وہ مرثیہ وسلام کہہ سکیں۔ اس غرض کو لیکر مصحفی کے پاس پہنچے۔ مٹھائی سامنے رکھی اور شاگرد ہو گئے" [1]

مندرجہ عبارت کے پہلے فقرے ہی سے میر ضمیر کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ سفارش اس گھڑی کو نیک ساعت قرار دیتے ہیں۔ سفارش حسین کا خیال ہے کہ شائد مرثیہ وسلام لکھنے کیلئے ہی ضمیر شاعری کی طرف مائل ہوئے کیونکہ ضمیر نے اردو مرثیہ میں نئے نئے اجزاء کو شامل کیا۔ یہہ بحث طلب ہے کہ ضمیر کی "طرز نوی" مرثیہ نگاری کی تاریخ میں انہیں میر کمال کے کس زینے پر متمکن کرتی ہے۔ پہلے یہہ خیال تھا کہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی ضمیر کے رہین منت ہیں۔ بعد میں تحقیق نے یہہ ثابت کیا کہ مرثیے کے بیشتر اجزائے ترکیبی دکن میں اشرف کے دور سے موجود تھے۔ [illegible] جو اردو زبان نے اپنے [illegible] ضمیر کے اجتہادات

---

[1] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۲۸۵

پر روشنی ڈالتے ہوئے مرثیوں میں انھیں سراپا نگاری کا بانی قرار دیا ہے لیکن بصد ادب یہ عرض کرنا ہے کہ مرثیوں میں نسوانی کردار کا سراپا اشرف "نوسرہار" میں پیش کر چکے ہیں۔

راقمتہ الحروف ضمیر کے سلسلے میں یہ عرض کر سکتی ہے کہ انہیں جو وراثت ملی اسے نکھار کر، سنوار کر، سجا کر اس طرح پیش کیا کہ آنیوالے دور میں انیس و دبیر، پھر تعشق، پیارے صاحب رشید وغیرہ اسے منزل کمال تک لے گئے۔

اجزائے ترکیبی کے سلسلے میں پروفیسر مسیح الزماں کا مندرجہ ذیل بیان قول فیصل ہے۔

"مرثیے کے مختلف اجزاء کا تعین ایک دن میں نہیں ہوا اور نہ اسے کسی ایک فرد کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تشکیل ارتقائی طور پر ہوئی" [۱]

ضمیر کے اکتسابات سے انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے مرثیہ اور سلام کو دور تشکیل سے دور تعمیر تک پہنچایا۔

ضمیر کے استاد مصحفی اپنے تذکرے میں میر ضمیر کی مرثیہ گوئی سے متعلق لکھتے ہیں۔

"جب یہ فقیر کی شاگردی کے حلقے میں داخل ہوئے تو اس بات کا ارادہ رکھتے تھے کہ جب شکر کہنے پر قدرت ہو جائیگی تو مرثیہ و سلام جناب سید الشہداء علیہ السلام کہا کرونگا۔ آخر ایسا ہی ہوا جب مشق سخن میں انتہا کو پہنچے تو مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا" [۲]

---

[۱] اردو مرثیہ کا ارتقاء — ڈاکٹر مسیح الزماں — ص ۴۵۴

[۲] ریاض الفصحاء — مصحفی — ص ۱۸۰

ضمیر اور ان کے معاصرین دہلوی شعرا کی پیروی کیا کرتے تھے، اور جب تک انہوں نے دہلوی سلام نگاروں کی پیروی کی ان کے ہاں دہلوی رنگ غالب رہا جس میں رثائیت کو بالادستی حاصل تھی۔ اسکی پیروی صرف خلیق اور ضمیر ہی نے نہیں کی بلکہ دبیر نے بھی کی تھی۔

ضمیر کا مندرجہ سلام اسکی نمائندگی کرتا ہے

سلام

بھری شہ نے کہا جو نہ میں بے سر ہوتا — حشر کو تاج شفاعت نہ میرے سر ہوتا
شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا آکر — دیکھتے تم کہ جواں کیا علی اصغر ہوتا
شاہ نے حرملے کہا آج جو کچھ تو نے کیا — ایسا کرتا جو حسن میرا برادر ہوتا
دیکھتیا شان علمدار جو آکر رن میں — صدقے سو جان سے عباس سا حیدر ہوتا
ہوتی خاتونِ قیامت تو قیامت ہوتی — حشر ہو جاتا اگر شافع محشر ہوتا
سوکھے تشنگی شاہ کو لوے عباس — نہر کیا بانی نہ ہم پیتے جو کوثر ہوتا
شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آبِ فرات — ہم لٹا دیتے اگر چشمۂ کوثر ہوتا

علاوہ ازیں ضمیر کا ایک اور سلام مختصر آپ کیا جاتا ہے جو سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔

سلام

بھری جسکو کہ سرور سے محبت ہوگی — وہ محبت تو کہیں در جنت ہوگی
رنگ اڑ جاتا تمہارا زینب — شب عاشورہ — تمہیں خوف کہ کل صبح شہادت ہوگی
بولے اکبر نہ میری لاش اٹھانا بابا — آپ بھر روح میں زخموں کی زیارت ہوگی

سنکلے زینب کی فصاحت کو لگا کہنے شیر ۔۔۔ ہاں یہی دخترِ شاہِ زمن قیامت ہوگی

صبح نزدیک جو دیکھی تو کہا سرور نے ۔۔۔ جوں چراغِ سحری اب میری رخصت ہوگی

کہتی تھی مادرِ عباس جو تو ہوگا شہید ۔۔۔ روح کو جلد کرتا رکے راحت ہوگی

نزع کے وقت یہ اکبر نے کہا بابا سے ۔۔۔ ہم تو اب مرتے ہیں کیا آپ کی حالت ہوگی

شہ نے خنجر کو رواں کرتا تھا اور کہتے تھے شاہ ۔۔۔ تا قیامت نہ فراموش یہ اذیت ہوگی

اے ضمیر اسلئے ہے مجھ کو تمنائے اجل ۔۔۔ بعدِ مردن مجھے حیدر کی زیارت ہوگی

میر ضمیر کی تمنائے اجل ۱۸۵۶ء میں پوری ہوئی اور وہ داعیٔ ملک عدم ہوئے اٹھارویں صدی میں لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کا جو تھا ستون دلگیر کی شخصیت ہے جو باعثِ رشک ہے کیونکہ یہ ہندو فرقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔ دینِ اسلام سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے بھی یا بغیر میراثی کا بالکل ہی ماہرانہ انداز میں لکھنا تعجب خیز امر ہے

دلگیر: ــــ نام جھنو لال تھا۔ دلگیر تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں طرب تخلص کیا کرتے تھے طرب اور دلگیر دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ طرب سے دلگیر تخلص اختیار کرنے کی وجہ سفارش حسین اسطرح بیان کرتے ہیں

"جوانی میں خوب خوب دادِ طرب لی جو تخلص سے ظاہر ہے مگر یہ مطمعِ جلدی اتر گیا اور مکر و ہات دنیا سے دل گرفتہ ہو کر دلگیر تخلص اختیار کیا" ؎۱

دلگیر سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دلیران جورِ عشق و طرب میں بہ تخلص طرب تیار

؎۱ اردو مرثیہ ۔۔۔ سفارش حسین رضوی ۔۔۔ ص ۲۸۴

ہوا تھا وہ دریائے گومتی میں بہا دیا اور توشۂ آخرت کی فکر میں لگے رہے۔ سفارش حسین رضوی نصیر حسین خیال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"دیوان جو عیش و طرب کا صحیفہ تھا بقول نصیر حسین خیال گومتی میں ڈبو دیا اور آخرت کا توشہ مرثیہ و سلام کی صورت میں جمع کرنے تل گئے" ۱؎

دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے امیر علی جونپوری انکی سن پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں

جناب مصحفی صاحب نے ریاض الفصحاء کی تالیف کے وقت انکی عمر ۲۳ سال لکھی ہے۔ جناب مسیح الزماں صاحب نے اسی کے حساب سے انکی ولادت سنہ ۱۱۹۸ھ قرار دی ہے" ۲؎

مجالس عزا میں بہ نفس نفیس شریک ہوا کرتے اور مکان پر بھی مجالس عزا منعقد کیا کرتے جس میں اکثر مرزا دبیر پڑھتے تھے۔

مراثی کی سات ضخیم جلدیں جو نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئیں ہیں جو انکے جذبۂ عقیدت کی بہترین مثال ہے جسمیں بالعموم مراثی پچاس یا ساٹھ بند پر مشتمل ہیں اور بالخصوص سوا سو بند کے مراثی بھی ان جلدوں میں موجود ہیں جن میں رثائیت از حد موجود ہے۔ مرثیوں کی تعداد سے متعلق پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری لکھتے ہیں۔

دلگیر کے مطبوعہ مرثیوں کی تعداد کوئی چار سو ہے" ۳؎

۱؎ اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۲۸۴

۲؎ مرثیہ نگاران اردو جلد اول امیر علی جونپوری ص ۲۲۷

۳؎ اردو مرثیہ سمینار مضمون اردو مرثیہ لکھنؤ میں [illegible] پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری مرتبہ شاداب ردولوی ص ۶۴

مراثی کی ضخیم جلدوں کی تفصیل وہ اسطرح بیان کرتے ہیں۔

جلد اول کل ۵۰۳ صفحات پر مشتمل ہے جس میں دو سو چھ (۲۰۶) صفحات تک سلام، خمسہ اور رباعیات ملتے ہیں اور باقی صفحات پر مراثی۔

ڈاکٹر صفدر حسین "رزم نگاران کربلا" میں دگلیر کے سلاموں کی تعداد ساڑھے تین سو بتاتے ہیں۔

سلام گوئی میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ مرثیہ کی طرح اس میں بھی رثائیت اور تاثر کو خصوصیت حاصل تھی۔ خود بھی بہت دلگیر ہو کر لکھا کرتے تھے اور ساتھ ہی سامعین کو بھی بے انتہا مغموم اور دلگیر کر دیتے تھے۔

مندرجہ بالا خوبیوں کے باوجود تقریباً تمام تصانیف میں یہی ملتا ہے کہ دلگیر کی زبان میں کلنت تھی چنانچہ وہ منبر پہ بیٹھکر مرثیہ نہیں پڑھتے تھے یا تو ان کے شاگرد پڑھتے یا کوئی سوزخوان دلگیر کے سلام کا مندرجہ شعر بے پناہ رثائیت سے بھرپور ہے بہرحال وقت آخیر بھی ہے۔ مشہور ہے کہ میر انیس کو یہ شعر بیحد پسند تھا۔ دلگیر کا سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

زخمی جو فرق خسرو خیبر شکن ہوا
ہمبر ہی گھر بتول کا بیت الحزن ہوا
تربت میں بیٹیں ہائے علی کہتے فاطمہ
فردوس میں رسول خدا کہتے حسن ہوا

جبریل کی صدا تھی کہ استاد مر گیا
کہتی تھی خلق قتل امام زمن ہوا

زینب سے آ کے شبر و شبیر نے کہا
بابا شہید راہ خدا اے بہن ہوا

تھا خون اسقدر سر اقدس سے بہہ گیا
جو زرد تھا امام کا سارا بدن ہوا

دلگیر آگے کیا کہوں طاقت نہیں مجھے
جسطرح دفن خاک شہ بوالحسن ہوا

ایک اور سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

سلامی کو جو یاد عابد دلگیر آتی ہے
تو کانوں میں صدائے نالۂ زنجیر آتی ہے

چھدی مشک سکینہ جب کہا عباس نے رو کر
بری تقدیر ہو تو کام کیا تدبیر آتی ہے

کہا بانو نے بیٹا تجھ کو دادی یاد کرتی ہے
جو ہچکی مفصل اے اصغر بے شیر آتی ہے

تیری گردش سے اکبر سا جواں مارا گیا رن میں
کبھی حسرت تیرے بھی دل میں چرخ پیر آتی ہے

رہا بس یہ تصور مرتے مرتے شاہ عالی کو
کہ اب خیمہ سے ننگے سر مری ہمشیر آتی ہے

جھپکتی تھی پلک سجاد کی ایکدم نہ زنداں میں
کسی کو نیند بھی پہنے ہوئے زنجیر آتی ہے

جو اے دلگیر میں خاک در شبیر کے ساکن
تو ان کے دھیان میں ہرگز نہیں اکسیر آتی ہے۔

شمالی ہند کی تاریخ اردو ادب پر نظر ڈالی جائے تو اردو ادب کی تاریخ کئی عہد صفحات ذہن پر ابھر آئیں گے۔ ان میں زیادہ تر عہد، شعراء کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ نثائی شاعری کی تاریخ بھی شعراء کے کئی عہد اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے ہے جیسے دہلی میں میر تقی کے دور آغاز میں فضلی، مسکین، میر اور سودا شہرت رکھتے ہیں اور لکھنؤ میں گدا، افسردہ، حیدری اور سکندر میر تقی کے دور آغاز سے وابستہ ہیں۔ بعد ازاں اس دور دور تعمیر قرار پاتا ہے اور یہ خلیق و ضمیر کے عہد سے موسوم ہے۔ خلیق و ضمیر کے بعد ہی ان کے شاگرد انیس و دبیر کے دور کا آغاز ہوتا ہے جو اردو مرثیہ نگاری کا دور عروج قرار پاتا ہے جس کے بعد نثائی شاعری کی تاریخ میں عشق و تعشق ابھرتے ہیں۔

مندرجہ بالا ہر دور کے شعراء کے سلسلہ تلمذ کو بھی اردو ادب کی تاریخ احاطہ کرتی ہے چنانچہ دبستان ناسخ، دبستان آتش، شاگردان انیس اور دبستان دبیر جیسی تصانیف ملتی ہیں۔

اردو کی سلام گوئی کے سلسلے میں دور خلیق و ضمیر کے بعد ناسخ اور شاگردان ناسخ کا سلسلہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

ناسخ اور آتش کا شمار دبستان لکھنؤ کے اساتذہ میں ہوتا ہے جس کی وجہ امداد امام اثر اس طرح بتاتے ہیں۔

"شیخ امام بخش ناسخ زبان اردو کے مصلح گزرے ہیں۔ اس اعتبار سے انکا یہ تخلص نہایت

حسبِ حال ہے۔ شیخ نے اردو کو خراشِ تراش
کر الیا درست کر دیا کہ رب اسکی لطافت اور
صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی،" ۱؎

سانحہ ہی وہ ناسخ کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"لاریب زبانِ اردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر
ممنون ہے۔ اگر جنابِ شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ
ہوتی تو زبانِ حال کی صورت پیدا نہ ہوتی" ۲؎

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں بھی ابو اللیث صدیقی دبستانِ لکھنؤ کے تحت امام بخش ناسخ
اور ان کے سلسلے میں امداد امام اثر کی اسی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں۔

درام بابو سکسینہ اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ

"اگر غور سے دیکھا جائے تو جرأت پسند طبائع نے
قامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود کے خیال سے
نئی نئی راہیں نکالیں اور شعراء نے دہلی کی قدیم
شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اسی طرزِ جدید کے بانیِ اعظم ہیں۔" ۳؎

ناسخ:- شیخ امام بخش نام اور ناسخ تخلص کرتے تھے۔ شائد ان کے ناسخ
تخلص اختیار کرنے کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے دبستانِ دہلی کے شعراء کے طرزِ قدیم کو ناسخ

۱؎ کاشف الحقائق — امداد امام اثر — ص ۱۲۸
۲؎ تاریخ اردو ادب — درام بابو سکسینہ — ص ۲۲۲

کر کے جدید طرز کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کو ایک دوسرے سے علیحدہ حیثیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دبستانِ لکھنؤ کے بانی کہلائے جاتے ہیں۔

ناسخ کے سن ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن برخلاف اسکے تاریخ وفات سے تمام مورخین اردو ادب اتفاق کرتے ہیں۔ ناسخ نے ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ چونکہ تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے جسکی وجہ سے کوئی مصنف انکی عمر سو سال بتاتا ہے تو کوئی ۶۴ یا ۶۵ سال

ناسخ کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ بعد ازاں والد کی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو گئے۔ یہیں پر تعلیم حاصل کی۔ چونکہ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا لہذا شاعری کی طرف راغب ہوئے اور محمد رفیع سودا کی وفات پر تاریخ کہی۔ اسقدر صغیر سنی میں تاریخ کہنا گویا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ ابتدا ہی سے بے انتہا قابلیت کے مالک تھے۔

ایک اندازہ یہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے میدانِ شاعری میں بہت تاخیر سے قدم رکھا کیونکہ میر حسن جو وقت اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے ناسخ کی عمر ۳۸ سال تھی لیکن باوجود اسکے اس تذکرے میں ناسخ کا نام نہیں ملتا۔ اگر یہ مشہور زمانہ شاعر ہوتے تو یقیناً میر حسن انکا تذکرہ کرتے۔

علاوہ ازیں اسی دور میں لکھے گئے اور تین یا چار تذکروں میں بھی ناسخ کا

نام نہیں ملتا۔ جس سے یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ ناسخ نے میدانِ شاعری میں قدم رنجہ فرمانے میں بہت تاخیر کی ورنہ یہ مشہور زمانہ شاعر ہوتے اور اس دور کے ہر تذکرے میں ان کا نام موجود ہوتا۔

تعلیم سے متعلق یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ ناسخ نے عربی اور فارسی علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ناسخ نے کسکی شاگردی اختیار کی اور کسکو اپنا استاد مانا۔ اکثر تصانیف میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ناسخ میر تقی میر شہنشاہ غزل کے ہاں اپنی غزل لیکر بغرض اصلاح گئے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ جسکے بعد ناسخ نے کسی کو اپنا استاد نہ مانا بلکہ اپنے کلام پر آپ ہی اصلاح کرتے رہے۔ اس تعلق سے درسم بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ

"یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا" [۱]

لہذا ارفتہ رفتہ وہ اپنے کلام پر اصلاح کرتے کرتے دوسروں کے کلام پر بھی اصلاح دینے لگے چنانچہ ناسخ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ناسخ نے بحیثیت غزل گو شاعر نام و نمود اور شہرت حاصل کی تھی اسکے علاوہ انکے ہاں مثنوی، رباعیات، قطعات اور سلام بھی ملتے ہیں ناسخ کے کل تین دیوان شائع ہوئے جن میں سے دو انکی زندگی ہی میں شائع ہوئے

---

[۱] تاریخ اردو ادب — درسم بابو سکسینہ — ص ۲۲۶

اور تیسرا دیوان ان کے انتقال کے بعد ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا جبکہ انہوں نے ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔

مندرجہ سلام میں ناسخ کی جناب امیر علیہ السلام سے عقیدت اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے اور ذہنی وابستگی کا اظہار اسطرح ہوتا ہے کہ یہ انھیں سے اپنی بخشش کی امید لگائے ہوئے ہیں اور سلام کے آخر میں اپنے آپ کو غلام جناب امیرؑ بتاتے ہیں۔

سلام

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؑ کا — روح القدس ہے نام میرے ہم صفیر کا

بیعت خدا نے تجھ کو دی ہے بموجب اصطفیٰ — دست خدا ہے نام میرے دستگیر کا

اشیاء دکھائیں کہ عیاں ہل اتی میں ہے — مسکن کے بعد ذکر یتیم و نسیر کا

کیوں جوفروش کرتے تھے گندم نمائیاں — خود ذوق تھا جناب کو نانِ شعیر کا

انگشت اپنی دے کے سلیماں کر دیا — طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا

جس کو کیا نشانہ ہوا دم میں بے نشاں — ہے ملک شہر ملک الموت تیر کا

پوچھا جو حال تخت سلیماں سے ایک دن — بولا کہ زینہ ہوں میں علیؑ کے سریر کا

بخشش کی ہے امید علی کبیرؑ سے — ہوتا ہوں مرتکب جو گناہِ کبیر کا

جنبک نہ آبِ پاک دہانِ نبیؐ پیا — اس شیر کے نہ دل میں خیال آیا شیر کا

ناسخ کا ادعا ہے یہی روزِ باز پرس

میں ہوں غلام شاہ رسل کے وزیر کا [1]

علاوہ ازایں سلام امیر علی جونپوری ناسخ کی ایک رباعی کو بھی پیش کرتے ہیں جسمیں

---

[1] بحوالہ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — امیر علی جونپوری — صفحہ ۲۷۷

ناسخ ساقیٔ کوثر کی تشنہ دہانی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے گویا پانی کو حقیر و ذلیل بتاتے ہیں۔

شرمندۂ شاہِ کربلا ہے پانی — کیا فیض سے محروم رہا ہے پانی
گرتے ہیں جو اشکِ چشمِ تر ثابت یہ ہوا — گویا نظروں سے گر گیا ہے پانی [۱]

یہ ایک عجیب بات ہے کہ سید علی رضوی نے اپنی مرتبہ تصنیف "حسین پر سلام" میں بہ اعتبار عہد شعراء کے سلام پیش کئے ہیں جس میں آتش و ناسخ کے عہد کے شعراء کے بھی سلام انہوں نے مرتب کئے ہیں، اور اس عہد کو ناسخ اور آتش کا عہد ہی قرار دیتے ہیں یہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس عہد کے شعراء کے سلاموں میں ناسخ اور آتش دونوں کے بھی سلام شامل کئے جاتے۔ کیونکہ یہ عہد انہیں کے نام سے موسوم ہے لیکن ان دونوں ہی کے سلام کو انہوں نے پیش نہیں کیا بلکہ اس عہد کے دوسرے شعراء جنکا ذکر ما قبل آچکا ہے جیسے ضمیر اور خلیق فصیح، دلگیر وغیرہ انکے سلام انہوں نے پیش کئے ہیں۔

"العلم" مرثیہ و سلام نمبر میں بھی ناسخ کا سلام نہیں ملتا، اور نہ ہی سفارش حسین رضوی کے ہاں ناسخ کا ذکر ملتا ہے۔

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ناسخ اپنے کلام کی آپ اصلاح خود ہی کیا کرتے تھے نہ صرف اپنے کلام کی اصلاح آپ کیا کرتے تھے بلکہ آہستہ آہستہ دوسروں کے کلام پر بھی اصلاح دینے

---

[۱] بحوالہ تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — امیر علی جوہنپوری — صفحہ ۲۷۷

لگے یعنی خود تو باقاعدہ کسی کو بھی اپنا استاد تسلیم نہیں کیا لیکن بے انتہا مشق کی وجہ سے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اپنے اطراف شاگردوں کا ایک حلقہ بنا لیا۔

"اردو مرثیہ پاکستان میں" میں سید ضمیر اختر نقوی کی دوسری تصانیف کی فہرست بھی ملتی ہے جن میں تصنیف "دبستانِ ناسخ" بھی شامل ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ناسخ کے شاگردوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔

قبل ازیں مرثیہ نگاری کے جو چار مشہور و معروف شعراء خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح گزرے ہیں جو مرثیہ نگاری کے چار اہم ستون قرار پاتے ہیں ان میں سے دو یعنی دلگیر اور فصیح بھی دبستانِ ناسخ سے تعلق رکھتے ہیں جو اس دبستان کے لئے اور خود انکے استاد محترم امام بخش ناسخ کیلئے باعث فخر شاگرد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

"لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ابو اللیث صدیقی دلگیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"شاعری میں یہ اور فصیح دونوں ناسخ کے شاگرد تھے
لیکن استاد کا اثر انکے کلام پر بہت کم معلوم ہوتا ہے البتہ
زبان کی صفائی اور بندش کی چستی پر زیادہ زور دیتے ہیں
اور مضمون میں ویسی گرمی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے
جیسی ضمیر کے کلام میں ملتی ہے" [1]

مندرجہ بالا ان دو شخصیتوں کا تذکرہ اس باب کے آغاز ہی میں ہو چکا ہے۔

شاگردانِ ناسخ سے متعلق ایک عام نظریہ ہے کہ انکے ہاں تصنع اور الفاظ کا

کثرت سے استعمال پایا جاتا ہے لیکن مندرجہ بالا دو شعراء کے کلام پر یہ نظریہ صادق نہیں آتا۔ علاوہ ازیں دوسرے بھی کچھ شاگرد ایسے ہیں جنکے کلام میں تصنع اور الفاظ کی بھرمار نہیں پائی جاتی۔

میر انیس جیسے باکمال مرثیہ گو شاعر بھی غزل گوئی میں ناسخ کے شاگرد رہے ہیں ابتداء میں حزیں تخلص کیا کرتے تھے لیکن ۱۸۱۷ء میں ناسخ نے تخلص بدلنے کا مشورہ دیا جسکے ڈاکٹر ابواللیث "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں مندرجہ شعراء کو ناسخ کے شاگرد بتاتے ہیں۔

خواجہ محمد وزیر، مرزا محمد رضا خاں برق، علی اوسط رشک، مرزا حاتم علی مہر سید محمد اسمٰعیل حسین منیر، امداد علی بحر، ضامن علی جلال، اسد علی خاں قلق، آغا حسن امانت، محمد محسن محسن کاکوری وغیرہ

لیکن ابواللیث صدیقی ان تمام شعراء کی غزل گوئی کا ذکر کرتے ہیں، اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں بلکہ ان میں کچھ شعراء نے مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جن میں علی اوسط رشک، سید اسمٰعیل حسین منیر، امداد علی بحر، آغا حسن امانت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ضمیر اختر نقوی اپنی تصنیف مرثیہ گو شاگردانِ ناسخ[1] کو لکھتے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

میر زاانس، عاشور علیخاں، علی اوسط رشک اور جلال لکھنوی وغیرہ۔ اسکے علاوہ امیر علی جونپوری نے تذکرۂ مرثیہ نگارانِ اردو میں باقر علیخاں تشفی، نواب

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں ضمیر اختر نقوی ص ۵۳۹

اصغر علیخاں اعجاز اور مرزا کلب حسین خاں نادر اور مرزا علی حسین رفیق کا ذکر کرتے ہیں۔
سفارش حسین رضوی اپنی تصنیف اردو مرثیہ میں سید محمد مرزا انس اور مرزا حسین علیخاں اثر
کو ناسخ کے شاگرد قرار دیتے ہیں۔ بہ اعتبار سن ولادت تشفی کے تذکرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔

باقر علی خاں تشفی: — باقر علیخاں نام اور تشفی تخلص کرتے تھے۔ معزز خاندان
سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطنت اودھ کے چوتھے حکمران آصف الدولہ متوفی ۱۷۹۷ء انکے برادر
تھے۔ تشفی نواب مرزا علیخاں کے لڑکے تھے۔ معزز خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی بناء پر
بچپن ہی سے ذوق شاعری پروان چڑھ رہا تھا۔ بالآخر امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے۔
خداداد قابلیت اور ذہانت پائی تھی چنانچہ بہت کم عرصے ہی میں اپنے استاد کا نام روشن
کر گئے اور کاملان فن میں شمار ہونے لگا۔ اصناف سخن میں قصیدہ، رباعی، سلام اور مرثیے
کے علاوہ غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی۔ مذہب سے چونکہ کافی گہرا لگاؤ تھا لہذا غزلوں کے
دو دیوان یعنی دو جلدیں انہوں نے تلف کر دیں۔ مذہب سے گہری وابستگی اور عقیدت کا
اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ تشفی کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں میں شمار کی
جا سکتی ہے جن میں سے سولہ سو (۱۶۰۰) کی طباعت ہو چکی ہے جو چھتیس جلدوں پر مشتمل ہے۔
علاوہ ازیں تشفی کی کئی ایک منظوم تصانیف ملتی ہیں۔

امیر علی جونپوری "تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد اول" میں ص ۱۵۶ پر ان تمام منظوم
تصانیف سے متعلق لکھتے ہیں مولد شہ حضرت رسول خدا تین جلدیں، درود شریف منظوم "ہدیہ
رحمت" مختار نامہ منظوم، معجزات جناب امیر علیہ السلام، طہارۃ روزہ نماز و غسل منظوم،

تو ریخ ولادت با سعادت حضرت صاحب عصر علیہ السلام، خمسہ ہائے مدحیہ بر غزل
شیخ ناسخ، مظہر العجائب در مناظرہ و کلام منظوم، سفینہ بزم ملا کاشفی، قرآن شریف کا وہ
حصہ جو شان حضرت علی ابن ابو طالب علیہ السلام میں ہے۔ منظوم لوحہ جات کے علاوہ
کئی ایک تصانیف ملتے ہیں۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ سلام کے تین دیوان پیام بخشش، "بحضر امام حسین"
اور "معراج نامہ" کے عنوان سے ملتے ہیں۔ سلام کے ان دیوان کے تصنیف یقینی امر تھا، کیونکہ
مندرجہ بالا تصانیف سے تشفی کا مذہب سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے، انکے سلام سے عہد ناسخ
میں بھی سلام گوئی کی قومی روایت پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ چیدہ چیدہ سلام لکھنا اور
بات ہے اور سلام کے دیوان مرتب کرنا کچھ اور ہی ہے۔

مندرجہ بے شمار تصانیف کے مصنف ہونے کی بنا پر یہ کہنا دشوار ہیں کہ تشفی کے
ایک طویل عمر پائی تھی اور عمر کا زیادہ تر حصہ تصنیف و تالیف ہی میں صرف ہوا۔

امیر علی جوشپوری اس تعلق سے تحریر کرتے ہیں

"جناب مغفور ستر سال مصروف تصنیف و تالیف رہے
قریب نوے سال کی عمر میں بتاریخ ۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۰۳ھ رحلت کی" [1]

تشفی کے زود گوئی اور سبک گوئی یقیناً انکا خاندانی ورثہ ہے کیونکہ اصغر علیخاں اعجاز جو
تشفی کے حقیقی چچا تھے اتنا قادر سی دلبتان یعنی دلبتان ناسخ ہی سے وابستہ تھے یہ قلندر بخش
جرأت کے دامادر تھے۔

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد اول امیر علی جوشپوری ص ۱۵۶

باقر علی خاں تشفی کے فرزند امین الدین حیدر خان تجلی بھی شاعر تھے۔ انہوں نے صنف غزل و مرثیہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اپنے پدر بزرگوار کی تاریخ رحلت اسطرح لکھتے ہیں

ہوئی جو فکر تجلی کو سال رحلت کی
سروش غیب پکارا پدر کا داغ ملا۔ [1]

(سنہ ۱۳۰۳ھ)

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد اول امیر علی جونپوری ص ۱۵۶

علی اوسط رشک :- شیخ ناسخ کے شاگردوں میں رشک کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے۔ میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ ۱۷۹۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں لکھنؤ آئے اور تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اپنے عہد کے علماء کی صحبتوں سے فیض یاب ہو کر اپنی علمی صلاحیتوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔ شاعری میں ناسخ جیسے باصلاحیت اور مشہور زمانہ استاد سے رجوع ہوئے اور بہت جلد استاد کے طرز کو اپنایا جو اصلاح زبان پر مبنی تھا

رشک نے بھی بہت ہی محنت اور دلچسپی سے الفاظ کی صحت اور زبان کی اصلاح کے کام کو عملی جامہ پہنایا جسکا ثبوت انکی لغت "نفس اللغت" سے ملتا ہے۔ اپنی اسی لغت کی وجہ سے رشک نے زیادہ شہرت پائی۔

دو دیوان ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلا دیوان "نظم مبارک" کے نام سے موسوم ہے جس سے سن تالیف ۱۲۵۳ھ نکلتا ہے۔ دوسرا دیوان "نظم گرامی" کے نام سے موسوم ہے جس سے اس کا سن تالیف ۱۲۶۱ھ نکلتا ہے۔ "نفس اللغت" بھی تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔

رام بابو سکسینہ، رشک کے کلام کی خصوصیات سے متعلق تحریر کرتے ہیں

"بہت پُرگو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔" [۱]

مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاگردان ناسخ میں یہ سب سے اونچے درجہ پر فائز تھے اور شیخ ناسخ اپنے شاگردوں کو رشک کو تفویض کیا کرتے تھے۔ چنانچہ منیر نے ابتداء

---

[۱] تاریخ اردو ادب — رام بابو سکسینہ — ص ۲۳۸

ہی ناسخ کو اپنا استاد مانا لیکن بعد ازاں یہ رشک کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ رشک کے شاگردوں کی فہرست میں کبھی ناسخ کا نام ملتا ہے۔ ابو اللیث صدیقی اپنی تصنیف[۲] میں رشک کے شاگردوں کے نام گنواتے ہیں جنکی تعداد اٹھائیس[۲۸] ہے۔ شاگردوں کی تعداد سے بھی رشک کے بحیثیت شاعر بلند مرتبے کا علم ہوتا ہے۔

رشک کا کلام دبستان لکھنؤ کی خصوصیات کی پوری پوری پابندی کرتا ہے یعنی انکے کلام میں زبان کا صحیح استعمال، وزن اور قوافی کی پابندی ملتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زبان اور فن کے ضابطوں کی تحصیل کرنے کے خواہاں انکے دواوین سے حد درجہ مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمد انصار اللہ جنھوں نے خود نہ صرف رشک پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا ہے بلکہ "انتخاب رشک" بھی مرتب کی ہے۔ اسکے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں

"مذہب پسندی نے انکے خیالوں میں انتہذال اور شوقیانہ پن کی صورت نہیں پیدا ہونے دی۔ بعض وقت تو بہت سامنے کی باتیں نظم کی ہیں لیکن ان میں بھی فکر انگیزی اور خیال آفرینی کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ کثرت مشق نے رشک کے کلام میں ایسی صفائی پیدا کر دی کہ بیشتر آمد کا دعوی ہوتا ہے"[۱]

یعنی اس عہد کے شعراء کے کلام میں جو گراوٹ اور انتہذال پایا جاتا ہے وہ مذہب پسندی کی

---

[۱] مقدمہ انتخاب رشک، محمد انصار اللہ ص ۱۱

بنیاد پر رشک کے کلام میں پایا نہیں جاتا یعنی رشک کا کلام ان تمام نقائص اور برائیوں سے پاک و پاکیزہ ہے جس کی وجہ محمد انصار اللہ مذہب پسندی بتاتے ہیں۔ یقیناً یہی اس کی اصل وجہ ہو سکتی ہے کہ مذہب پسندی کے سبب رثائی شاعری سے رغبت پیدا ہوئی اور رثائی شاعری یعنی مرثیہ و سلام کی بدولت معیاری شاعری کی ابتداء ہوئی۔

صنف مرثیہ نے حق و باطل کی پہچان کروائی اور صنف سلام نے شاعری کو عقیدت و اخلاق کا جامہ پہنایا۔ اسطرح مذہب پسندی نے شاعری پر اپنے مثبت اثرات ہی چھوڑے۔

قبل ازیں ابواب میں ان تمام محققین و مصنفین کا ذکر کیا گیا ہے جو رثائی شاعری کو مذہب کے رشتے سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکومت کی مذہب پسندی و مذہب پرستی کی وجہ مرثیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا، اگرچہ کہ ان خیالات کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں لیکن اگر اسکے باوجود بھی کوئی اس حقیقت کو ماننے کیلئے تیار نہیں تو گویا اسے اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مذہب پسندی ہی نے شاعری کو ابتذال کی راہوں سے ہٹا کر ارتقاء کی راہوں کی نشاندہی کی ہے اور اسے معیار عطا کیا۔

رشک اپنے خاندان سے متعلق بڑے ہی کھلے انداز میں واضح طور پر کہتے ہیں۔

؎ رشک پھولا سماتا نہیں پیراہن میں
بارے اسکا شجرہ آل عبا تک پہنچا [1]

ایک اور مقام پر کہتے ہیں

---

[1] انتخاب رشک محمد انصار اللہ ص ۵

میرا معشوق وہ محبوب خدا ہے اے رشک
جس کے لقبائی کے لئے سلمان و ابوذر عاشق [1]

پہلے دیوان "نظم مبارک" جسکا قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے اسمیں مندرجہ منقبت ملتی ہے۔

دل میں ہے تصور سحر و شام علیؑ کا
یہ رگ وہ ہے جسمیں ہے فقط نام علیؑ کا

تھا شیر نیستان الوہیت و وحدت
تب تو اسد اللہ ہوا نام علیؑ کا

تھا خانۂ میر نور خدا مولد و مشہد
آغاز سے بہتر ہیں انجام علیؑ کا

تھا قبل ولادت سے ہی اقرار نبوت
اسلام حقیقت میں ہے اسلام علیؑ کا

یا بندگی اللہ کی یا کار خلائق
تھا بعد عبادت یہی کام علیؑ کا

اسمیں صفت خاص ہے تھا کو مسمی
اللہ کو منظور ہوا نام علیؑ کا

---

[1] مقدمہ انتخاب رشک — محمد انصار اللہ — ص ۱۰

اعجاز سے کہتے ہیں کہ حل ہو گئی مشکل
جسنے پئے امداد لیا نام علیؑ کا

جو قدر نبیؐ پیش خدائے دو جہاں تھی
اتنا ہی نبیؐ کرتے تھے اکرام علیؑ کا

یا رب حرکت ہے دہن رشکؔ میں جب تک
جاری رہے بالائے زباں نام علیؑ کا [1]

رشکؔ اپنے کلام میں ہر جگہ اپنے شیعہ اثناء عشری ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مندرجہ منقبت کو پڑھنے کے بعد ہی قاری یقیناً کہہ سکتا ہے کہ رشکؔ نے صنف مرثیہ و سلام پر بھی ضرور طبع آزمائی کی ہو گی لیکن نہ تو محمد انصار اللہ نظر ہی اسکا ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی ابو اللیث صدیقی اسکا ذکر کرتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ بھی رشکؔ کی رثائی شاعری کا تذکرہ نہیں کرتے۔ باوجود اسکے رشکؔ کی رثائی شاعری پر رشکؔ کی کوئی گنجائش ہی نہیں "شمع تعزیت" (سلاموں کا مجموعہ) جسکا قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے جسکا انتخاب پروفیسر نیر مسعود نے رسالہ "العلم" میں پیش کیا ہے اس میں رشکؔ کے سلام کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

سلام

کیوں نہ روؤں کہ مجھے یاد ہے مولا میرا
اے سلامی نہیں بیکار یہ رونا میرا

---

[1] نظم مبارک (دیوان) اوسط علی رشک ص ۴

تھا تقرب سے مقام ابتلائے اہلِ بیت

اے سلامی کس طرح ٹلتی بلائے اہلِ بیت

دوسری صورت نہ بدلی نالۂ فریاد نے

ایک عالم پر رہا شورِ بکائے اہلِ بیت۔ [1]

اگر مندرجہ سلام مکمل ہوتا تو اسکے اندازِ بیان، طرزِ بیان اور ہیئت کا تعین کیا جا سکتا یہ نہ ہی غزل کی ہیئت میں ہے اور نہ ہی مربع لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہر شعر انفرادی معنی رکھتا ہے۔ بے انتہا سادہ اور سلیس زبان کا رشک نے استعمال کیا ہے۔ سلام بالکل ہی رثائی اندازِ بیان رکھتا ہے۔ سلام کا نمونہ یقیناً علی اوسط رشک ہی کا ہے جسکا اندازہ ہم اسطرح کر سکتے ہیں کہ "شمع تعزیت" ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوئی جبکہ رشک کا انتقال ۱۲۸۳ھ میں ہوا اور انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ کربلائے معلیٰ میں انتقال کیا۔

قبل ازیں شاگردانِ ناسخ کے سلسلے میں منیر شکوہ آبادی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ منیر ابتداء میں ناسخ کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے لیکن بعد ازاں خود ناسخ کے کہنے پر رشک کو اپنا استاد تسلیم کیا۔ لہٰذا شاگردانِ رشک میں بھی منیر کا شمار ہونے لگا۔ شاگردانِ رشک کے سلسلے میں ابو اللیث صدیقی کی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں منیر کا نام سرِ فہرست ملتا ہے

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی :—

سید محمد اسمٰعیل حسین نام اور منیر تخلص کرتے تھے۔ لفظ شکوہ آبادی سے

---

[1] رسالہ "العلم" اکتوبر ۱۹۹۳ء مدیر علی جواد زیدی ص ۲۲ مضمون شمع تعزیت از پروفیسر منیر مسعود

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شکوہ آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۹ھ سنہ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ سید احمد حسین کے لڑکے تھے۔ منیر کے جد اعلیٰ عرب سے شکوہ آباد آئے۔ بعد ازاں وہ دور بھی آیا جب انکے شکوہ آباد اور فیروز آباد کا صوبیدار مقرر کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ شاہ عالم کے عہد تک برقرار رہا۔ جد امجد سید شریف الدین علیخاں تھے جنھیں مندرجہ وجوہات کی بناء پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ سید احمد حسین ان ہی کے پوتے تھے جو مغلوں کے عہد آخر میں جاگیرداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس عہد سے متعلق ابو اللیث صدیقی "اردوئے معلیٰ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"یہ زمانہ میر و سودا کی شہرت کا تھا چنانچہ شاعری کے شوق نے سید احمد حسین شاد کو میرزا رفیع سودا کا شاگرد کر دیا۔" ۱؎

اس بیان کے مطابق سید احمد حسین کی شعری صلاحیت و قابلیت مسلّم ہے جس سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید احمد حسین نے اپنے لڑکے منیر کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے طریقے سے کی۔ "دبستانِ دبیر" میں بھی منیر کا تذکرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے منیر کا شمار نہ صرف دبیر کے شاگردوں میں کیا ہے بلکہ "دبستانِ دبیر" کے اساتذہ میں انکا شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"دبستانِ دبیر کے جن اساتذہ نے شعر و سخن کا رواج عام کرنے میں ممتاز حصہ لیا ہے ان میں منیر کا رتبہ بہت بلند ہے" ۲؎

ساتھ ہی منیر کے اساتذہ میں ناسخ اور رشک کا بھی ذکر کرتے ہیں جسکی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ منیر غزل گوئی میں ناسخ اور رشک کے شاگرد تھے اور اپنی رثائی

۱؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابو اللیث صدیقی ص ۴۳۲ بحوالہ اردوئے معلیٰ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء

۲؎ دبستانِ دبیر — ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۲۵۷

شاعری پر مرزا دبیر سے اصلاح لیا کرتے تھے چنانچہ وہ اپنے اشعار میں ان اساتذہ کی استادی کا اقرار کرتے ہیں

کلیات منیر میں ایک غزل کا مقطع یوں ملتا ہے

؎ فخر جناب شیخ ہوئے رشک اے منیر
ترجیح ہو سکی میرے استاد پر کسے ۔ ؎۱

ابو اللیث صدیقی منیر کو ناسخ کا شاگرد بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

"نواب نظام الدولہ کی سفارش پر
ناسخ نے انہیں اپنا شاگرد قبول کیا
اور اس فیض کا ذکر منیر نے اپنے
کلام میں بار بار کیا" ؎۲

مندرجہ اشعار جس سے دونوں اساتذہ کی استادی کا اقرار ملتا ہے ۔

؎ سوئے بہشت حضرت ناسخ رواں ہوئے
جب ہو چکے افادہ کے قابل جناب رشک

؎ ناسخ تھے آفتاب سپہر کمال کے
برج علوم کے مہ کامل جناب رشک ؎۳

؎۱ کلیات منیر — منیر — ص ۲۳۱
؎۲،۳ لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابو اللیث صدیقی — ص ۴۳۳،۴۳۴

منیر نے نہ صرف ان اشعار میں اپنے استادوں کے نام گنوائے ہیں بلکہ ان کی مہارت و کمال اور استادانِ فن ہونے پر بھی روشنی ڈالی ہے

منیر نے کلکتہ، الہ باد اور مرشد آباد کا بھی سفر کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ میں کچھ عرصہ قیام رہا اور اسی سلسلے میں فرخ آباد اور بانسہ بھی گئے۔ یہاں علی بہادر والی بانسہ کے ہاں ملازمت اختیار کی لیکن ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کی فوج نے بانسہ پر چڑھائی کی، اور قلعہ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ باوجود یہ راہ فرار اختیار کرنے کے منیر گرفتار کر لیے گئے اور ایبن الہ باد اور کلکتہ لے جایا گیا۔

یوسف علیخاں ولی رشید نے نہ صرف منیر کے کلام کو بے حد پسند کیا بلکہ ان ہی کی سفارش پر منیر رامپور پہنچے لیکن اچانک یوسف علیخاں کے انتقال کی وجہ سے یہ طلب علیخاں کے دربار پہنچے۔ جلسوں میں شرکت کا شرف بھی ملا جہاں ان کی ملاقات امیر مینائی، داغ، جلال، اسیر، تسلیم، عروج اور رقیق سے ہوئی۔

ایک سو روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۷ ذوالحجہ ۱۸۸۱ء میں منیر نے انتقال کیا

قبل ازیں راقمۃ الحروف نے منیر کے رسائی۔ کے تعلق سے جس خیال کا اظہار کیا تھا کہ شائد غزل میں تاریخ اور شاعری میں منیر کے شاگرد تھے۔ اس خیال کا مستند ثبوت دبستانِ منیر سے ملتا ہے۔

ڈاکٹر زاکر حسین فاروقی منیر شکوہ آبادی کے سلسلے میں لکھتے ہیں

"ابتدا سے ہی لکھنؤ میں رہے۔ وہیں پر شعر و سخن

کا ذوق پیدا ہوا تو ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔" ؎۱

مثنوی معراج المضامین میں لکھتے ہیں

؎ دیا استاد ناسخ سا شہنشاہ — کہ جسکا سکہ ہے ماہی سے تا ماہ

مرثیہ گوئی میں دبیر جیسا استاد ملنے پر یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتے ہوئے استاد کے حق میں دعا گو ہیں۔

؎ عطا کی مرثیے میں اسکی اصلاح — کہ جسکی بزم ہے خورشید مصباح

مسیحائے سخن اعجاز گستر — دبیر پاک دیں مقبول داور

چلے جبتک نسیم صبح گاہی — سلامت انکو رکھنا یا الٰہی

منیر کی ہر گوئی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ معاشی حالات سے تنگ آکر دو دیوان تین مثنویاں اور کئی مراثی انہوں نے فروخت کر دئیے۔ علاوہ ازیں دو دیوان چوری ہو گئے۔ باوجود اسکے دو دیوان، قصائد اور مثنوی "معراج المضامین" ابھی ان کے ہاں موجود ہے

شاعر کی زندگی کا سارا اثاثہ اسکا کلام ہی ہوتا ہے۔ کوئی بھی شاعر بے انتہا ناگزیر حالات کے سوا اپنا کلام فروخت کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ منیر نے بھی کچھ ایسے ہی ناگزیر حالات کی بناء پر اپنے کلام کو فروخت کرنے کے لیئے مجبور ہوئے۔ چنانچہ بحیثیت مرثیہ گو منیر کے مرثیہ کا تعین اسلیئے مشکل نظر آتا ہے کہ سارے مراثی منیر نے فروخت کر دیئے۔

؎۱ دبستان دبیر از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۲۴۶

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی منیر کی مرثیہ گوئی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"منیر کا بس وہی مرثیہ باقی ہے جو دربارِ حسین میں چھپا ہے" [1]

یہ مصنف کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے اسکے سات بند موصوف نے دبستان دبیر میں داخل کئے ہیں جس میں مدح بطور چہرہ بعد از آں حسن تعلیل کے اشعار ملتے ہیں جس میں منیر قدرتی عناصر چاند، سورج اور ستاروں کو صرف غم حسینؑ بتاتے ہیں۔

؎ یہ شیشۂ گردوں میں لہو کسکا بھرا ہے — کس غم سے پراگندہ ستاروں کا پرا ہے

کیوں سنگِ عزا مہر نے سینہ پہ دھرا ہے — ہر ماہ میں کیوں زخم مہِ نو کا ہرا ہے

ملبوسِ حرم فرشِ عزا خانہ ہے کسکا

تسبیح ملک عرش پہ افسانہ ہے کسکا

بعد از آں میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں جس سے یہ اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ منیر نے مراثی بھی بڑے پائے کے لکھے ہیں۔

مراثی کی طرح منیر نے شاید اپنے سلام بھی فروخت کر دیئے یا پھر ناقدری سخن کی بناء پر تلف ہو گئے۔ صرف ایک ہی سلام ملتا ہے جسکا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سلام جو دستیاب ہوا ہے وہ دبیر کے مجموعہ "دفتر ماتم" کی جلد ہفدہم میں ملتا ہے۔ یہ سلام مکمل تو نہیں لیکن اسکے کچھ اشعار دیئے گئے ہیں۔ سلام یقیناً طویل ہوگا۔ افسوس کہ راقمۃ الحروف کو دبیر کی جلد ہژدہم تو مل چکی

---

[1] دبستانِ دبیر — ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی — ص ۲۵۴

لیکن جلد ہفدہم دستیاب نہ ہوئی۔ سلام کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں

سلام

اے دل تپاں ہو شوقِ درِ بوتراب میں — قبلہ نما وہ ہے جو رہے اضطراب میں

نقشہ علی کا ہے میری چشمِ پُر آب میں — مجرائی آفتاب ہے برجِ حباب میں

جرم سوار دوشِ پیمبر ہوا سوار — تنہائی تھی جلوس اجل تھی رکاب میں

چھٹ کر علی کے پاؤں سے روئی یہاں تلک — پتلی رہی نہ حلقۂ چشمِ پُر آب میں

مضمونِ خطِ عارضِ اکبر تھا [illegible] — پیاسے شہید ہو گئے یہ عہدِ شباب میں

در در پھرایا آلِ نبی[۲] کو تو کیا ہوا — سرگشتہ چرخ بھی ہے جہانِ خراب میں

صابر میں شاہِ پاک اگر ہوئیں خشمناک — آجائیں کائنات ابھی انقلاب میں

گردوں چھپے، نہ زمیں میں، نہ زمیں ایک درے میں — گلشن سمائے غنچہ میں دریا حباب میں [۱]

مندرجہ سلام غزل ہی کی ہیئت میں ملتا ہے لیکن سلام، سلامی یا مجرائی جیسے الفاظ سے اسکا آغاز نہیں ہوتا۔ اگرچہ کہ دوسرے شعر میں مجرائی کا لفظ ضرور آیا ہے۔ اس سلام میں ایک انوکھا پن پایا جاتا ہے کہ پیش نظر سلام کے آدھے اشعار منقبتی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور بقیہ اشعار واقعاتِ کربلا کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ابتدائی اشعار جو منقبت کا رنگ [illegible] میں دریا کے جناب امیر سے وابستگی اور

---

[۱] دبستانِ دبیر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۲۵۶

دیر پاک کی زیارت کا اشتیاق بھی ظاہر کرتے ہیں۔ تخیل کی نزاکت بھی قابلِ دید ہے۔

وہ اشعار جو واقعاتِ کربلا پر مشتمل ہیں وہ یقیناً رثائی ہیں جنمیں منیر امامِ مظلوم کے صبر کی داد دیتے ہیں۔ منیر کا آخری شعر غزل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر غزل میں اس شعر کا اضافہ کیا جائے تو فرق بہت مشکل ہے۔ یقیناً یہ دبستانِ ناسخ سے وابستگی کی وجہ ہے کہ سلام میں دو یا تین شعر غزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں جسکا بعد اکثر اں باب میر انیس کی سلام گوئی کے سلسلے میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ میر انیس کے ہر سلام میں کبھی کم سے کم دو شعر غزل کا انداز کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس خصوصیت کو بھی ایک روایت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شاگردانِ ناسخ میں مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ محمد حسین آزاد نے بھی نادر کا ذکر اپنی تصنیف "آبِ حیات" میں بحیثیت شاگرد ناسخ کیا ہے لیکن تعجب تو اس بات کا ہے کہ ابو الاعجاز صدیقی نے اپنی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ناسخ کے شاگردوں کے سلسلے میں نادر کا ذکر نہیں کیا حالانکہ دوسرے شاگردوں کا ذکر بڑی ہی تفصیل سے کرتے ہیں۔ علاوہ اس تصنیف کے دوسری کتابوں میں شاگردانِ ناسخ کے سلسلے میں نادر کا ذکر ملتا ہے۔

مرزا کلب حسین خاں نادر: مرزا کلب حسین خاں نام اور نادر تخلص کرتے تھے۔ اعتصام الدولہ میر کلب حسین خاں بہادر مہابر جنگ کے نام سے مشہور تھے۔ بنارس کے رئیسوں میں انکا شمار ہوتا تھا۔ والد احترام الدولہ دبیر الملک نواب میر کلب علیخاں بہادر

سبب جنگ تھے۔

مرزا کلب حسین نادر کا سلسلہ محمد تقی خاں سے ملتا ہے۔ محمد شفیع خاں اور محمد تقی خاں یہ دو حقیقی بھائی تھے۔ نادر شاہ کے مصاحبین میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر محمد شفیع خاں نادر شاہ کے قہر و غضب کا نشانہ بنے اور نادر شاہ کے حکم کے مطابق انہیں جلتی آگ میں ڈال دیا گیا۔

بہرحال محمد تقی خاں جو نادر کے دادا تھے اپنے بھائی کے خاتمے کے بعد بڑے ہی دل برداشتہ ہو کر ہندوستان آئے۔ نواب منصور علی خاں صفدر جنگ نے انہیں دس ہزار روپئے کی جاگیر کر دی۔ انکے بیٹے کلب علی خاں جو صدر جنگ کے والد تھے جس سے متعلق محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ

"کلب علی خاں مرحوم نے سرکار انگریزی میں بزرگوں کی عزت کو روشن کیا" [1]

وہ لکھنؤ روہیلے آصفی کے چار علاقے کے منتظم مقرر ہوئے جس سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انکے معاشی حالات بہت بہتر تھے۔

ان ہی کے بیٹے کلب حسین خاں تھے جو ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ اس تعلق سے سید مسعود حسن رضوی ادیب تذکرہ نادر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ

"اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لئے ڈپٹی کلکٹری

---

[1] آب حیات محمد حسین آزاد ص ۴۱۷ حاشیہ

سرکاری ملازمت کی معراج تھی اور صرف معزز گھرانے

کے لوگ اس منصب جلیل کے حقدار تھے۔ "نادر خود ڈپٹی کلکٹر تھے۔" [۱]

نہ صرف نادر بلکہ انکے دونوں بیٹے بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اسقدر معزز عہدے پر فائز ہونے سے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیمی قابلیت رکھتے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی وجہ سے کئی

مقامات کا نادر نے دورہ کیا جسمیں غازی پور، الہ آباد، فرخ آباد اور آگرہ شامل ہیں۔

شاعری کا بہت شوق تھا۔ اس فن میں یعنی فن شاعری میں وہ شیخ ناسخ کو اپنا استاد تسلیم

کرتے ہیں۔ کل سینتالیس [۴۷] قصیدے لکھے ہیں۔ چار دیوان کے علاوہ مثنوی اور مرثیہ بھی

ان کے منظوم تصانیف میں شامل ہے۔

محمد حسین آزاد نادر کے کلام کی توضیل اسطرح بتاتے ہیں۔

"انکے کئی ضخیم دیوان غزلوں اور قصیدوں اور

سلاموں اور مرثیوں کے ہیں۔" [۲]

اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر صنف سخن میں انہوں نے اپنا دیوان چھوڑا ہے یا پھر انکے بے شمار ضخیم

دیوان میں تمام اصناف سخن ملتے ہیں۔ سلام کے دیوان کا قبل ازیں ابواب میں بھی تذکرہ کیا گیا

ہے۔ اس باب میں بھی نادر کے سلام کے دیوان کا تذکرہ ملتا ہے تو گویا ہم اس نظریہ پر

پہنچتے ہیں کہ ابتدا سے نہ صرف سلام گوئی کی قوی روایت ملتی ہے بلکہ ہر دور میں سلام کے دیوان

کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

---

[۱] مقدمہ تذکرۂ نادر — مسعود حسین رضوی — ص ۲

[۲] آب حیات — محمد حسین آزاد — ص ۴۲۵

مرثیوں اور سلاموں کے دیوان کے تذکرے سے نادر کے عقائد اور در اہلبیت پاک سے تمسک پر روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں کل ۴۷ یا ۴۹ قصائد میں سے پانچ قصائد انہوں نے پنجتن پاک کی مدح میں تصنیف کئے ہیں جنکے بارے میں محمد حسین آزاد تحریر کرتے ہیں۔

"خوش اعتقادی انکی قابل رشک تھی یعنی وصیت کی تھی کہ بعد وفات کے میرے ایک ہاتھ میں سلاموں اور مرثیوں کا دیوان رکھ دینا اور دوسرے ہاتھ میں قصائد کا دیوان رکھ دینا جو بزرگان دین کی مدح میں کہے ہیں" [1]

غزلیات کا دیوان جو دیوان نادر سے معلوم ہے اسمیں غزلیات کے اشعار بھی اس طرح ملتے ہیں جسمیں وہ کربلائے معلی اور نجف اشرف جانے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں، اور غزل کے ایک مقطع میں وہ اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

۱- ہند سے اب کربلا چل نادر محزوں شتاب — روضۂ سرور کو آنکھوں سے لگانا چاہیے۔ [1] ص ۲۳۶

۲- ہند سے نادر بہت دل تنگ ہے — کربلا بہر زیارت جائیں گے۔ [2] ص ۲۷۹

۳- نادر مجھے پہنچائے خدا جلد نجف کو — کیا فرط تمنا ہے کہ میں کہہ نہیں سکتا۔ [3] ص ۹۰

۴- شکر للہ بر آئی اسکی امید — نادر اب کربلا کو جاتا ہے [4] ص ۲۳۲

۵- نادر آیا ہے دشمنوں سے تنگ — شاہ خیبر کشا دہائی ہے [5] ص ۲۱۳

مندرجہ اشعار کو پڑھنے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ تمام اشعار سلام کے ہیں

---

[1] آب حیات — محمد حسین آزاد — ص ۴۴۵

۱، ۲، ۳، ۴، ۵ دیوان نادر — مرزا کلب حسین خاں نادر — ص ۲۳۶، ص ۲۷۹، ص ۹۰، ص ۲۳۲، ص ۲۱۳

حالانکہ یہ تمام اشعار غزل کے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے نادر کی سلام گوئی اور سلام کے دیوان کا تو تذکرہ کیا ہے لیکن نمونتاً سلام کے چند اشعار بھی نہیں دیئے تاکہ سلام گوئی پر بہ آسانی تبصرہ کیا جا سکے۔

ڈاکٹر فیروز احمد بھی نہ تو سلام گوئی کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ ہی نمونۂ سلام پیش کرتے ہیں۔ "تذکرۂ نادر" میں بھی مسعود حسن رضوی اپنے مقدمے میں صرف سلام گوئی کے سلسلے میں "آبِ حیات" ہی کا حوالہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی سلام کے چند اشعار بطور نمونہ پیش نہیں کرتے۔ صرف سلاموں کے مجموعے "شمع تعزیت" ہی میں نادر کے سلام کے چند اشعار ملتے ہیں۔

سلام

دیکھا جو کربلا کا وہ میدانِ ہولناک — ہوش و حواس کر گئے اہرم سے رم

پانی کا قطرہ گوہرِ نایاب ہو گیا — کچھ دور تھا نہ شاہِ جمیل الشیم سے میم

مجرائی تھی اونچی جو علمدار کی آواز — کیوں پست نہ ہو شمر ستمگار کی آواز

اس مرتبہ زنجیر کی آواز بپا تھی — آئی نہ تھی سجادِ دل افگار کی آواز

مندرجہ سلام مربع کی ہیئت میں ملتا ہے۔ ابتدائی بند میں جو الفاظ نادر نے استعمال کئے ہیں "رم" "جمیل الشیم" اور "میم" یہ دوسرے شعراء کے ہاں شاید ہی ملیں۔ سلام خالص رثائی انداز رکھتا ہے۔ انداز بیان بھی بالکل ہی سادہ ہے لیکن باوجود اس کے تاثر پایا جاتا ہے۔ شاید اسی انداز سے سلام لکھے ہیں۔ سلام کا پہلا بند مربع کی ہیئت کی بھی پوری پوری پابندی نہیں کرتا۔ لیکن اس سے اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہیں کہ نادر نے غزل کی ہیئت سے

چھا یا ما ر الٹر اللہ ا ( ) اور ( ) ا ( ) ر دا ئی ٹونک آ گیا تھا ملکر تین تین میں
ہزار لشکر کی سپہ ا ر ( ) ا ( ) ں کا ر ( ) ا ئے ( ) ہڑ ا ری لشکر میں شریک
ہو کر رگ ز ( ) ں کو ا ک ( ) ج ا د ئے ( ) ہد نواب غا ز ی الدین حیدر میں لکھنؤ آ گئے" [1]

فقیر محمد خاں گویا کہ ( ) ( ) ( ) ا ر کرتے ہوئے ر ز ائی شاعری سے انکا
شغف بعید از قیاس ( ) ( ) ( )

ہوتا کہ اہلبیت پاک سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔

سلام

لازم ہے مجرئی کو اطاعت حسینؑ کی
مغفور بہے ہوگی جماعت حسینؑ کی

مشکیں بہا کے رنگ بہ ہنستے تھے اہل شام
تغیر تھی جو پیاس سے حالت حسینؑ کی

روتے روتے تھے دار و دار پیمبر بہشت میں
کرتے تھے جبکہ یاد مصیبت حسینؑ کی

سجدے میں سر جھکا دیا محراب تیغ میں
زخموں سے صرف سب ہوئی طاقت حسینؑ کی

بیعت طلب حسینؑ سے کی طالموں نے ہائے
واجب یہ تھا کہ کرتے وہ بیعت حسینؑ کی

خنجر چلا کیا نہ اٹھی سجدے سے جبیں
افزوں ہے سب جہاں سے عبادت حسینؑ کی

جو جو ستم لعین کرے صبر کیجئے
اہلحرم کو تھی یہ وصیت حسینؑ کی

گہوارہ اکثر آکے ہلاتا تھا جبرئیل
سمجھو تو کس قدر ہے فضیلت حسینؑ کی

آتے تھے یا تو اسکے لئے حلۂ بہشت
یا سر برہنہ پھرتی ہے عترت حسینؑ کی

خنجر بکف جو آیا شقی سر جھکا دیا
کس مرتبہ ہے واہ مروت حسینؑ کی

گویا کو یہ کہیں کہ ہمارا ہے یہ محب
ہو روز حشر اتنی عنایت حسینؑ کی [1]

مندرجہ سلام خالص رثائی انداز رکھتا ہے۔ تقریباً استعارتاً شعر سے بھرپور ہیں ساتھ ہی گویا امام مظلوم کی فضیلت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس سلام کے علاوہ ایک اور سلام امیر علی جونپوری نے پیش کیا ہے جو مرثیے کی ہیئت میں ملتا ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عہد انیس

---

[1] تذکرۂ مرثیہ نگار اردو ... امیر علی جونپوری ص ۴۱۷

تک سلام ہر بیت میں لکھا جاتا ہے اسکے لیئے کوئی بیت محدود و مقرر نہیں تھی۔ ۱؎

سلام

دیتے تھے اہل بیت پیمبر کے واسطے — سنتے تھے مجرئی نہ لعین زر کے واسطے

کہتے تھے شیر تک نہیں اصغر کے واسطے — پانی پلاؤ ساقیٔ کوثر کے واسطے

جب تیر کھا کے اصغر بے شیر مر گیا — گودی کو خالی دیکھ کے بانو نے یہ کہا

یا شاہ دیں بتاؤ مرا لال کیا ہوا — اصغر کو لاؤ خالق اکبر کے واسطے

کہتی تھی بانو بیٹے سے لڑنے کو تو نہ جا — اور جائیگا تو پھر مجھے جیتا نہ پائے گا

ماں ہوں میں تیری مان لے اتنا کہا مرا — اکبر میں تجھ کو دیتی ہوں سرور کے واسطے

سمجھا نہ یہ شقی کہ سکینہ ہے بے پدر — کانٹے پڑے ہیں پیاس سے اسکی زبان پر

مطلق رہا نہ دل میں یہ اللہ کا خطر — دوڑایا ہاتھ اسنے جو گوہر کے واسطے ۲؎

مندرجہ بالا سلام بھی خالص رثائی انداز رکھتا ہے اور آگے جو سلام پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی بالکل ہی رثائیت پر مبنی ہے۔ پورا سلام عابد بیمار کے حال کا ملتا ہے۔ بعض بعض اشعار دل کو ہلا دینے والی کیفیت رکھتے ہیں۔ طوالت کے سبب سلام کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

سلام

سالک مسلک تسلیم و رضا ہے عابد — مجرئی قید ہے پر عقدہ کشا ہے عابد

۱؎ تذکرۂ مرثیہ نگاران اردو حصہ اول — امیر علی جونپوری — ص ۲۱۶

۲؎ " " " " " " " — " " — ص ۲۱۷

طوق گردن میں ہے اور پاؤں میں دوہری زنجیر — شکر ہے لب پہ یہ راضی بہ رضا ہے عابد

راہ میں کوچوں میں دربار میں اور زنداں میں — غل زنجیر کا بے جرم و خطا ہے عابد

کر کے منہ سوئے نجف کہتی تھی رو کر باز — یا علی سخت مصیبت میں پھنسا ہے عابد

حجر اسود ہو اجکے لیے گویا مداح — وہ امام دو جہاں راہ نما ہے عابد [1]

ناسخ کے عہد تک اردو میں سلام گوئی کی روایت دور تعمیر سے دور عروج کی سرحدوں تک پہنچ رہی تھی۔ ناسخ کے شاگردوں میں بہت سے انیس و دبیر کے معاصر یا ان کے بعد کے زمانے تک زندہ رہے۔ لیکن انکا تذکرہ زمانی اعتبار کے بجائے شعری خانوادے کی بنا پر انیس و دبیر سے قبل کیا گیا ہے۔

سلام گوئی کی روایت کے جو اہم اجزا اس دور تک ملتے ہیں انمیں دل ثنائیت دل اہلبیت اصحاب سے عقیدت ناگزیر جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہیئت کی پابندی نہیں ملتی، اور یہ بھی ہے کہ عقیدت اور جوش ولا کے تحت کہیں کہیں ادبیت اور فنکاری پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن زبان، اسلوب، لہجہ اور تعلیقی اظہار کی پابندی کی جو روایت میر و سودا سے چلی تھی لکھنؤ میں آکر اسے استحکام بھی ملا اور کسی حد تک ہیئت بھی مقرر ہونے لگی اسلیے انیسویں صدی کی پہلی تہائی گذرنے کیساتھ انیس و دبیر کی بلند آہنگ اور چھا جانے والی آواز سے فضا گونجنے لگی۔

---

[1] حسین پر سلام — مرتبہ سید علی رضوی — ص ۱۰۸

ایک جاتی

میر انیس، دبیر، مونس، میر انس

نفیس، عشق، تعشق، پیارے صاحب، رشید

میاں مشیر، مداح، کامل اور وحید کے سلام

انیسویں صدی عیسوی کا ستیرا حصہ رثائی ادب کی تاریخ کا سنہرا باب یعنی دورِ عروج قرار پاتا ہے، جسمیں میر انیس، مرزا دبیر نے رثائی ادب کو منزلِ کمال تک پہنچا دیا۔

مذکورہ صدی کے چوتھے یعنی آخری حصے میں میر انیس خلف میر انیس، پیارے صاحب رشید وغیرہ کے سلاموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

جسطرح دکن میں مرثیہ نگاری اور عزاداری سے متعلق اکثر مصنفین اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ مرثیہ نگاری کو مذہب سے جوڑتے ہوئے مرثیہ نگاری کا بنیادی محرک بہمنوں کے آخری دور میں حکمرانوں کا شیعیت کیطرف رجحان قرار دیتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا شکار ہونے والے محققین میں ڈاکٹر مسیح زماں اور ڈاکٹر صفدر حسین کے علاوہ ڈاکٹر رشید موسوی بھی شامل ہیں، جسکا ذکر راقمۃ الحروف نے ایم فل کے مقالے میں کیا ہے[۱] بالکل اسیطرح دلبستان لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کی ترقی کے سلسلے میں بھی یہ خیال حقیقت سے بالکل ہی بعید ہے کہ رثائی ادب کا ارتقاء شاہان اودھ کی شیعیت کے باعث ہوا۔ اگر شیعیت اسکا باعث ہوتی تو میر انیس اور مرزا دبیر جیسے کئی شاعر بن چکے ہوتے۔ یہ تو اک حسین اتفاق ہے کہ ایک ہی عہد میں مرثیہ نگاری کے افق پر آفتاب اور ماہتاب دونوں جگمگائے۔ جسکے بعد صنف مرثیہ و سلام کو نہ ہی کوئی انیس میسر ہوا اور نہ ہی کوئی دبیر۔

---

[۱] - تقابل حیدرآباد میں مرثیہ اور عزاداری — سیدہ زہرا صفحہ ۲۱

اسمیں کوئی شک نہیں کہ نوابین اودھ کو شعر و سخن سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور مذہب سے وابستگی بھی انکا شعار تھا - جن میں آصف الدولہ، سعادت علیخاں اور شجاع الدولہ کے نام سرفہرست ہیں - امام باڑہ آصفی کی تعمیر انکی مذہب سے وابستگی کی آئینہ دار ہے اسکے باوجود اس دور میں رثائی ادب نے اتنی ترقی نہ کی - رثائی ادب یعنی مرثیہ و سلام کے عروج کا وہ دور ہے جبکہ سلطنت اودھ زوال کی طرف مائل تھی -

سلطنت اودھ کے گیارہ (۱۱) حکمران ہوئے اس سلطنت کے آٹھویں حکمران نصیر الدین حیدر گزرے ہیں - یہ دور ضمیر اور خلیق کا دور تھا جو سلام گوئی کا دورِ تعمیر قرار پاتا ہے، لیکن اگر اس دور کا سیاسی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بادشاہ اندرونی سازشوں کا شکار ہو کر صرف شطرنج کا ایک مہرہ بن چکا تھا اور سلطنت مائل بہ زوال تھی -

سنہ ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر کا انتقال ہوا جسکے بعد محمد علی شاہ حکمران ہوئے انہوں نے سنہ ۱۸۳۷ تا سنہ ۱۸۴۲ء حکومت کی - جسکے بعد اودھ کے حکمران امجد علیشاہ اور واجد علیشاہ گزرے - امجد علیشاہ نے سنہ ۱۸۴۲ء تا سنہ ۱۸۴۷ء یعنی صرف پانچ سال اور واجد علیشاہ نے سنہ ۱۸۴۷ء تا سنہ ۱۸۵۶ء یعنی کل نو سال حکومت کی جسکے بعد حکومت کا تختہ ہی الٹ گیا - سلطنت اودھ جسنے سو اسو سال سے بھی زائد عمر پائی تھی اب آخری سانس لینے لگی، اور یہی دور وہ تھا کہ جبکہ میر انیس و مرزا دبیر فلک مرثیہ

گوئی پر مانند آفتاب و ماہتاب جگمگانے لگے یعنی سلطنت کا زوال گویا رسائی ادب کا دورِ عروج قرار پاتا۔ یہ ثبوت ہے کہ مرثیہ و سلام کا ارتقاء نہ ہی شاہان اودھ کی شیعیت کا باعث ہے اور نہ ہی انکی سرپرستی کو ان اصناف کے عروج میں کوئی دخل ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی "دبستانِ دبیر" میں لکھتے ہیں

"انیس و دبیر کی زندگی میں ہی سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں اس صنفِ سخن کا نہ صرف یہ کہ باقی رہنا بلکہ صالح خطوط پر برابر آگے بڑھتے رہنا اسکا ثبوت ہے کہ مرثیہ شاہی سرپرستی کے سہارے آگے نہیں بڑھا بلکہ اس صنفِ سخن میں خود اتنی جان اور قوت موجود تھی جو کسی صنفِ سخن کو عوام میں مقبول بناتی اور اسے ہمیشہ زندہ رکھتی ہے" [1]

رثائی ادب کا عروج نہ صرف لکھنؤ میں سلطنت اودھ کے زوال کے بعد ہوا بلکہ دلی میں بھی نعتیہ و رثائی ادب کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا کہ آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے عہدِ حکومت میں ہی اس ادب کو فروغ ہوا۔

ہرم شری علی جواد زیدی لکھتے ہیں

"دلی میں بہادر شاہ ظفر کا دور اور لکھنؤ میں ضمیر و خلیق کا دور

---

[1] دبستانِ دبیر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۱۲۹

لٹتی ہوئی سرکاروں کا دور تھا۔ اس دور میں منقبتی اور
مرثائی ادب اپنے عروج کو پہنچا اور صاحب اعتقاد شاعروں
کا ایک پورا گروہ ابھر آیا" [1]

دبستان لکھنؤ کے قیام کے بعد مرثیہ نگاری کے کل تین دور گزرے ہیں۔
سب سے پہلا دور تو دلی سے ہجرت کر کے آئے ہوئے شعراء کا ہے جنھیں مہاجر شعراء بھی کہا
جاتا ہے جنمیں میر، سودا، ضاحک اور میر حسن ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

دوسرا دور خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح کا ہے جو دورِ تعمیر کہلاتا ہے
دبستان لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کا تیسرا اور اہم دور جو دورِ عروج کہلاتا ہے، میر انیس، مرزا
دبیر، مونس، تعشق اور پیارے صاحب رشید کی شخصیتوں کے گرد گھومتا ہے۔

دورِ تعمیر یا اس سے قبل کی سلام نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچ
چکے ہیں کہ انیس و دبیر سے قبل سلام بہ نسبت مرثائی کے نعتیہ و منقبتی زیادہ ہوا کرتے تھے
لیکن میر انیس و مرزا دبیر کے عہد میں سلام کا محور واقعات کربلا ہیں لیکن اسکے باوجود ان
میں بھی حمد و نعت اور منقبت ملتی ہے۔

اپنے سلام کی مرثائیت سے متعلق خود ہی کہتے ہیں

تیرے سلام میں ہے مرثیے کا سارا لطف
انیس نظم غم شہ میں اک کتاب بنا۔

---

[1] "العلم" مرثیہ و سلام نمبر مدیر یوم الشہری علی جوادی زیدی ص ۲۱

چنانچہ میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام میں اسلامی تاریخ کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان دونوں اساتذۂ فن کے حالاتِ زندگی معروف ہیں لیکن ربط کے خیال سے مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے

میر انیس :۔ میر ببر علی نام تھا اور انیس تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری وراثت میں پائی تھی۔ لہذا بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل ہونا فطری تھا۔

شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا جسمیں حزیں تخلص کیا کرتے تھے۔ والد محترم میر خلیق نے انہیں استادِ سخن جناب ناسخ کی شاگردی میں دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس نے اپنی شاعری کا آغاز تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں ہی کیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی سے پڑھی تھیں۔ ساتھ ہی فن سپہ گری اور فن شہسواری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

سفارش حسین رضوی میر انیس کی تعریف اسطرح کرتے ہیں

"میر حسن کے فن اور میر خلیق کی زبان کے امتزاج سے تیار کیا ہوا مرکب جسمیں شاعر کے ذہن کی آب اور طبیعت کی تاب ہے"[1]

اردو شاعری کی تاریخ میں شائد ہی کوئی شاعر ایسا ہو جسکے خانوادے میں شاعری نسبت پانسبت سے چلی آرہی ہو۔ یہ شرف تو صرف میر انیس کو حاصل ہے کہ شاعری کا آغاز جد امجد میر امانی سے ہوتا ہے اگرچہ کہ میر امانی کا نمونۂ کلام

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی صہ ۲۱۴

دستیاب نہیں ہوتا۔ باوجود اس کے بقول خود میر انیس

؎ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ہمیں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ میر امامی بھی شاعری کا شغف رکھتے تھے لیکن میر ضاحک سے باضابطہ نمونۂ کلام دستیاب ہوتا ہے جو قبل ازیں ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔ راقمۃ الحروف نے اپنے اس زیر نظر مقالے میں خانوادۂ انیس کے کل سات شعراء کا انتخاب کیا ہے لہٰذا چاہتے ہوں کہ سلسلۂ تذکرہ میر انیس خانوادۂ میر انیس کا مختصراً نقشہ بطور شجرہ پیش کیا جائے تاکہ مندرجۂ ذیل شخصیتیں گوشۂ ذہن پر ابھر آئیں۔

شجرۂ خانوادۂ میر انیس

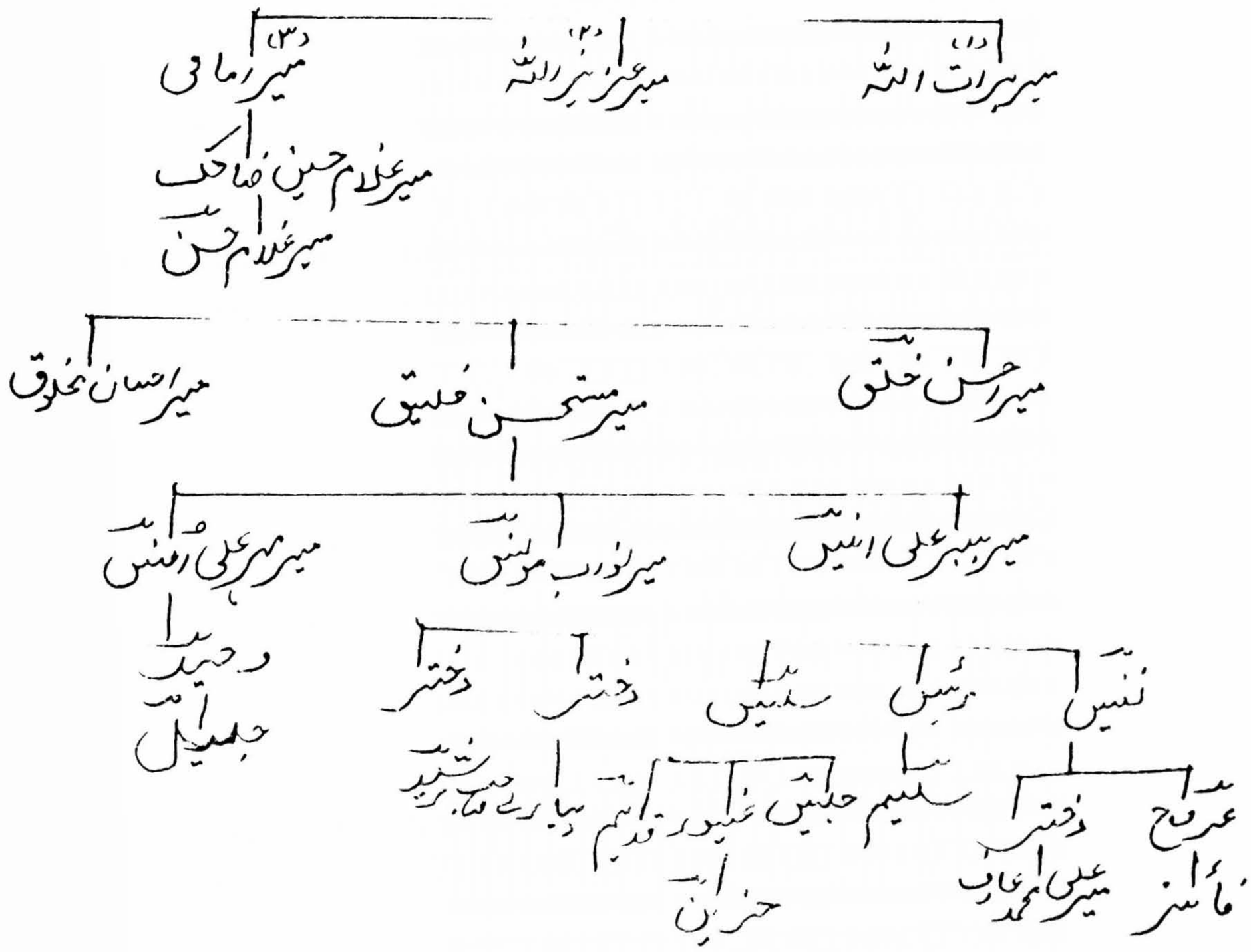

مندرجہ شجرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر انیس کثیر العیال تھے اور انھیں سے خاندان کا سلسلہ چلتا رہا۔ شائد ہی کوئی شاعر ایسا ہو جسکے ثبت ہا ثبت یعنی اسلاف اور اخلاف دونوں ادب سے مربوط ہوں۔ اور ایک حسین اتفاق یہ کہ دختر کا رشتہ بھی ایسی جگہہ طئے پایا کہ جو دلستانِ عشق سے مربوط تھے۔ پیارے صاحب رشید اسی کے چشم و چراغ تھے۔

میر انیس کی غزل گوئی کا سلسلہ زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہا۔ اپنے والد میر خلیق کی ہدایت پر انہوں نے توشۂ آخرت جمع کرنے کیلئے صنف مرثیہ کا انتخاب کیا اور تا زندگی رثائی ادب کے لئے اپنی شخصیت کو وقف کر دیا۔

میر انیس کی ولادت کے بعد فیض آباد کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ آئے۔ دنیا بھر نہ صرف انیس ساتھ تھے بلکہ چھوٹے بھائی انس بھی ساتھ تھے۔ لیکن والد میر خلیق کے فیض آباد ہی میں رہنے کی وجہ سے فیض آباد سے تعلق برقرار رہا۔ بعد ازاں جب سب لوگ لکھنؤ آ چکے تو مستقل سکونت یہیں پر اختیار کی اور کل گیارہ سلاطین اودھ میں سے میر انیس نے چھ سلاطین اودھ کا عہد دیکھا اور سلطنت اودھ کے خاتمے یعنی ۱۸۵۶ء تک لکھنؤ سے کہیں باہر نہ گئے اگر کوئی خواہش بھی کرتا تو ٹال جاتے تھے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ شاہی دربار سے وابستہ تھے بلکہ یہ بڑے ہی خوددار واقع ہوئے تھے، امراء و رؤسا سے بڑی احتیاط سے ملتے۔ بادشاہِ وقت کے پاس سے اگر بلاوا بھی آتا تو اسوقت تک نہیں جاتے جبتک کوئی انہیں لینے کے لئے نہ آتا۔

بچپن ہی سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ پیر و مرشد اکبر حیدری کاشمیری تصنیف

"اردو مرثیہ" میں اپنے مضمون "اردو مرثیہ لکھنؤ میں قبل انیس و دبیر" کے تحت میر انیس کی مرثیہ گوئی کے آغاز سے متعلق لکھتے ہیں

"میاں دلگیر لکنت کی وجہ سے منبر پر مرثیہ نہیں پڑھ سکتے تھے فصیح آخری عمر تک مکہ معظمہ میں مقیم ہوئے۔ میر خلیق اور میر ضمیر بڑھاپے کے پلنگ پر آرام کرنے لگے۔ منبر میر انیس شاگرد خلیق اور مرزا دبیر شاگرد ضمیر کے ہاتھ رہا" [1]

چنانچہ میر خلیق کی زندگی ہی میں میر انیس شہرت پا چکے تھے۔ والد اور میر ضمیر کے انتقال کے بعد تو گویا صنف مرثیہ کے ارتقاء کی ادبی ذمہ داری میر انیس اور دبیر نے قبول کی۔

اس دور میں شاعری کا چرچا تو تھا ہی لیکن اسکا معیار پستی کی طرف مائل تھا۔ شاعری ابتذال کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن میر انیس نے صنف مرثیہ میں اخلاقی اقدار اور مرثیے کے کرداروں کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا۔ ساتھ ہی انکے حق پرستی، ایثار و قربانی کے جذبات کی ہو بہو تصویر کھینچ دی جس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بعد ازاں میر انیس نے معاشرہ اور ماحول پر زبردست وار کیا۔

ناقدری عالم کی شکایت نہیں مولا — کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا — میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے

---

[1] اردو مرثیہ مضمون اردو مرثیہ لکھنؤ میں قبل انیس و دبیر ص ۴۹

جس سے متعلق سفارش حسین رضوی لکھتے ہیں

"انیس نے جس انداز سے ماحول پر ضرب لگائی وہ انہی کا کام تھا۔ دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسکے بعد انیس کو ماحول سے اسطرح کی شکایت نہوئی۔ انکے کلام کی مقبولیت بڑھنے لگی اور اسکے ساتھ ہی انیس کا انداز بیان بھی" [1]

شمالی ہند میں سلام نگاری کیساتھ بھی وہی ہوا جو اردو نظم و نثر کے آغاز و ارتقاء کے سلسلے میں ہوا تھا یعنی اردو نثر کا آغاز تو نظم سے پہلے ہوا لیکن اسکا ارتقاء اردو نظم کے آغاز و ارتقاء کے بعد ہوا۔ گویا نظم بعد میں آئی اور ابھر چکی۔ بالکل اسیطرح شمالی ہند میں سلام نگاری کا آغاز پہلے دہلی میں ہوا، بعد ازآں لکھنؤ میں۔ لیکن دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے شعراء نے اپنا رنگ جما لیا، اگرچہ کہ ایک عرصے تک دبستانِ لکھنؤ کے مشہور و معروف شعراء جنکا شمار دورِ تعمیر کے شعراء میں کیا جاتا تھا، اپنے متقدمین یعنی دبستانِ دہلی کے شعراء کا رنگ غالب رہا جو کہ بالکل رثائی تھا باوجود اسکے مقبولِ عام کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ ایک عرصے تک دبستانِ لکھنؤ کے شعراء بھی اسکی پیروی کرتے رہے یہاں تک کہ میر ضمیر کے شاگردِ خاص مرزا دبیر نے بھی اسی رنگ کو اپنایا اور انکا سارا کلام اس رنگ کی نمائندگی کرتا ہے لیکن میر انیس کے سلام اس سے مختلف حیثیت کے حامل ہیں۔

جسطرح دکنی مرثیہ اسوقت تک "مرثیہ برائے رثا" کے ہی نظریئے پر

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۳۱۹

کاربند رہا جب تک کہ وہ شمالی ہند میں میرؔ اور سوداؔ کے ہاتھوں نہ پہنچا۔ لیکن میرؔ اور سوداؔ نے "مرثیہ برائے ادب و رثاء" کے نظریئے پر عمل آوری کی۔ بالکل اسی طرح صنفِ سلام بھی سوداؔ کے ہاتھوں پہنچکر نہ صرف جذباتِ عقیدت کا نمائندہ یعنی بلکہ ادبی وزن و وقار سے بھی ہم آہنگ ہوئی اور میر انیسؔ نے تو اس صنف کو نہ صرف اسکی منزل مقصود پر پہنچا دیا بلکہ اسے وہ معراج عطا کی جہاں کسی اور کا پہنچنا ناممکن تھا۔

ضمیرؔ اور فصیحؔ کے مرثیے میں جن روایات نے ادبی اقدار کی پاسداری کی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ تمام ادبی قدریں صنف سلام میں بھی داخل ہو گئیں لیکن میر انیسؔ نے وفا کو ترک نہیں کیا بلکہ اسمیں ایک مخصوص طرح کا تغزل پیدا کر دیا لیکن رندی و سرمستی کو بالکل راہ نہ دی بلکہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کے باوجود بھی صنف سلام غزل سے بالکل علیحدہ ہی رہی گو کہ میر انیسؔ کے ہاں سلام کے کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جو غزل میں داخل کر دیئے جائیں تو شناخت مشکل ہو جائے۔

؎ جو آبرو کا ہے طالب تو کر عرق ریزی
یہ کشمکش ہوئی تب پھول سے گلاب بنا

؎ مثالِ شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے
نہالِ عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا

؎ نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا۔

انیس کے سلاموں میں (خاکساری)، عجز و انکساری)، عرق ریزی و مشقت کا پیغام سخاوت، شجاعت، حق [illegible]، باطل سے نفرت، خدا کی خوشی بزرگی اور عظمت پر اعتماد کامل جیسے اخلاقیات کے درس ملتے ہیں۔

سلام تحت اللفظ کا آغاز میر ضمیر سے ہوا تھا۔ میر انیس کے ہاں سلام تحت اللفظ اور سلام سوز دونوں ادا ہیں۔ تحت اللفظ کے سلاموں میں نعت و منقبت کا رنگ زیادہ غالب ہے تو سلام سوز مرثیائی عنصر کی عکاسی کرتے ہیں۔

"انیس کے سلام" میں پروفیسر علی جواد زیدی نے تحت اللفظ اور سوز کے سلاموں کو علیحدہ ترتیب دیا ہے۔ تحت اللفظ کے سلام حمد، نعت، منقبت، واقعہ معراج، دین اسلام کی عظمت و بزرگی اور [illegible] پر مشتمل ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سلام

اسی کا نور ہر اک شئے میں جلوہ گر دیکھا
اسی کی شان نظر آئی جدھر دیکھا

علیؑ کو حق نے اتارا تو عین کعبہ میں
کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا

ہمیشہ فرشِ مُشجّر پہ جو کہ بیٹھے تھے
نہ ان کی قبر پہ بھی سایۂ شجر دیکھا

خوشا وہ اوجِ علم دار و روضۂ شبیرؑ!
خدا کے نور کا جلوہ ادھر اُدھر دیکھا

ہر روز عید بھی آیا جو کوئی ملنے کو
غمِ حسینؑ میں عابدؑ کو نوحہ گر دیکھا

جو رازِ کرسی و عرشِ عظیم لوح و قلم
وصی کا نور ہر اک شئے میں جلوہ گر دیکھا

جو کچھ تمہارے نرق قدر مال وہ گھر بیٹھے
ہزار شکر نہ ہم نے کسی کا در دیکھا

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا۔

سلام

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

فشار سے جو بچا میں، ہوا زمین کو عُجب
صدا یہ قبر نے دی حکیم بوتراب نہ تھا

حسینؑ اور طلبِ آب اے معاذ اللہ
تمام کرتے تھے حجت سوالِ آب نہ تھا

حضورِ شاہ پھر آیا کہاں سے حُر شہید
خطا کی راہ میں گر جادۂ صواب نہ تھا

فقط حسینؑ کے بچوں پہ بند تھا پانی
بہت قریب تھی وہ نہر قحطِ آب نہ تھا

ثمر شجر کو دیا جحل کو زر صدف کو گہر
وہ کون تھا کہ علیؑ سے جو فیضیاب نہ تھا؟

ہوا تھا پیاسوں کے حق میں جو آسمان بخیل
کہ مینہ کا ذکر تو کیا پارۂ سحاب نہ تھا

فراقِ شاہ میں صغرؔا کو نیند کیا آتی
وہ شب تھی کونسی جو دل کو اضطراب نہ تھا

زہے رسولؐ زہے قرب اور خوشا معراج
وہاں گئے کہ فرشتہ بھی بار یاب نہ تھا

برہنہ اونٹنیہ سیدانیاں تھیں بلوے میں
وہ دیکھتے تھے تماشہ حجابِ حجاب نہ تھا

غضب کی جاہے کہ دربار میں ستمگر کے
کھڑی تھیں بنتِ علیؑ اور کچھ حجاب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ ہیہ کہ غلامِ ابوتراب نہ تھا۔

سلام

اے اسلامی! تیغ دشمن کا گر نہیں ہوتی نہیں
حفظِ خالق سے کوئی بہتر سپر ہوتی نہیں

کہتے تھے حضرت رہے گا عصر تک باران تیر
یہ مہم جب تک نہ کٹ جائے سر ہوتی نہیں

جو تھے شرجاں دینے پر خدا کی راہ میں
گرد کیں سوزخم عاشق کو خبر ہوتی نہیں

سہتے تھے حضرت عمِ عباسؑ نے خم کر دیا
بے لحد میں سوئے اب سید بھی کمر ہوتی ہیں

ہل گیا عرشِ خدا زینبؑ نے جب فریاد کی
آہِ ماتم دار ہرگز بے اثر ہوتی ہیں

یا علیؑ حق میں انیسؑ زار کے کیجے دعا
میرے مولا اب کسی صورت بسر ہوتی ہیں۔

سلام

امیر جس در دولت پہ اک زمانہ ہوا
وہ گھر اجڑ گیا غارت وہ کارخانہ ہوا

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

یہ انقلاب غضب کا ہے یا علیؑ فریاد
کہ مسجدیں تھیں جہاں واں شراب خانہ ہوا

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر
جہاں جہاں میری قسمت کا آب و دانہ ہوا

بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ
اٹھو انیسؔ اٹھو کارواں روانہ ہوا

سلام

شبیہ امام زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں

جگہ مولیٰ کی ہے مزاروں کی خاطر
زمیں پر شہ دیں نشاں کھینچتے ہیں

بہت تو نے پیسا ہے اک دن تجھے بھی
شکنجے میں اے آسماں کھینچتے ہیں

قریں سر کے ہے آفتاب قیامت
لحد پر عبث سائباں کھینچتے ہیں

اگر میں نہیں یوسف مصر معنی
تو کیوں چاہ سے قدرداں کھینچتے ہیں

دکھا دوں زمین نجف کی بلندی
بہت آب کو آسماں کھینچتے ہیں

ق

تپ غم کی شدت میں کہتے تھے عابدؑ
عجب سختیاں استخواں کھینچتے ہیں

سبک باری امت جد کی خاطر
ضعیفی میں بار گراں کھینچتے ہیں

سلام

جز پنجتنؑ کسی سے تولا نہ چاہیے
غیر از خدا کسی کا بھروسہ نہ چاہیے

خادم امیدوار حضوری ہے یا حسینؑ
چاہیں اگر حضور تو پھر کیا نہ چاہیے

اک در پہ بیٹھ کر ہے توکل کریم پر
اللہ کے فقیر کو پھیرا نہ چاہیے

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر اب
ایذا بھی چار دن ہو تو شکوہ نہ چاہیے

کہتے تھے شاہ پیاس میں لذت ہی اور ہے
دریا کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا نہ چاہیے

یارب گناہ گار ہو خاطی ہوں رحم کر
مختار سے غلام کو پردا نہ چاہیے

صغرا نے شاہِ دیں کو لکھا خط تو بھیجیے ق گر جا ہتے نہیں ہمیں احیا نہ چاہیے
دو بیٹیاں تو پاس ہوں اک جاں بلب بعید میں ہیچ ہو یہ آپکو بابا نہ چاہیے
فرقت رہی تو کون سی ہے زندگی کی شکل بیمار پر عتاب مسیحا نہ چاہیے
کہتے تھے فاطمہ سے علی گھر میں جو ہو درد خالی کبھی فقیر کو پھیرا نہ چاہیے
کبرے سفید دیتے جو قاسم نے بولی ماں ق اتنی بھی سادگی نئے دولھا نہ چاہیے
دولھا نے عرض کی کہ اجل ہے گلے کا ہار چہرے پہ مرثیہ سننے والوں کے پھرا نہ چاہیے
کہتی تھی فضہ شام میں بازار لیو شہو ق زہرا کی بیٹیوں کا تماشہ نہ چاہیے
یہ کون بیبیاں ہیں تمہیں کچھ نہیں خبر آلِ رسولؐ پر ستم ایسا نہ چاہیے
آزار تو نہ دو جو حمایت نہ ہو سکے کیوں ظلمہ گو لیو، چاہیے یہ یا نہ چاہیے

ہر قدح چراغ داغ سے روشن رہے انیسؔ
شب کو آپکے گھر میں اندھیرا نہ چاہیے۔

مندرجہ بالا سلام تحت اللفظ کے تحت لکھے گئے اگرچہ کہ مثالیں کچھ زیادہ ہی دی گئیں لیکن اسکا مقصد یہ ہے کہ تحت اللفظ اور سوز کے سلاموں میں جو فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔ تحت اللفظ کے سلاموں میں بھی رثائی عناصر ملتے ہیں۔ لیکن زیادہ غلبہ اخلاقیات کا ہے جسکا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ اخلاقیات کے دائرے میں میر انیسؔ خدا و رسولؐ، پنجتن پاک اور چہاردہ معصومین سے

وابستگی کی ہدایت کرتے، زندگی کی ناپائیداری کی وضاحت کرتے ہوئے خاکساری کی زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ میر انیس کے تحت اللفظ کے سلاموں میں کم سلام ایسے ہیں جنکا آغاز لفظ سلام، سلامی اور بخبرائی سے ہوتا ہے ورنہ بقیہ تمام سلام ان الفاظ کے بغیر ہی ملتے ہیں اور ساتھ ہی تحت اللفظ کے سلاموں میں انیس کے ہاں قطعہ بند شعر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہم سلام ایسے ملیں گے جسمیں قطعہ بند اشعار نہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مثال میں اس سلام کو بھی پیش کیا گیا ہے جسکے اشعار قطعہ بند میں علاوہ ازیں سوز کے سلاموں کی بھی مثال بھی پیش کی گئیں ہیں۔

سلام

آبِ خنجر سے گلا جب شاہ کا تر ہو گیا
پانی پانی اے سلام! غم سے کوثر ہو گیا

نہر پر جب قتل عباسِ دلاور ہو گیا
رو کے شہ چلائے میں اب بے برادر ہو گیا

حیف ہے یا رو نہ دی اک بوند پانی کی اسے
جسکی خاطر کے لئے دو ٹکڑے گوہر ہو گیا

حلق پر بے آب خنجر پھیر کر کہتا تھا شمر
کیوں حسین ابنِ علیؑ اب تو گلا تر ہو گیا

کہتی تھی بالو میری قسمت کی گر دش دیکھنا
گھنٹیوں چلنے نہ پایا قتل اصغر ہو گیا

دیکھکر خیمے کی جانب رو دیا عباسؑ نے
مشک میں پیوست جب تیر ستمگر ہو گیا

ہوئے غش جب حضرتِ شبیرؑ گھوڑے سے گرے
مستعد تب قتل پر شمر ستمگر ہو گیا

دیکھکر لاشے کو اکبرؑ کے یہ بالو نے کہا
حیف ہے دیا سا تو ہے جاں میرے دلبر ہو گیا

پوچھتی تھی راہگیروں سے سکینہؑ شام میں
کربلا میں دفن فرزندِ پیمبر ہو گیا

ق

تیرا صغرؑ کو لگا کر شہ سے بولا حرملہ
دور اب تو دل سے سرورِ داغِ اکبرؑ ہو گیا

شہ نے فرمایا رضائے حق پہ راضی ہے حسینؑ
زخم کا اکبرؑ کے مرہم داغِ اصغرؑ ہو گیا

جو ہوا بیمار اندوہِ شہِ دیں میں انیسؔ
اوجِ اصحابِ مسیح اسکو میسر ہو گیا۔

سلام

اے مجرئی ہے سب کا مقدر جدا جدا
رتبے میں ہیں گدا و تونگر جدا جدا

کیا کیا لڑے تھے رن میں بہتر جدا جدا
مجرائی شہ پہ صدقے کئے سر جدا جدا

قتل سے شہر شہر گئے طائرانِ دشت
سبطِ نبی کے خوں میں بھرے پر جدا جدا

زینبؑ یہ بولیں بیٹوں سے باہم چلے تو ہو
ق لڑیو سپاہ شام سے جا کر جدا جدا

جرأت میں ایک سے ہو یہ جی چاہتا ہے آج
دکھلاؤ شانِ حیدرؑ و جعفرؑ جدا جدا

کہتے تھے شاہ کل تلک اک جا تھے اور آج
ق ٹکڑے پڑے ہیں خویش و برادر جدا جدا

اعدا کی تیغِ ظلم نے ڈالا یہ تفرقہ
سر تن سے اور سروں سے ہیں پیکر جدا جدا

فیضِ غمِ حسینؑ سے ہوتے ہیں اے انیسؔ
ہر سال ایک حال کے دفتر جدا جدا

سلام

کیا کیا نہ زمانے میں سنا کیا نہیں دیکھا
اے مجرئی شبیرؑ سا آقا نہیں دیکھا

حر کہتا تھا حضرت کی طرف دیکھ لے آ کر
جس شخص نے فردوس کا رستا نہیں دیکھا

کہتے تھے عدو بھائی پہ آنچ آنے نہ دی واہ
عباسؑ سا شبیرؑ کا شیدا نہیں دیکھا

کہتی تھی سکینہؑ مجھے صورت تو دکھاؤ
میں نے کئی دن سے تمہیں بابا نہیں دیکھا

ق

شہ لاشۂ اکبرؑ سے یہ کہتے تھے لکھوں کیا
قاصد نے تو اکبرؑ تمہیں جیتا نہیں دیکھا

میں نے پڑھی لکھی تھی جو اپنی مصیبت
افسوس کہ تم نے خطِ صغراؑ نہیں دیکھا

کیا روضۂ سرور پہ انیسؔ آنکھوں کو ملتے
افسوس مزارِ شہِ والا نہیں دیکھا

سلام

مجرئی شاہ کا ہوں خلد میں ہے گھر میرا
منتظر حوریں ہیں مشتاق ہے کوثر میرا

شاہ کہتے تھے لعینو نہ ستاؤ مجھ کو
ماں ہے زہراؑ میری نانا ہے پیمبرؐ میرا

کہتی تھی بالی سکینہؑ کہ بچاؤ بابا
بدگہر چھینے لئے جاتا ہے گوہر میرا

بانو کہتی تھی کہ جنگل میں ڈرے گا لوگو
کبھی تنہا نہیں سویا علی اصغرؑ میرا

ق

کہتی تھی رو رو کے بانو یہ توقع تھی مجھے
کہ اٹھائیگا جنازہ علی اکبرؑ میرا

میں تو جیتی رہی اور اٹھ گئے وہ دنیا سے
انکی تقصیر نہیں کچھ ہے مقدر میرا

گر فلک مجھ سے ہے برگشتہ تو کیا غم ہے انیسؔ
پنجتن حامی ہیں اللہ ہے سر پر میرا

سوز کے سلاموں میں بھی قطعہ بند اشعار ملتے ہیں۔ سانحہ ہی سوز کے زیادہ سے زیادہ سلام لفظ سلام، سلامی اور مجبرائی سے شروع ہوتے ہیں، اور تحت اللفظ کے سلاموں سے اسکی تعداد زیادہ ہے سوز کا تقریباً ہر سلام اسقدر ہوئر ہے کہ اسکو پڑھکر انسان کے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ ہر چشم انھیں پڑھکر اشکبار ہو جاتی ہے۔ میر انیس کے سلام طوالت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کوئی بھی سلام ایسا نہیں جو پندرہ اشعار سے کم ہو۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ انیس کے سلاموں کی مثالیں زیادہ ہی ہو سکیں جسکی وجہ یہ ہے کہ انیس کے سلام دو طرح کے ہیں (۱) تحت اللفظ (۲) سلام سوز اور اسکے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ میر انیس کا ہر سلام شاہکار حیثیت رکھتا ہے۔ مثالوں کے لیئے سوچنا پڑتا ہے کہ کونسے سلام کو نہ پیش کیا جائے۔

سفارش حسین رضوی انیس کے کلام پر تبصرہ کرنے کیلئے خود انہیں کا ایک سوز پیش کرتے ہیں،

؎ ہے گوہر محیط فصاحت سخن میرا گویا ہے موتیوں کا خزانہ دہن میرا
ہے مرغ خوانی گل زہرا چمن میرا محفوظ ہے جہاں میں خزاں سے چمن میرا
بلبل نے ایسے نغمۂ رنگیں سنے نہیں
دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چنے نہیں [1]

میر انیس کے مندرجہ بند سے حقیقت بیانی جھلکتی ہے یہ ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ وہ خودستائی کے مرتکب ہو رہے ہیں بلکہ قاری مطمئن ہو جاتا ہے کہ خود میر انیس نے اسکے دل کی بات کہکر اسکا بوجھ ہلکا کر دیا۔

---

[1] اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی صد ۲۳۲

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ میر انیس سلطنت اودھ کے خاتمے تک لکھنؤ سے باہر نہ نکلے۔ لیکن سلطنت اودھ کی تباہی کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں نواب قاسم علی خاں کے اصرار پر یہ عظیم آباد گئے۔ بعد ازاں شہر بنارس کو بھی یہ شرف ملا اور ساتھ ہی شہر حیدرآباد بھی نازاں ہے کہ میر انیس نے کچھ عرصے کے لئے اپنی آمد سے اسے بھی زینت بخشی۔ ۱۸۷۱ء میں مولوی شریف حسین خاں اور تہور جنگ بہادر کے بیحد اصرار پر وہ یہاں آئے۔ جہاں بھی گئے وہ اپنی فن مرثیہ گوئی سے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے۔ شہر الہ آباد بھی میر انیس کی آمد سے مستفیض ہوا۔ بالآخر ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۴ء میں میر انیس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

رام بابو سکسینہ نام تو نہیں بتاتے لیکن لکھتے ہیں کہ کسی نے میر انیس کی مادۂ تاریخ نکالی ہے جس سے مرزا دبیر کا سن وفات بھی نکلتا ہے واقعی تاریخ بہت خوب ہے۔

؎ غم انیس میں ہے ہے دیا دبیر کا غم۔ [1]

۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

مرزا دبیر: — مرزا دبیر دلی میں ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ م ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو محلہ بلیماراں میں پیدا ہوئے۔ مرزا دبیر کے مورث اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی مشہور ایرانی شاعر ملا الٰہی شیرازی کے حقیقی برادر تھے۔ یہ خاندان ایران سے ہجرت کر کے دہلی آیا۔ جبکہ سلطنت مغلیہ کا دور دورہ تھا۔ یہاں سلاطین مغلیہ کے درباروں میں اچھے عہدوں پر مامور ہوئے۔ مرزا دبیر کے دادا کے عہد میں تو سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ آہستہ

آہستہ دہلی اجڑنے لگی۔ ان حالات میں شرفاء اپنی عزت ہی کو مالِ غنیمت جان کر اپنے وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ میرزا غلام حسین نے اپنے بیٹے سلامت علی کے ساتھ شہرِ دہلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ آئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس وقت میرزا صاحب وارد لکھنؤ ہوئے تب انکی عمر سات سال تھی۔ یعنی وہ میر انیس سے کافی عرصہ قبل ہی آکر لکھنؤ آباد کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لکھنؤ کے شاعر کہلائے۔ ساری تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ بچپن سے شعری ذوق تھا جسکو محسوس کرتے ہوئے میرزا غلام حسین نے میر ضمیر کی شاگردی میں دیدیا۔

ڈاکٹر حسین فاروقی "دلبستانِ دبیر" میں صفحہ ۱۳۹ پر میرزا دبیر کا ایک بند پیش کرتے ہیں یہ بند فی البدیہہ استاد کے دریافت کرنے پر کہا تھا۔ یہ بند "حیاتِ دبیر" میں بھی ہے۔

کسی کا کندہ نگینہ یہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ اس میں ننام و سحر　　کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

استاد ضمیر اپنے کمسن شاگرد کی صلاحیت سے بیحد متاثر ہوئے اور خود ہی انکا تخلص دبیر تجویز کیا۔ جسکے لغوی معنی مصنف، منشی یا علم کا ستارہ عطارد دبیر فلک کہلاتا ہے یعنی دوسرے معنوں میں ضمیر نے مرزا سلامت علی کو دبیر تخلص دیکر آسمانِ ادب کا عطارد بنا دیا۔ شاگرد نے بھی استاد کا نام خوب روشن کیا۔ اور استاد کے رنگ اور انداز کو تاحیات اپنے سینے سے لگائے رہے۔ نہ صرف مرزا دبیر بلکہ دلبستانِ دبیر سے تعلق رکھنے والے تمام شعراء اسی رنگ کو اپنائے رہے۔ سلطنت اودھ کے چھٹے حکمران نوابِ سعادت علیخاں کے عہد میں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا اور اس سلطنت کے ساتویں حکمران

غازی الدین حیدر کا عہد ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء ہے کے عہد میں اتنی شہرت حاصل کرلی کہ غازی الدین حیدر نے انہیں شاہی امام باڑے میں دعوت سخن دی۔ غازی الدین حیدر کا اس دور کے نہ مشق شعراء کے آگے شاہی مجلس میں یہ انعام مرزا دبیر کے کمال فن کا ثبوت دیتا ہے۔

دینوی علوم منطق، ادب اور حکمت کے علاوہ مرزا دبیر نے مولوی مرزا کاظم علی صاحب سے حدیث و تفسیر اور فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

امداد امام صاحب "اثر" "کاشف الحقائق" میں مرزا دبیر کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شاعری سے علیحدہ ہو کر جناب مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کا درجہ حوصلۂ انسانی کو لبیک کر دینے والا نظر آتا ہے۔ آپ تمام متر صفات ملکوتی سے متصف اور لاریب خاصان خدا سے تھے۔ اولیاء خدا کی خوبیاں در بہ العطایا نے حضرت کو بخشی تھیں۔ آپکی سخاوت و ایثار شہرۂ آفاق ہے علم و فضل کیا تھا توفیق عبادت بہت کچھ حق رئے پاک نے عطا فرمائی تھی۔ اخلاق محمدی کے آپ پورا المونہ تھے"[1]

اخلاق محمدی کا نمونہ قرار دینے کے بعد انکی خوبیاں گنوانا ناممکن ہے بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ مرزا دبیر دنیا و آخرت میں سرخرو اور کامیاب رہے

غازی الدین حیدر کے بعد جب ناصر الدین حیدر کا عہد ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء آیا تو مرزا صاحب کی شہرت آسمان کو چھونے لگی۔ اساتذۂ سخن، ضمیر، خلیق، داگیر اور فصیح

---

[1] کاشف الحقائق امداد امام اثر صد ۵۲۳

کیا تھا انکا نام لیا جانے لگا اور لکھنؤ وہ بھی دور آیا جب ضمیر اور دبیر ہی مرثیہ گوئی کے میدان میں رہ گئے۔

عہد اجد علیشاہ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء دبستانِ لکھنؤ کی رثائی شاعری کیلئے اسوجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اسی دور میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے جبکہ سارے لکھنؤ میں مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کا شہرہ تھا۔ اسٹیج سے ضمیر کے مرزا کے مقابلے میں کوئی نہ آیا لیکن اچانک میر انیس کو اپنے مقابل دیکھکر دبیر نے ہمت نہ ہاری بلکہ سخت محنت اور جانفشانی سے اپنے فن کو سنوارتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلام میں اور بھی پختگی آتی گئی۔

رفتہ رفتہ ضمیر بھی بسبب ضعیفی اس میدان سے ہٹتے گئے جسکے بعد انیس و دبیر ہی ایک دوسرے کے مقابل رہے۔ شبلی نعمانی کی تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" کے عنوان سے ملتی ہے۔ موازنہ شائد اس لیئے جاتا ہے کہ یہ دونوں بھی ہمعصر، ہم مقام اور ہم مشرب تھے۔ ان دونوں استاتذۂ فن کا موازنہ کرکے میر انیس کے مقابلے میں مرزا دبیر کی خامیوں کو نمایاں بھی کیا جاتا ہے جو کہ بہت ہی غلط، غیر ادبی، نامناسب اور نازیبا حرکت ہے۔

امداد امام اثر بھی اسکی سخت مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اگر مرثیہ میر انیس صاحب مرحوم ایک بڑے درجہ کی شاعری تھے اور درجی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہومر یا اور کسی درجی شاعر کیساتھ آپکا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جا سکتا ہے مگر میر صاحب کا موازنہ مرزا صاحب کیساتھ

جبکہ یہ دونوں شاعری کے جداگانہ پہلوؤں کو برتتے
ہیں کوئی معقول شکل نہیں رکھتا۔ رزمی شاعر کا موازنہ
رزمی شاعر کیساتھ اور مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی شاعر
کیساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا" ۱؎

بے شک امداد امام اثر نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ دونوں
فن مرثیہ گوئی سے وابستہ ہیں لیکن باوجود اسکے مرثیہ گوئی میں دونوں کے میدان جدا جدا ہیں۔
میر انیس رزمیہ نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تو رثائی شاعری اور نئے نئے
مضامین قلمبند کرنے میں مرزا دبیر کا کوئی ثانی نہیں۔ دونوں کی اہمیت اور شہرت اپنی جگہ
مسلّم ہے لیکن کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا یا کمتر قرار دینا گویا رثائی ادب کی توہین کرنا ہے۔
عظیم امروہی رسالے "العلم" مرثیہ و سلام نمبر میں اپنے مضمون "دبیر کے دبستان
امروہہ پر اثرات" کے تحت انیس و دبیر کے مرثیے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں نے ملکر لکھنؤ کو مرثیہ نگاری
کا کعبہ بنا دیا" ۲؎

اسی سلسلے میں وہ نسیم امروہی کا ایک بند پیش کرتے ہیں

انیس کون! خدیو سخن خدائے سخن — دبیر شاہ سخن خالق بنائے سخن
انھیں کے جسم پہ زیبا تھی بس قبائے سخن — چراغ دو تھے مگر ایک تھی ضیائے سخن

۱؎ کاشف الحقائق — امداد امام اثر — ص ۵۲۳
۲؎ رسالہ العلم — مضمون دبیر کے دبستان امروہہ پر اثرات — ص ۹۲

نشانہ اک قبا گو مختلف کمانیں تھیں

کہ ذوالفقار کی گویا یہ دو زبانیں تھیں [1]

بہرحال دونوں کی شہرت دونوں کا ادبی وقار مسلمہ ہے جسکا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس عہد میں لکھنؤ میں جتنے بھی مرثیے کے شائقین تھے وہ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے کلام انیس کے شائقین انیسیے کہلائے اور کلام دبیر کو پسند کرنے والے دبیریے کہلائے۔

دبیر اگرچہ خاندانی شاعر نہ تھے۔ باوجود اسکے زبان پر شکوہ استعمال کرتے ہیں ثنائی شاعر ہونے کے باوجود مرثیے کے تمام اجزاء رجز، معرکہ آرائی، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، رزم نگاری پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔

تشبیہات و استعارات بھی بڑی خوبی سے نظم کی ہیں۔ نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں ان ہی کی ایجاد ہیں۔ ایسے دور میں جبکہ شاعری کا کوئی معیار مقرر نہ تھا، اور نہ ہی دبستان لکھنؤ میں مرزا غالب جیسا کوئی مقلد ہے۔ شاعری اتنزال کی جانب گر چکی تھی۔ مرزا دبیر کا نہ صرف اتنزال سے پیر پیکر ہونا بلکہ اخلاقی مضامین کو بکثرت بیان کرنا لوگوں کے ذہنوں کو موڑنے میں ہی کارگر ثابت ہوا۔

مرزا صاحب کی ذاتی زندگی ۱۸۵۱ء کے بعد ایسی قدر آلام و مصائب کا شکار رہی۔ یعنی بصارت کا متاثر ہونا ایک حادثے سے کم نہ تھا۔

آخری معزول حکمراں شاہ اودھ واجد علی شاہ جو کلام دبیر کے مداح اور معتقد تھے مرزا صاحب کی یہ حالت سن نہ سکے۔ انہیں اپنے ہاں کلکتہ بلوا کر انکا باضابطہ

علاج کروایا لیکن شومئی تقدیر کہیے کہ انتھر ۶۹ سال کی عمر میں اپنے فرزند مرزا ہادی حسین عطارد کے انتقال کی وجہ کمر بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی بڑے بھائی نظیر اور اپنے ہمعصر میر انیس کے اس دنیا سے گذر جانے کا صدمہ، صدمۂ جانکاہ تھا جس کے بعد بیماری نے گھیر لیا۔ بالآخر ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ م ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو راہئی ملک عدم ہوئے۔ اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیر کا ذخیرۂ کلام بیس ۲۰ مطبوعہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سلام کی جلدیں "دفتر ماتم" کے نام سے ملتی ہیں۔ علاوہ اسکے غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے قلم کو صرف رثائی شاعری کے لئے وقف کر دیا اور اسی پر وہ فخر کرتے ہیں اور اپنے کلام کی سربلندی اور شہرت کو وہ مدح علیؑ کا سبب بتاتے ہیں۔

سلام

مدح علیؑ میں ہے یہ بلندی کلام کی
عرش بریں زمیں ہے ہمارے سلام کی

لکھتے جو بیت شاہ نجف کے سلام کی
رضواں نے دی صدا مجھے دار السلام کی

مجرائی شاہ دیکھ مزار امام کی
دار السلام کو ہے تمنا سلام کی

کسکو ہوس ہے گلشن دار السلام کی
حیدر کے در پہ بار میں پاؤں سلام کی

بھیجو درود یاد کرو جب امام کی
بے شرط ہر نماز کے خاطر سلام کی

زیر نگین شمس و قمر کیوں نہو جہاں
مہریں ہیں اُون پہ حیدر و صفدر کے نام کی

انصاف و حلم و علم و دلیری و جود و زہد
مجھ پر خدا نے ساری فضیلت تمام کی

پردہ کھلا بلندئ کرسی و عرش کا
مسند ہے وہ علیؑ کی یہ خیر الانام کی

کہہ تو اسی زمین میں دبیر اور اک سلام
پر اسمیں نظم کر تو شہادت امام کی

سلام کی زمین بے شک خوب ہے۔ شائد مرزا صاحب کو یہ زمین بہت بھا گئی
چنانچہ اسی زمین میں دوسرا سلام لکھتے ہیں جسمیں مولائے کائنات حضرت علی ابن ابو
طالب علیہ السلام کی شہادت قلمبند کرتے ہیں۔ جسکا مطلع درج ہے۔

؎ اکسویں شب آئی ہے ماہ صیام کی
بجھتی ہے شمع تربت خیر الانام کی

مقطع۔ بلوائیے دبیر کو روضے پہ یا امام
آقا فقط یہی ہے تمنا غلام کی۔

میر انیس کی طرح مرزا صاحب بھی اپنے وطن کی محبت پر سرزمین نجف کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ سلام کافی طویل ہیں کوئی بھی سلام پندرہ شعر سے کم نہیں۔ اکثر و بیشتر اقرار کرتے ہیں کہ کلام کی بندی کا سبب سوائے مدح علیؑ کے اور کچھ نہیں۔

سلام

تعریف کی ہے نظم ورق امام کی
بیت الحرم ہے بیت ہمارے سلام کی

فضہ نے فوج سے کہا گھر تو جلا چکے
مسند تو اب جلاؤ نہ خیر الانام کی

تن میں بخار پاؤں میں بیڑی گلے میں طوق
عابدؑ نے یوں مسافت منزل تمام کی

کی تیغ تیز شمر لعیں نے تمام شب
روز شہ نے رات طاعت حق میں تمام کی

بانو یہ قبر پر علی اصغرؑ کے کہتی تھی
بیٹا خبر لو مادر ناشاد کام کی

پہلو میں نیزہ سجدے میں سر اور گلے پہ تیغ
اس طرح شہ نے طاعت خالق تمام کی

کیوں چرخ کشتے اہل ستم کے تو ہوئیں دفن
اور لاش بے دفن رہے خیر الانام کی

زینبؑ کو دیکھ دیکھ کے کہتے تھے اہلِ شام
سر ننگے ہے نواسی رسولِ انام کی

مقبول کی یہ نظم شہِ دیں نے اے دبیرؔ
شہرت ہوئی اسی سے ہمارے کلام کی

مرزا صاحب کے تقریباً ہر سلام میں قطعہ بند اشعار ملتے ہیں۔ کچھ سلام ایسے بھی ملتے ہیں جو لفظِ سلام، مجرائی اور سلامی سے شروع نہیں ہوئے ورنہ اکثر سلاموں کا آغاز لفظِ سلام، سلامی اور مجرائی سے ہوتا ہے کچھ سلام ایسے بھی ملتے ہیں جن کے ہر شعر کا آغاز سلامی سے ہوتا ہے۔

اخلاقی مضامین جیسے دردمندی، خلوص و عقیدت، بلند بینی، اخلاق دوستی اور معیار پسندی سب کچھ مرزا صاحب کے سلاموں میں شامل ہے۔ وہ دیرِ اہلبیت کی گدائی کو شاہی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک سلام کے مقطع میں لکھتے ہیں

بے سر و ساماں نہیں ہوں اے دبیرؔ
دیکھنا کل حشر میں ساماں میرے۔

سلام

وصفِ گلِ زہراؑ میں ہیں رنگیں سخن ایسے
جنت میں بھی ہونگے نہ سلامی چمن ایسے

لکھا ہے اٹھایا نہ گیا شاہ سے لاشہ
پامال ہوئے گھوڑوں سے ابنِ حسنؑ ایسے

زینبؑ نے کہا ایک کو جی بھر کے نہ رو دیا
افسوس زمانے سے اٹھے پنجتنؑ ایسے

گردن رہی خم اور نہ بازو سے مٹا داغ
عابدؑ یہ ہوئے صدقۂ طوق و رسن ایسے

زہراؑ نے کہا میں نے ستایا تھا کسے چرخ
جو دکھ میں پڑے میرے حسینؑ و حسنؑ ایسے

اصغرؑ جو گیا خلد میں کہنے لگیں حوریں
بچے نہ یہاں آئے تھے تشنہ دہن ایسے

کیا زینبؑ و شبیرؑ کی الفت کا کہوں حال
تا حشر نہ اب ہوئینگے بھائی بہن ایسے

جز ذات خدا سب تھے دبیرؔ آہ و بکا میں
قتل میں ہوئے شیر خدا نعرہ زن ایسے۔

کچھ سلام تو ایسے ہیں جسے پڑھ کر ہر آنکھ نم ہو جاتی ہے۔ جو دل کے تاروں کو ہلا دیتے ہیں جسکو پڑھ کر میدان کربلا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

سلام

سلامی کہتے تھے ظالم رلاؤ زینبؑ کو
کہ ذبح شہ کو کرو اور دکھاؤ زینبؑ کو

چڑھو حسینؑ کے سینے پہ پہلے تیغ بکف
برہنہ اونٹوں پہ پھر تم چڑھاؤ زینبؑ کو

چلے حسینؑ پہن کر کفن جو مرنے کو
کہا یہ بانوئے بیکس سے لاؤ زینبؑ کو

ردائے فاطمہؑ زہرا اڑھا کے لے آؤ
برہنہ سر نہ مجھے تم دکھاؤ زینبؑ کو

صدائے فاطمہؑ آئی کہ شمر چھینے گا
حسینؑ پیارے نہ چادر اڑھاؤ زینبؑ کو

پکارتی تھی یہ لاشِ حسینؑ قتل میں
کہ ظالمو نہ مصیبت دکھاؤ زینبؑ کو

تڑپ رہا ہے سکینہؑ کے سقّے کا لاشہ
لبِ فرات نہ سر ننگے لاؤ زینبؑ کو

دبیرؔ حق سے کہوں گا دمِ سوال و جواب
کریں گی میری شفاعت بلاؤ زینبؑ کو

مرزا دبیر کے سلام جن کے نمونے پیش کئے گئے وہ تمام کے تمام "دفتر ماتم" جلد شہر دہم سے لئے گئے ہیں۔

مرزا دبیر کے مجموعے "دفتر ماتم" کی وضاحت اسطرح ہو سکتی ہے کہ یہ کل ۲۰ جلدیں ہیں جن سولہویں، سترھویں اور اٹھارویں جلد سلاموں پر مشتمل ہے جن میں تقریباً تین سو سلام ملتے ہیں۔ "نادرات مرزا دبیر" میں بھی چند مراثی اور رباعیات کے علاوہ چند سلام بھی ملتے ہیں جو کہ غیر مطبوعہ ہیں۔ فلک مرثیہ نگاری پر اور کچھ ستارے ایسے ملتے ہیں جنکی چمک مرثیہ نگاری کے آفتاب و ماہتاب کے آگے ماند پڑ گئی جنمیں میر مونس کا بھی شمار ہوتا ہے۔

میر مونس:۔ نام میر محمد نواب اور مونس تخلص تھا۔ میر خلیق کے فرزند اور میر انیس کے برادر خورد تھے۔ ۵ محرم ۱۲۲۶ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد میر خلیق سے حاصل کی اور مرثیہ گوئی میں کسی اور سے نہیں بلکہ اپنے والد بزرگوار ہی کے شاگرد رہے۔ طبیعت بہت باغ و بہار پائی تھی چنانچہ اکثر شعراء کا جمگھٹا رہتا۔ خاندان کو ثیت ہا ثیت سے مرثیہ گوئی کا شرف حاصل تھا۔ لہذا انہیں ہی سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ اور انیس کے ساتھ ساتھ ہی انکی ذہنی تربیت ہوئی۔ چنانچہ انکے کلام پر میر انیس کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکا شمار بھی مرثائی شاعری کے دور عروج میں ہوتا ہے۔

سفارش حسین رضوی مونس سے متعلق لکھتے ہیں کہ میر مونس نے میر انیس سے بہت کچھ لیا۔ لیکن پھر بھی انکی انفرادیت انکے کلام میں ہر قدم پر رہی۔ حسین یادگار نظم

کرنے میں مرزا دبیر کا مقام میر سے بلند ہے لیکن مولنس نے رثائی شاعری میں مرزا دبیر کو پیچھے کر دیا۔ باوجود اسکے گوشہ نشینی کی وجہ سے مقبول عام نہ ہو سکے۔ اسی لحاظ سے انکا شمار مصحفی کے بالواسطہ شاگردوں میں ہوتا ہے لیونکہ خلیق جن سے مولنس نے بالراست مستفید ہوئے وہ مصحفی کے شاگرد تھے۔

مولنس کا کلام منظر نگاری، جذبات نگاری، تشبیہات، مرقع نگاری میں لاجواب ہے اگرچہ کہ مولنس کی شخصیت میر انیس کیطرح مقبول عام نہ ہو سکی باوجود اس کے مولنس کے بھی شاگرد کم نہیں۔

رحیم بابو سکسینہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد کو مولنس کا شاگرد بتاتے ہیں۔

"وہ مرثیہ نہایت موثر اور دلکش طرح سے پڑھتے تھے

راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد

مرثیے میں انکے شاگرد تھے" [1]

علاوہ ازیں راجہ علیشاہ اختر سلطنت اودھ کے آخری حکمران بھی مرثیہ نگاری انیس و دبیر و مولنس سے بیحد متاثر ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے مرثیوں میں کیا ہے۔

مولنس انیس سب کا ہوں میں خوشہ چین باغ
ان کے کلام کو لکھتے ہیں ذاکر کے تر دماغ

---

[1] تاریخ اردو ادب — رحیم بابو سکسینہ — ص ۲۸۴

بڑی بڑی شخصیتوں نے مومنؔ سے استفادہ کرنیکا اقرار کیا ہے۔ کیوں نہ کریں کیونکہ مومنؔ کا خاندان ہی اس فن میں کمال رکھتا ہے۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔

"مومنؔ کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ نگاری میں اپنی خاندانی خصوصیات صرف کرتے ہیں۔ سادگی اور صفائی جیسے انکے خاندان والوں میں پائی جاتی ہے انکے ہاں بھی ملتی ہے۔ کبھی کبھی مشکل زمینیں بھی اختیار کی ہیں لیکن ان میں محاورے اور زبان خوبی کو برقرار رکھتے ہیں۔ سلاموں میں کنائے اور استعارے بھی بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں۔"[1]

زبان کی خوبی پر تو کوئی شک نہیں ہو سکتا کیونکہ سارے خاندان کی زبان پر خلیق کی زبان کی جھلک ملتی ہے۔ خلیق جنکی زبان کا اعتراف خود شیخ ناسخ نے کیا ہے اور ہر کو مشورہ دیتے کہ جسے بھی زبان سیکھنی ہو وہ خلیق کی زبان سیکھے۔ مومنؔ کے کلام میں آمد کی شان پائی جاتی ہے۔ کلام میں زیادہ تر مشکل زمینوں کا انتخاب ملتا ہے۔

مراثی کے علاوہ سلام بھی لاتعداد ملتے ہیں۔ سلاموں کا دیوان "دیوانِ فصاحت" کے عنوان سے مرقعۃ الحروف کو دستیاب ہوا ہے جو ۱۹۱۳ء میں بار دوم شائع ہوا ہے جس میں کل ۲۳۸ رسوا ترسٹھ سلام ہیں جسکے آخری صفحے پر انیس کی وفات پر کہی گئی مومنؔ کی چار رباعیاں ملتی ہیں۔ چونکہ یہ سلاموں کا دیوان ہے اسی لئے ردیف واری سلام ہیں۔

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ابواللیث صدیقی ص ۲۶۷

اکثر سلام ایسے ہیں جو لفظِ سلام، سلامی اور بحرائی سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ سلام ایسے بھی ہیں جنکا آغاز ان الفاظ سے نہیں ہوتا۔ مولنس کے یہاں بھی قطعہ بند سلام ملتے ہیں۔ سلاموں کا یہ دیوان مطبع شاہی لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے۔

سلام گوئی کا مطلب ہی شاعر کا در اہلبیت اور بزرگانِ دین سے وابستگی اور عقیدت کا اظہار ہے لیکن مولنس حد سے زائد ہی عقیدت مند نظر آتے ہیں اور دلپذیر کیطرح اپنے کلام کے مرثیے کو مدح اہلبیت کا حصہ تصور کرتے ہیں جسکا اظہار سلام کے مطلع میں اسطرح کرتے ہیں۔

؎ مولنس تیرے مرثیے جہاں میں
ترقی شناء سے بڑھ گئے ہیں

ایک سلام کے مطلع میں کہتے ہیں

؎ مالِ دنیا کی نہ خواہش ہے نہ کچھ زر سے غرض : دلکو ہے داغِ غمِ سبطِ پیمبر سے غرض

اسی سلام کا مقطع یہ ہے

؎ چار دن کی چاندنی مولنس ہے دنیا کی یہ زیب ۔ مجھکو ہے مدحِ علیؑ اور خاکِ درگاہ سے غرض

ایک سلام کے دوسرے شعر میں اپنے مداح اہلبیت ہونے پر فخر و شکر کرتے ہیں

؎ بخشا خدا نے عہدۂ مداحی حسینؑ — دل شکر کر رہا ہے جدا اور زباں جدا

ذاکر شبیر ہونے پر اپنے آپکو خوش قسمت بتاتے ہیں اور غمِ حسینؑ کے آگے ہر غم کو ہیچ قرار دیتے ہیں

؎ زندگانی میں بڑے رنج سہے مولنس — پر خوشا حال کہ تو ذاکرِ شبیر ہوا

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ابواللیث صدیقی تحریر کرتے ہیں

"سلاموں میں کنائے اور استعارے بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں" [1]

واقعی سلاموں میں استعارے بڑے خوب ہیں۔

؎ خونِ دل کب نہ غمِ شبیر میں بہایا ہمنے۔ کب عقیقِ جگری رونقِ داماں نہوا

غمِ شبیر میں بہائے ہوئے خون کے آنسوؤں کو عقیقِ جگری قرار دیتے ہیں۔

اور اس حقیقت کے قائل ہیں کہ کلام میں اسوقت تک تاثیر پیدا نہیں ہوتی جبتک وہ سوزِ غم سے بھرپور نہو۔ چنانچہ سلام کے مطلع میں لکھتے ہیں۔

؎ اے مجرئی سلام میں تاثیر چاہیے
لگ جائے دل پہ چوٹ وہ تقریر چاہیے۔
نہ کربلا ہے دور نہ باغِ ارم ہے دور
انساں کے دل میں الفتِ شبیر چاہیے۔

مونس کے اکثر سلام بہت ہی موثر ثابت ہوتے ہیں۔

سلام

لہو روتی ہیں آنکھیں مثلِ گل اشکوں میں لالی ہے
ہر اک شاخِ مژہ، اے مجرئی پھولوں کی ڈالی ہے
تباہی میں سفینہ آچکا تھا امتِ جو کا
بہ کشتی بحرِ خوں میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ابو اللیث صدیقی ص ۷۲۶

کہا شہ نے مرے اس ضبط کا شاہد ہے تو یارب

جو اکبرؑ کے جگر سے کھینچ کر برچھی نکالی ہے

قطعہ

کہا بانو نے حضرت سے علی اصغرؑ کو دکھلا کر

فلک نے آج یہ کیسی مصیبت مجھ پہ ڈالی ہے

خدا کے واسطے تھوڑا سا پانی اسکو پلوا دو

میرے گل نے زباں سوکھی ہوئی منھ سے نکالی ہے

نہ خیمہ ہے نہ پردا ہے نہ حاجت ہے نہ درباں ہے

نہ بھائی ہے نہ بیٹا ہے نہ وارث ہے نہ والی ہے

سوا دو گز کفن کے ہاتھ یاں سے کچھ نہیں جاتا

لحد میں شاہ ہفت اقلیم کا بھی ہاتھ خالی ہے

عبث ڈرتا ہے تو ہوگا اجالا قبر میں مونسؔ

یہی تو راہ روشن ماہ زہرا نے نکالی ہے۔

مندرجہ سلام کل چوبیس ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ مونسؔ کے ہاں ایسے سلاموں کی بھی کمی نہیں جو پچاس اشعار پر مشتمل ہوں۔ مندرجہ سلام کی تخمیس ذکر کرنے لکھی ہے۔

رسالہ العلم میں اس تخمیس کا ایک بند ملتا ہے

؎ محرم ہے بہار ماتم سلطان عالی ہے
مثال لالہ داغ غم سے کسکا سینہ خالی ہے

تصور میں جو باغ شہ کا حال پائمالی ہے

"ہو روتی ہیں آنکھیں مثلِ گل اشکوں میں لالی ہے ہر اک شاخِ مژہ اے عبرتی پھولوں کی ڈالی ہے" [1]

مندرجہ رسالے کے اسی صفحے پر مولنس کے سلام پر کی گئی تخمیس کا ترکیب اور بند ملتا ہے جو نادرے لکھی ہے

؎ جب تک کہ سر سے لٹ کے جدا سر نہ جائیگا آیا جو کچھ کہ دل میں وہ باہر نہ جائیگا

یعنی کہ حبِ فاتحِ خیبر نہ جائیگا

"عبرتی جوشِ ماتمِ حیدر نہ جائیگا آنکھوں سے نشۂ مئے حیدر نہ جائیگا"

مندرجہ بند کے تیسرے مصرعے میں "جوشِ ماتمِ حیدر" لکھا گیا ہے جو کہ یقیناً اشاعت کی غلطی ہے یا غلط فہمی کی وجہ سے شائع ہوئی۔ صحیح متن "جوشِ الفتِ حیدر" ہے بسلام دیوانِ فصاحت میں ملتا ہے۔

سلام

؎ عبرتی جوشِ الفتِ حیدر نہ جائیگا آنکھوں سے نشۂ مئے کوثر نہ جائیگا

اے مومنو حسین کو روؤ کہ تم بغیر آقا تمہارا خلد کے اندر نہ جائیگا

فرماتے تھے حسین کہ سب جذ میں ہم کہیں ہمارے صبر کا جوہر نہ جائیگا

اکبر سے شاہ کہتے تھے انصاف شرط ہے تم رن کو جاؤ گے تو برادر نہ جائیگا

عباس بولے شیروں کا مسکن ترائی ہے لاشا بجی اللہ کے یہاں کہیں پر نہ جائیگا

کاشو نہ کھینچتے لئے جانے کا حکم ہے ہرگز سوار عابدِ بے پر نہ جائیگا

مولنس جہاں میں کون کسی کا ہے بعدِ مرگ دو بول قبر پر بھی کوئی دھر نہ جائیگا۔ [2]

---

[1] رسالہ "العلم" اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۲۵

[2] دیوانِ فصاحت مولنس ص ۱۴

رسالہ "العلم" اکتوبر ۱۹۹۳ء میں پروفیسر شیر مسعود نے "شمع تعزیت" نامی شائع شدہ سلاموں کے مجموعے کی نشاندہی کی ہے جو ساڑھے پانچ سو سے زائد سلاموں پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲۹۶ھ میں مرتب ہوا اور ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء کو طبع ہوا۔ اس مجموعے کے مرتب سید محمد عنایت حسین میتن (سبر نندنٹ چنگی) ہیں جس میں سلام کے علاوہ مرثیہ، واسوخت اور خمسے بھی ملتے ہیں جو کتاب کے آخر میں ملتے ہیں۔ اس مجموعے میں کل (۹۶) شاعروں کے سلام اور خمسے ہیں۔ شعراء کے تخلص کو لغوی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور ہر شاعر کے تخلص کے آگے اسکے سلام کی تعداد بھی لکھی گئی ہے۔

اس مجموعے میں مونس کے کل (۹۳) سلام ملتے ہیں قبل ازیں لکھے گئے خمسے میں اسی کتاب میں ملتے ہیں۔

مونس کے کلام کی ملبندی اور اس کے معیاری ہونے کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ خود میر انیس نے اس کا اعتراف کیا ہے جیسے سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ میں پیش کرتے ہیں۔

؎ بھائی وہ مونس خوش لہجہ و پاکیزہ خیال ۔ جسکا سینہ ہنر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت، یہ سلاست یہ کمال ۔ معجزہ گر نہ اسے کہئے تو ہے سحر حلال [۱]

میر انیس نے بھی میر مونس کے مندرجہ سلام پر تضمین لکھی ہے۔

سلام

اے محبری گیا سر بسر در کہاں کہاں ۔ قرآں لئے لجورے میں ستمگر گہاں کہاں
کعبے میں بھی نہ قبلۂ دیں کو اماں ملی ۔ پہنچے ہرائے قتل ستمگر کہاں کہاں

---

[۱] اردو مرثیہ ۔ سفارش حسین رضوی ۔ ص ۳۳۵

پاتا نہیں کہیں مہ و زہرا کو خلق میں — مہر سپہر کرتا ہے چکر کہاں کہاں

کہتا تھا شمر سو کو گیا تھا یہ شبہ کا حق — میں کیا کہوں کہ میرا خنجر کہاں کہاں

سجاد بہتے تھے مری کشتی تباہ ہے — یارب سنبھالوں طوق کا لنگر کہاں کہاں

گھر گھر بپا ہیں شاہ کے ماتم میں مجلسیں — جا جا کے روئیں عاشق سر در کہاں کہاں

مونس ترے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم — تیغ زباں کے پنجے میں جوہر کہاں کہاں

مندرجہ بالا سلام پر انیس کا پہلا اور آخری مبسوط پیش کیا جاتا ہے جو علی جواد زیدی

کی مرتبہ تصنیف "انیس کے سلام" میں ملتی ہے

تضمین سلام انیس

چمکا خدا کے عرش کا اختر کہاں کہاں — کھایا علی کے جائر نے چکر کہاں کہاں

پہنچا سناں پہ نیزہ اکبر کہاں کہاں — اے ہجری! گیا سر سرور کہاں کہاں

قرآں لئے لبوں پہ ہے ستمگر کہاں کہاں

حال عوام جانتے ہیں صاحب علوم — جو خاص ہیں اسی طرف ان سب کا ہے ہجوم

اکثر انیس نے یہ کہا ہے علی العموم — مونس تیرے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم

تیغ زباں کے پنجے میں جوہر کہاں کہاں [1]

مونس کا مندرجہ ذیل سلام بہت ہی موثر انداز رکھتا ہے۔

سلام

ہجری بہتے ہیں آنسو در غلطاں ہو کر — آہ رو دی ہے لیا دشمن نے گریاں ہو کر

---

[1] انیس کے سلام مرتبہ علی جواد زیدی صد ۳۰۲۔

عنبر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر
عنبری اپنا حشم کوش سلیماں ہو کر

شہ کے مرنے سے موینے کی ہوئی بربادی
مگلیا خاک میں وہ شہر گلستاں ہو کر

دی یہہ سائل نے صدا کیلے علی سے خاتم
لوگدا جاتا ہے مسجد سے سلیماں ہو کر

کیا شہادت کی خوشی تھی کہ سر زہر اگو
شکر خالق کیا ہر زخم نے خنداں ہو کر

شہ کے سینے پہ رکھا شمر لعیں نے زانو
پاس قرآں نہ کیا قاتلِ قرآں ہو کر

تشنگی باپ کی سجاد کو بھولی نہ کبھی
جب پیا گھونٹ بھی پانی کا تو گریاں ہو کر

زلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ نیزہ پر خوں
اپنا سر کھول دیا ماں نے پریشاں ہو کر

تھا یہہ اس گھر میں اژدھیرا کہ غزالانِ حرم
سر کو ٹکرانے لگے داخلِ زنداں ہو کر

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم اے مونس
روضۂ شاہ پہ جائیں گے خراساں ہو کر [1]

انیس کی موت کا مونس کے دل پر گہرا اثر پڑا جسکا اظہار انہوں نے اپنی رباعیات میں کیا ہے،

افسوس دلا انیس مغفور رہیں
ہر چشم ہو روئے تو کجا دور رہیں

تارے بھی ہیں خورشید بھی ہے ماہ بھی ہے
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور رہیں

میر انیس کے اس دنیا سے سفر کرنے کے بعد مونس صرف ۷ سال ہی اس دنیا میں رہے سنہ ۱۲۹۲ھ سنہ ۱۸۷۵ء کو میر مونس نے بھی اس جہاں سے سفر کیا۔ اسطرح خاندانِ انیس کا آخری چراغ گل ہو گیا۔ میر خلیق کی صرف ایک ہی نشانی میر مہر علی اُنس کی شکل میں اس دنیا میں

---

[1] دیوانِ فصاحت عنوان میر مونس صد ۹۷

باقی رہ گئی جسنے کافی طویل عمر پائی۔ خانوادۂ خلیق کے سلام نگاروں کا تذکرہ نامکمل رہ جائیگا اگر انس کی سلام گوئی کو نہ پیش کیا جائے۔

انس :- اس تذکرے کے آغاز سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس تخلص کے دو شاعر نظر آتے ہیں جو نہ صرف ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ دونوں ہی دبستانِ لکھنؤ سے وابستہ ہیں جن میں سے ایک سید محمد انس متوفی ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء ہیں ان کا شمار شاگردانِ ناسخ میں ہوتا ہے۔

دوسرے میر مہر علی انس متوفی ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء ہیں۔ ر۔ اقتمتہ الحروف کی مراد اسی انس سے ہے۔ یہ خلیق کے فرزندِ اصغر تھے اسکی وضاحت پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ ۱۱ر صفر ۱۲۲۳ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق فطری تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ذوقِ شعری ورثہ میں پایا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چمنِ سخن سرسبز و شاداب تھا چنانچہ موسمِ بہار اپنے شباب پر تھا جس سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ ابتداء میں اپنے والد بزرگوار سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن جب میر انیس نے میدان سنبھال لیا تو اسکے بعد خلیق خود اصلاح نہ کرتے بلکہ میر انیس سے اصلاح کرواتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میر مونس کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔

خانوادۂ انیس کے تمام شعراء کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے انس کے کلام کے معیار اور اسکی بلندی کا اندازہ ہم ان ہی کے ایک بند سے لگا سکتے ہیں جسمیں وہ معیاری کلام کے لئے ضروری اشیاء کا ذکر کرتے ہیں۔

یوں رخت نظم بہر مضامیں ہو زیب تن — جسطرح جسم حضرت یوسف میں پیرہن
ذی فہم و پاک میں ہیں جو حضار انجمن — کہدیں وہ سب کے شستہ و ارفعہ ہے ایہ سخن

لفظوں نے آبرو دُر غلطاں کی کھوئی ہے
گویا زباں چشمۂ کوثر سے دھوئی ہے

پتہ نہیں رزم یا بزم سکسینہ نے مرثیہ نگاروں کے تذکرے میں میر انس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا ورنہ وہ ہر تصنیف میں مرثیہ نگاروں کے ضمن میں میر انس کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ انس کا زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ ہے۔

اگرچہ کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن شاعری لکھنؤ میں

پروان چڑھی جیسا کہ میر انیس کے تذکرے کے ضمن میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ صغر سنی ہی میں میر انیس اور میر نفیس کے ہمراہ لکھنؤ آئے لیکن عرصہ بعد جب خلیق بھی فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آئے تو ان کا مستقل قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔

سفارش حسین رضوی "اردو مرثیہ" میں تحریر کرتے ہیں کہ

"انس کے کلام کا مونہ بتہ دیتا ہے کہ یہ کس ہیڑ کی شاخ ہے"

انداز بیان اور زبان دونوں انیس کے گھرانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی
ص ۳۳۹

امیر علی جونپوری "تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" میں انس سے متعلق لکھتے ہیں کہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں لاجواب حیثیت کے مالک تھے جسکا میر انیس خود بھی اعتراف کرتے ہیں البتہ انس کے مجموعے مراثی و سلام کا پتہ نہیں چلتا۔

"شمع تعزیت" نامی سلاموں کے مجموعے جسکا ذکر راقمتہ الحروف نے مونس کے ضمن میں کیا ہے اسمیں انس کے سلاموں کی تعداد جو اس مجموعے میں شامل کی گئی ہے وہ گیارہ بتائی گئی ہے اور جو سلام نمونے کے طور پر دیا گیا ہے وہ وہی ہے جو "حسین پر سلام" سید علی رضوی کی مرتبہ تصنیف میں ملتا ہے

سلام

گھر جلا مجرئی اور رنج فراواں کھینچا
دل سے عابد نے نہ اک نالۂ سوزاں کھینچا

ہے یہ طاعت کہ پھرایا کیا خنجر قاتل
شہ نے سجدے سے نہ سر کو کسی عنواں کھینچا

مر گئی قید میں گھٹ گھٹ کے سکینہ ناداں
ننھی سی عمر میں یہ صدمۂ زنداں کھینچا

زخمی عابد کے قدم تھے مگر اللہ رے صبر
کف پا سے نہ سر خار مغیلاں کھینچا

جھک گئے سجدۂ معبود میں حضرت دم نزع
میان سے شمر نے جب خنجر براں کھینچا

رنج امت سے نہ کیا کیا انھیں پہنچے لیکن
ہاتھ شہ نے نہ دعا سے کسی عنواں کھینچا

انس کو روضۂ پر نور پہ بلواؤ گے کب
انتظار اب تو بہت اے شہ ذیشاں کھینچا [1]

---

[1] حسین پر سلام مرتبہ سید علی رضوی ص ۱۰۳

مندرجہ سلام میں اہلبیت پاک کی در معبود سے گہری عقیدت اور وابستگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں قربانی چاہے وہ جان کی کیوں نہو اس گھر کے چھوٹے بچے سے نوجوانوں اور ضعیفوں نے بھی اپنا شعار سمجھا۔ خداوند عالم کی آزمائش پر ثابت قدم رہے تکالیف چاہے حد سے زیادہ کیوں نہ ہو جائیں کبھی کسی نے اس کا شکوہ اور شکایت نہ کی

جب زخم کھا لیا شکر کیا مسکرا دیا

کے نظریے کو اس گھرانے والوں نے اپنایا اور ہاتھ کبھی امت کی بد دعا کیلئے نہ اٹھے مندرجہ تمام سلام سے میر انس دنیا والوں کو یہی درس دینا چاہتے ہیں یہاں تک کہ تہہ خنجر بھی معبود کی عبادت میں ذرا بھی فرق نہ آنے نہیں دیتے تاکہ دنیا والے یہ سبق حاصل کر سکیں کہ سر کٹ بھی جائے تو آخر دم تک عبادت کو ترک نہ کریں اور دوسرے یہ کہ سر کٹ جائے لیکن باطل کی طاقتوں کے آگے سر جھکنے نہ پائے۔ یہ تمام اخلاقی درس ہیں جو انس اپنے سلام کے ذریعے دیتے ہیں۔

سلام

سجدے میں جب شہید شہ کربلا ہوا
مجرائی اہلبیت میں محشر بپا ہوا
کہتی تھی رو کے فاطمہ صغرا کہ نانی جاں
افسوس خالی ہو گیا کیا گھر بھرا ہوا

خنجر کے نیچے کہتے تھے شہ شکر اے کریم
حاصل بس آج دل کا مرے مدعا ہوا
حضرت نے زیر تیغ پڑھی عصر کی نماز
وقت قضا بھی سجدۂ خالق ادا ہوا
اکبر کے سر سے کہتے تھے عابد کہ بھائی جاں
تم غم سے اب چھٹے میں اسیر بلا ہوا
سایہ کرو پروں کا یہ تھا طائروں میں شور
ہے دھوپ میں حسینؑ کا لاشہ پڑا ہوا
اے انسؔ توشۂ عمل نیک کر جمع
دنیا سے کوچ شام و سحر ہے لگا ہوا۔ [1]

مندرجہ بالا سلام مجموعہ سلامہائی نادرہ معروف بہ "گلدستۂ ماتم" میں ملتا ہے جو مطبع رحما میرٹھ سے شائع ہوا ہے۔ اسکے مرتب حکیم محمد حسن حاذق وغیرہ وغیرہ ہیں جس پر سن اشاعت تو کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس مجموعہ میں انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ کے علاوہ اسی عہد کے قدیم شعراء کے سلام ملتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہوتا کہ یہ ایک صدی قدیم مجموعہ ہے۔ کاغذ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور قدیم مجموعہ سلام راقمۃ الحروف کو دستیاب ہوا ہے جسمیں مختلف نامی گرامی شعراء کے سلام میں یہ "بزم ماتم" کے عنوان سے ملتا ہے جو

---

[1] گلدستہ سلام مرتبہ حکیم محمد حسن حاذق ص ۱۲

مطبع یوسفی دہلی سے باہتمام سید علی حسین شائع ہوا ہے۔ کل (۱۳۲) سلاموں پر مشتمل ہے لیکن اسکا سن اشاعت کہیں معلوم نہ ہو سکا۔

مندرجہ ذیل سلام اس مجموعے میں دستیاب ہوا ہے جو بہت ہی مشہور و معروف ہے۔

سلام

اے اسلامی لیوں ارم ہے کربلا کے سامنے
ہو جمن حسطرح تصور بادشاہ کے سامنے

وائے حسرت کچھ نہ دنیا میں کئے اعمال نیک
ہاتھ خالی ہم چلے لیہاں سے خدا کے سامنے

تن میں رعشہ پڑ گیا پیری میں گردن جھک گئی
اسپو جھک سجدے کو اور سر کش خدا کے سامنے

واہ رے رحمت کر دوزخ کو بھی ٹھنڈا کر دیا
آگ پانی ہو گئی خاک شفا کے سامنے

دیگا شکی بے گناہی دیگر گواہی روز حشر
خنجر قاتل زباں بن کر خدا کے سامنے

کہتے تھے عباس سہکا تا ہے کیا اشمر شوم
دم مرا نکلے گا شاہ کربلا کے سامنے

جب چڑھا جلاد سینہ پر تو حضرت نے کہا

روک لے اپنی عبا آل عبا کے سامنے

روضۂ سرور پہ جا کے خاک ہو جاؤں میں اُنس

ہے زباں پہ یہ دعا میری خدا کے سامنے [1]

خانوادۂ انیس میں نفیس کا ذکر بھی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو میر انیس کے تین صاحبزادے تھے۔ رئیس، سلیس اور نفیس اور تینوں کو بھی مرثیہ نگار ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن باوجود اس کے انیس نے نفیس یعنی اپنے بڑے صاحبزادے پر کافی توجہ کی۔ چنانچہ تاریخ مرثیہ گوئی میں نفیس ہی کو زیادہ شہرت ملی۔

نفیس:۔ میر خورشید علی نام نفیس تخلص کرتے تھے میر انیس کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲ھ فیض آباد میں پیدا ہوئے بعد ازاں لکھنؤ آؤ اور لکھنوی ہو گئے مرثیہ نگار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ سارے ماحول کو مرثیہ نگاری سے مغموم پایا۔ گھر میں کوئی ایسا نہ تھا جسے مرثیہ نگاری کا شرف نہ حاصل ہو بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ مرثیہ نگاری کا جذبہ اس خاندان کے خون ہی میں شامل تھا، اور مرثیہ نگاری اس خاندان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ ایسے ماحول میں نفیس کا مرثیہ کہنا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا لیکن میر انیس کے بعد اس خانوادے میں میر نفیس کی مرثیہ نگاری کے چرچے ہونے لگے۔ اپنے دونوں بھائیوں رئیس اور سلیس کو بھی مرثیہ نگاری میں پیچھے چھوڑ گئے۔ کیوں نہ چھوڑ جاتے۔ امیر علی جونپوری اپنے تذکرے "مرثیہ نگاران اردو"

---

[1] گلدستہ سلام مرتبہ حکیم محمد حسن حاذق ص ۳۸

میں میر انیسؔ کے الفاظ کو اسطرح ادا کرتے ہیں۔

"میر انیس صاحب خود کہا کرتے تھے کہ نفیس
پر اتنی محنت کرنا پڑی کہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا" [1]

چنانچہ انس اور نفیس کے مراثی میں فرق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اسکی وجہ یہی کہ کسی دوسروں کے آگے زانوئے ادب تہہ نہ کیا سوائے میر انیس کے خوش گوئی اور قابلیت کا ہر مصنف اعتراف کرتا ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ خلیق کے پوتے اور میر انیس کے فرزند ہونے کی وجہ سے شہرت پائی بلکہ اپنے ہی کلام کے بدولت شہرت اور مرتبہ ملا۔ ابو اللیث صدیقی لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں تحریر کرتے ہیں۔

"مرثیہ کی ظاہرا صورت کو میر انیس سے زیادہ ترقی دی
چنانچہ ایک نمایاں چیز ساقی نامہ ہے جو ان سے پہلے اس
خاندان کے مرثیہ گو شعراء کے ہاں نہیں ملتا" [2]

منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری میں میر نفیس کا کلام میر انیس کے کلام کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ یہ تمام خاندانی خوبیاں ہیں جو انکے کلام میں دستیاب ہوتی ہیں۔ کلام میں ان تمام خوبیوں کے پائے جانے کا سبب سفارش حسین رضوی "اردو مرثیہ" میں صفحہ ۳۴۷ پر بڑے عمدہ الفاظ میں اسکی وضاحت کرتے ہیں کہ نفیس جب اپنے والد میر انیس کیساتھ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو یہاں پر مرثیہ کو ہلال سے بدر کامل ہوتے ہوئے دیکھا یہ اسوقت کا واقعہ ہے جبکہ نفیس سن شعور کو پہنچ چکے تھے

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — امیر علی جونپوری — صفحہ ۵۰۸
[2] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری — ابو اللیث صدیقی — صفحہ ۳۴-۷

بہزاد ماحول کا بہت گہرا اثر نفیس کے کلام پر پڑا۔ میر انیس کے بعد نفیس نے اپنے سارے خاندان کا نام روشن کیا۔ کل ۸۵ بچاسی برس کی عمر پائی اور اس میں ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ مرثیہ گوئی کے لئے وقف کر دیا۔ ساٹھ یا پینسٹھ سال کا تجربہ کلام کے مستند ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے

سلام

سلامی تھی یہ عداوت ستم شعاروں کو
ملا یا خاک میں عرش خدا کے تاروں کو

یہ بیکسی ہے کہ چالیس دن رہے بے دفن
کفن ملا نہ فاطمہ کے پیاروں کو

یہ بانو کہتی تھی اصغر کی لاش پر رو رو
نہ آیا تجھ پہ رحم ان جفا شعاروں کو

ہر ایک چاہتا تھا پہلے کام آؤں میں
یہ شوق مرگ تھا حضرت کے جانثاروں کو

امام کہتے تھے گرد و غبار کافی ہے
کفن کی کچھ نہیں حاجت ہے خاکساروں کو

قدم یہ عابد بیکس کے پر گرتے تھے
نیاز آبلہ پائی سے تھا یہ خاروں کو

نہیں یہ اشک عزادار و ماتم شہ میں
ملا ہے مرہم کافور دل فگاروں کو

نفیس دور نہیں ہے کچھ اسکی رحمت سے
خدا جو بخشدے ہم سے گناہگاروں کو [1]

مندرجہ سلام کو سید صغیر حسن شمس زیدی الواسطی نے مجموعہ "عطر کلام" میں شائع کیا۔ یہ ۱۵۸ صفحات پر مشتمل نامکمل تصنیف ہے پتہ نہیں اور کتنے صفحات پر مشتمل ہے۔

مندرجہ سلام زیادہ تر رثائیت پر مشتمل ہے لیکن اس سلام کے ایک شعر میں نفیس نے عابد بیمار کے پیروں کے آبلوں میں خاروں کے چبھنے کو بڑے انوکھے انداز سے پیش کیا ہے چونکہ امام وقت کے پیروں میں آبلے تھے لہذا انھیں دیکھکر خار دشت بھی بڑی ہی نیاز مندی سے اپنا سر رگڑتے ہیں۔ اگر یہاں پر "سر رگڑنے" کے بجائے "چبھنے" کا لفظ استعمال کیا جاتا شعر کا وقار برقرار نہ رہتا۔

اک اور شعر میں نفیس امام حسین علیہ السلام کے خیال اسطرح الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ خاکساروں کو بجائے کفن کے سرزمین کربلا کی گرد و غبار ہی کافی ہے اس شعر میں بھی رثائیت بھی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی خانوادۂ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ خداوندی کے آگے خاکساری و نیاز مندی، مرضی معبود پر تا وقت آخر راضی بہ رضا رہنے کا جذبہ ملتا ہے علاوہ ازایں اس شعر سے امام کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امام بالآخر امام ہوتا ہے۔ وہ دنیاوی آسائشوں کا حاجت مند نہیں ہوتا۔ اسطرح یہ شعر انسانی ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور اس سے انسان اخلاقی درس حاصل کر سکتا ہے۔

---

[1] عطر کلام مرتبہ سید صغیر حسن شمس زیدی الواسطی ص ۱۵۴، ۱۵۵

"شمع تعزیت" سلام کا مجموعہ ہے جسکا انتخاب میر دلشیر نیز مسعود نے رسالہ "العلم" میں پیش کیا ہے۔ اس انتخاب میں مونس کے بعد انیس کا سلام پیش کیا گیا ہے

سلام

علی کی تیغ جبکی بارہا اعداء کے لشکر میں
جمل میں، بدر میں، صفین میں، خندق میں خیبر میں

معافی دار جنت میں ہمارا نام لکھا ہے
قبالے میں، سجل میں، خط میں، پروانے میں، دفتر میں

لب تشنہ کی ثنا میں جو مزہ ہے لب یہ لذت ہے
عسل میں، شیشکر میں، شہد میں، قند مکرر میں

صباحت گوہر و یاقوت و صبح و شام کی سب سے
دہن میں، ہونٹ میں، رخسار میں، زلف معنبر میں

بھرا تھا سر بسر خون تن فرزند پیمبر
تبر میں، تیر میں، شمشیر میں، پتھر میں، خنجر میں

سلام کا پہلا شعر تاریخ اسلام کی جنگوں کا احاطہ کرتا ہے گویا پہلا شعر تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے شعر میں انیس دامن اہلبیت سے متمسک ہونے پر بہت ہی اطمینان قلب کا اظہار کرتے ہوئے جنت میں ہی جانے پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ تیسرا شعر مدحیہ ہے جسمیں وہ امام حسین علیہ السلام کی ثنا کرنے والے لبوں کی تعریف کرتے ہیں۔ چوتھا شعر بھی مدحیہ حیثیت رکھتا ہے اور پانچواں شعر رثائیہ مبنی ہے۔ انیس کے اس سلام سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ صنف سلام صنف مرثیہ، صنف قصیدہ اور صنف غزل تینوں کا مجموعہ ہے چنانچہ ان تینوں اصناف کی جھلک اس میں پائی جاتی ہے۔

خانوادۂ میر انیس کی رثائی شاعری کا سلسلہ میر انیس ہی پر ختم نہیں ہوتا جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ انیس کے دونوں بھائی رئیس اور مونس بھی مرثیہ نگار تھے

علاوہ ازیں میر انیس کے والد میر خلیق اور چچا میر دبیر بھی مقبول و مشہور ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ میر خلیق اور میر دبیر دبستانِ عشق سے تعلق رکھتے ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ ہی میں شاعری کا ایک اور دبستان "دبستانِ عشق" کے نام سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا دبستانِ عشق کے ارکان سے متعلق ایک معروف شعر پیش کرتے ہیں

؎ تعشق، عشق و عاشق، صبر و صابر یہ پانچوں تھے غلامِ پنجتن میں۔ [1]

دبستانِ عشق ان پانچ لبادیوں اور ان کے اخلاف سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ سوائے عشق و تعشق کے دوسرے لبادیوں کے مرثیے دستیاب نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر جعفر رضا اپنے اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ شائد دوسروں نے صرف کلمہ نوحے یا سلام لکھے ہوں اسی بنا پر وہ غلامِ پنجتن قرار پائے یا ارقمتہ الحروف کے خیال کے مطابق شائد یا دنیح ہونے کی بنا پر غلامِ پنجتن قرار پائے۔ نام "دبستانِ عشق" ہی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دبستان کے سرگروہ یا بانی عشق تھے۔ اگر میر عشق کا مختصر شجرہ پیش کیا جائے تو اس خاندان کو سمجھنے میں بہت ہی آسانی ہوگی

سید محمد میرزا انس

سید حسین میرزا عشق	صبر
سید میرزا تعشق عاشق	سید احمد میرزا صابر
	دبیر، صاحب، رشید، حمید، سعید، جدید

ادب
ادب
مودب
مہذب

---

[1] دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی ڈاکٹر جعفر رضا ص ۴۲۔

سید محمد میرزا انس کے خاندان کا شجرہ مختصراً پیش کر دیا جائے تو مناسب ترتیب صحیح ہے یا نہیں اسکا علم نہیں البتہ یہ تو یقین ہے کہ سید حسین مہر و عشق سید محمد میرزا انس کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ "دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی" مصنفہ ڈاکٹر جعفر رضا میں اس خاندان کی تفصیلات ملنی چاہیے تھی لیکن ڈاکٹر جعفر رضا نے تصنیف کے موضوع کے اعتبار سے انہیں اشخاص کا ذکر کیا ہے جو مرثیہ گو ہونے کا شرف رکھتے ہیں لہٰذا اس تصنیف میں عشق، تعشق اور دیگر صاحب رشید ہی کی مرثیہ گوئی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ صفحہ ۴۲ پر ڈاکٹر جعفر رضا تحریر کرتے ہیں کہ سوائے متذکرہ دو شعراء کے دوسرے کسی بھی کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شائد یہ لوحے یا سلام کہے ہوں گے البتہ صابر کے مرثیہ مکمل ملتے ہیں عشق کو اس دبستان کے بانی ہونیکا شرف حاصل ہے سلام گوئی کا تذکرہ بھی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے

عشق لکھنوی: سید حسین مہر تخلص اور عشق تخلص کرتے تھے۔ سید محمد میرزا انس کے فرزند اکبر تھے میر مہر علی انس کے تذکرے میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ انس تخلص کے دو شاعر ایک ہی عہد میں گزرے ہے۔ سید محمد میرزا انس غزل گوئی میں ناسخ کے شاگرد تھے اور بحیثیت غزل گو مقبول تھے۔ اودھ کے حکمران محمد علی شاہ کی مدح، مکلہ جہاں کے خاص معتمد بھی تھے۔

عشق لکھنوی سنہ ۱۲۳۳ھ مطابق سنہ ۱۸۱۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے زیر سایہ ہی تعلیم و تربیت پائی عربی و فارسی کی تعلیم بھی والد ہی کے زیر نگرانی حاصل کی اور مذہبی علوم بھی اپنے والد ہی سے حاصل کیے۔ مذہبی علماء سے بھی مذاکرے مباحثے ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایک عالم کی حیثیت سے حاصل ہوئے۔

انیس و دبیر کے عہد سے تعلق رکھتے تھے اور میر ضمیر کی دختر سے عقد کیا تھا۔ ایک طرف تو انیس و دبیر کے مرثیہ گوئی کے جوہر دکھا رہے تھے اور سارا ماحول مرثیہ گوئی سے معمور تھا تو دوسری طرف سسرال میں بھی مرثیہ گوئی کا جوہر تھا لہٰذا عشق نے بھی مرثیہ گوئی کی آغاز کیا۔ میر عشق نے کل چار شادیاں کیں۔ ایک عقد انہوں نے نواب رشرف النساء عرف منیا محل سے بھی کیا تھا۔ جسکے بعد معاشی حالات کافی بہتر ہو گئے۔

ڈاکٹر جعفر رضا اپنی تصنیف میں عشق کی مرثیہ گوئی سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے مرثیے کے معیار کا پتہ چلتا ہے جسکا حوالہ حاشیے میں دیا گیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جب نواب رشرف النساء جو لکھی نواب کی بیوہ تھی انہوں نے ایک امام باڑہ تعمیر کروایا اور جب اس امام باڑے کی تعمیر مکمل ہو چکی تو اس میں ایک مجلس منعقد کی گئی کسی نے عشق سے ذاکری کی خواہش کی چنانچہ عشق نے اپنا ایک مرثیہ پڑھا جسکا آغاز اس طرح ہوتا ہے

؎ عروج دے میرے پروردگار دے مجھ کو

میر عشق کا یہ مرثیہ اس مجلس میں بہت پسند کیا گیا۔ دوسرے شرفاء اور شعرائے کرام کے علاوہ میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی عشق کی خوب تعریف کی اور میر انیس نے تو عشق کو رائے دی کہ یہی ایک مرثیہ بخشش کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ یہ مرثیہ قبر میں ضرور ساتھ لے جانا۔ اس واقعہ کے بعد عشق کی شہرت بہ حیثیت مرثیہ گو عام ہونے لگی۔

؎ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ڈاکٹر جعفر رضا صد ۱۴۱

مراثی میں جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، سراپا نگاری کے علاوہ محاکات نگاری بھی جواب نہیں رکھتی۔ انیسؔ و دبیرؔ کا عہد زبان و بیان کا خاص خیال رکھا اور کوشش کی کہ رسمیں انیسؔ و دبیرؔ سے بھی آگے نکل جائیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر جعفر رضا لکھتے ہیں

"زبان و فن کے مجتہد یہ حیثیت سے میر عشق کی اہمیت مسلم ہے اور انکے دور میں انکی اس اہمیت کو تسلیم بھی کیا گیا تھا۔ میر عشق کی کامیابی کا راز انکی زبان و بیان کی اصلاحی مہم ہے اور اسکی مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت رہے گی" [1]

چونکہ خاندانِ عشق گوئی میں شہرت رکھتا تھا لہذا عشق کی شاعری کا آغاز بھی صنف غزل ہی سے ہوا اور بعد ازاں صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی۔ لہذا انکی مراثی میں بھی غزلیت جھلکتی ہے جو کلام کو مزید دلچسپ بنا دیتی ہے

عشق کے مراثی میں جہاں غزلیت کا پرتو جھلکتا ہے وہیں انہوں نے اکثر مقامات پر قرآن کی آیتوں کے ترجمے مفہوم اور احادیث کو بھی نظم کیا ہے۔ زیارت ناحیہ مقدسہ کا مرثیہ عشق نے منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ کہیں پر لفظی ہے تو کہیں پر فقرات کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا زیارت کے اس ترجمے کو جو کہ مسدس کی ہیئت میں ہے مرثیہ قرار دیتے ہیں یہ ترجمہ "حسینؑ پر سلام" مرتبہ سید علی رضوی میں ملتا ہے۔ ابتدا میں عربی میں زیارت ناحیہ مقدسہ لکھی گئی ہے اور اسکے بعد میر عشق کا منظوم اردو ترجمہ لکھا ہے جسکا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

---

[1] دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی — ڈاکٹر جعفر رضا — ص ۲۱۵

سلام عشق کا تم سب برائے عزادارو — نصیب مرحمت داور ہو اے عزادارو

فغاں سے بزم بنے حشر اے عزادارو — خدا سے عرض کرو دم بھر کو اے عزادارو

دعائے عشق الٰہی قبول ہو جائے

ظہور قائم آل پر دل ہو جائے ۱؎

آگے چلکر خود میرزا عشق بھی اسے مرثیہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

سنو یہ مرثیہ گو میرے نام کا ہوگا

اثر ضرور کلام امام کا ہوگا۔

کہیں اسے سلام بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس زیارت میں انبیاء اور آئمہ کو نام بہ نام سلام بھیجا گیا ہے خود میرزا عشق کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

جہاں حضرت آدم سے تا رسول انام — نبی سے تا حسن مجتبیٰ بلند مقام

ہوئے جتنے پیمبر وصی شہید امام — سبھوں کے ذکر مراتب سلام نام بہ نام ۲؎

یقیناً جب نام بہ نام بزرگ ترین اور باعظمت شخصیتوں کی جناب میں سلام عقیدت پیش کیا جائے تو وہ کچھ اور نہیں بلکہ سلام ہی ہوگا کیونکہ زیارت کچھ اور نہیں سوائے سلام عقیدت کے۔ اسمیں رثائیت بھی شامل ہوتی ہے۔

اگر اس منظوم ترجمے کو سلام کے زمرے میں رکھا جائے تو معرکتہ الآرا سلام ہوگا اور یقیناً اسے سلام ہی ہونا چاہیے۔ یہ سلام کل ایک سو بند پر مشتمل ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

۱، ۲؎ حسین پر سلام — مرتبہ سید علی رضوی — ص ۴۲، ۴۳

سلام اسپہ جو ہے ابنِ خدیجۃ الکبریٰ — سلام اسکو جو ہے طفل سدرہ و طوبا

سلام اسکو جو ہے ابنِ جنت الماوا — سلام اسکو جو ہے ابنِ زمزم ابنِ صفا

سلام اسکو بدن تھا لہو میں تر جسکا

سلام اسکو لٹا کر بلا میں گھر جسکا [1]

علاوہ ازیں اسی صنف میں ایک اور سلام عشق کا ملتا ہے

سلام

اے سلامی خیام جلتے ہیں — رن میں ناموسِ شہ نکلتے ہیں

زیرِ خنجر ہے گردنِ شبیر — مرتضیٰ غم سے ہاتھ ملتے ہیں

بیٹھی ہیں بیبیاں اندھیرے میں — شامیوں میں چراغ جلتے ہیں

عابدِ دل فگار شام و سحر — پا برہنہ جو راہ چلتے ہیں

ڈوب جاتی ہے خون میں زنجیر — پاؤں سے خار جب نکلتے ہیں

رن میں بجتے ہیں فتح کے باجے — ڈر سے بیوؤں کے دم نکلتے ہیں

آب ہوتا ہے غم سے شہ کا جگر — بچے پانی کو جب مچلتے ہیں

ضعف سے شاہ کا یہ عالم ہے — گاہ جھکتے ہیں گہہ سنبھلتے ہیں

قبر اصغر سے کہتی تھی بانو — اے لحد ہم یہاں سے چلتے ہیں

تو ہماری طرح سے بہلانا — شب کو اصغر بہت مچلتے ہیں

---

[1] حسین پر سلام — مرتبہ سید علی رضوی — ص ۴۴

پیشِ حاکم کھڑے ہیں اللہ حرم — سب کے چہروں پہ اشک ڈھلتے ہیں

روتی ہیں صبح و شام سب رانڈیں — آہیں کرنے سے جی بہلتے ہیں

کھینچتے ہیں گلے سے تیر حسینؑ — منہ سے اصغر لہو اگلتے ہیں

زخم جلتے ہیں گرم ہے جو زمیں — شاہِ دیں کروٹیں بدلتے ہیں

باغِ فردوس کا ارادہ ہے

عشق ہم کربلا کو چلتے ہیں

مندرجہ سلام میں دو شعر قطعہ بند ملتے ہیں اور سلام کے تمام اشعار رثا پر مشتمل ہیں۔

علاوہ ازایں مجموعہ سلام ہائے نادرہ معروف بہ "گلدستہ ماتم" جسکا قبل ازایں ذکر ہو چکا ہے جسمیں عشق کے آٹھ سلام ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا سلام کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کربلائے معلیٰ کی زیارت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک سلام جو "گلدستہ ماتم" میں دستیاب ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عشق کی یہ خواہش پوری نہوئی۔

کربلا مجرئی تقدیر نے چلنے نہ دیا

ہائے ارمان میرے دل کا نکلنے نہ دیا

تقریباً ہر سلام سلامی اور مجرئی سے شروع ہوتا ہے اور ہر سلام کے آخری شعر میں یہ اپنی خواہش زیارت کا اظہار کرتے ہیں۔ عطر کلام یعنی مجموعہ سلام جسکا ذکر بھی قبل ازایں آچکا ہے میں بھی عشق کے سلام دستیاب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر جعفر رضا نے نہ ہی عشق کی سلام گوئی کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی انکے

مجموعہ مراثی و سلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شائد لعبید از موضوع ہونے کی بنا پر سلام نگاری کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔ ایک سلام کا تذکرہ ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہادت مولائے کائنات حضرت علی ابن ابو طالب کے موقعہ پر عام طور پر پڑھا جاتا ہے۔

سلام

محترم ہے جو عاشق شیدا ہے علیؑ کا
اب کوچ سوئے جنت اعلیٰ ہے علیؑ کا

ہے آجکی شب حشر ریو صبح قیامت
مہماں میں اب خاتمہ ہوتا ہے علیؑ کا

افلاک سے کہتے ہوئے آتے ہیں فرشتے
پُرسہ ہمیں شہزادی کو دینا ہے علیؑ کا

کس یاس سے ارشاد کیا وقت دعا نے
کچھ زرد سہت چاند سا چہرہ ہے علیؑ کا

بینائی پر نور ہے تلوار سے زخمی
اللہ کی طاعت میں یہ لٹتا ہے علیؑ کا

تھراتی ہے آواز نکل پڑتے ہیں آنسو
ہر ایک موذن کو یہ صدمہ ہے علیؑ کا

ہر سمت ہے غل قتل ہو اشیوں کا آقا
تم فرش سے تا عرش معلیٰ ہے علیؑ کا

دنیا میں وسیلہ ہے نہ عقبیٰ میں وسیلہ
اے عشق اگر ہے تو وسیلہ ہے علیؑ کا۔

متذکرہ مجموعے میں عشق کے کئی سلام دستیاب ہوتے ہیں عشق کے شاگردوں کی تعداد کم نہیں سید مسعود حسین رضوی ادیب کئی شعرا کے نام گنوا رہے ہوئے ہیں غزل اور سلام دونوں میں میر عشق کا شاگرد بتاتے ہیں۔

"یوسف میرزا صفی" "ننھے میرزا صبحی" ذاکر حسین یاس

غزل میں عشق . . . . سے اصلاح لیتے تھے۔ محمد ذکی

الم، بہادر علیخاں شمس، نواب امیر صاحب امیر، عطا علیخاں عطا،

نواب بہادر مرزا ذکی، میرزا معشوق حسین خاں افسوں،

نواب احمد علیخاں شرف، یہ سب لوگ غزل اور سلام

دونوں میں عشق سے اصلاح لیتے تھے،، [1]

مرثیہ نگاری میں عشق کے خاص شاگرد میر تعشق تھے۔ یہ انکے چھوٹے بھائی تھے جنھوں

رثائی شاعری میں اپنے بھائی کا اثر قبول کیا، اور ان سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ میر عشق

کا انتقال ۶۸ یا ۷۰ برس کی عمر میں ۲۸ مئی ۱۸۸۵ء م ۲۴ شعبان ۱۳۰۳ھ کو لکھنؤ ہی میں ہوا

سید مرزا تعشق: سید مرزا نام تعشق تخلص کرتے تھے۔ مرزا انس کے

چھوٹے لڑکے اور عشق کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۰ رجب ۱۲۳۹ھ م ۳ مارچ ۱۸۲۳ء میں

لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ سید صاحب کے لقب سے لکھنؤ میں مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے

گھر پر اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ تعشق کے والد سید مرزا انس اردو، عربی اور فارسی کے

استاد مانے جاتے تھے۔ جب سے آنکھ کھولی سارے گھر میں شعر و شاعری کا ماحول پایا۔ لہذا اس میں

کوئی شک نہیں کہ تعشق نے دس یا گیارہ سال کی عمر میں ہی میدان سخن میں قدم رکھا۔ میرزا

انس کی غزل گوئی کے چرچے تھے۔ چنانچہ تعشق نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا صنف غزل سے کی۔

تعشق کے استاد ہونیکا شرف آیا شیخ ناسخ کو حاصل تھا یا خود انکے والد میرزا

انس کو؟ اسمیں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ کچھ تذکرہ نگار انہیں شیخ ناسخ کا شاگرد

---

[1] نگارشات ادیب سید مسعود حسین رضوی ادیب ص ۱۳۸

بتاتے ہیں۔ جب ضغیم حنکا تذکرہ "یادگارِ ضغیم" کے نام سے مشہور ہے۔ علاوہ ازاں رام بابو سکسینہ تعشق کی غزل گوئی اور مرثیہ گوئی کی تعریف کرتے ہیں انہیں ناسخ کا شاگرد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مرثیہ اور غزل خوب کہتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے۔" ۱ص

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی انہیں میر انیس کا معاصر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

سید مرزا تعشق جو لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے

مشہور ہیں اپنے معاصرین میں انیس کے ہم پلہ ہیں۔" ۲ص

تذکرہ نگاروں کی جتنی تعداد انہیں ناسخ کا شاگرد قرار دیتی ہے اتنی ہی تعداد دوسرے بیان سے اختلاف کرنے والے ملتے ہیں۔ یہ اختلاف اسلئے بھی مستند ہو سکتا ہے کہ یہ قریبی عزیز، گزشتہ داروں اور اس دور کے تذکرہ نگاروں کے بیانات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مہذب لکھنوی عشق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ "دورِ تعشق" میں تعشق کے تلمذ سے متعلق لکھتے ہیں

"خود سید صاحب نے کوئی مرثیہ نہ پڑھا جب تک کہ

باپ یا بڑے بھائی سے اصلاح نہ لی" ۳ص

مہذب لکھنوی نے صنف غزل کا تذکرہ نہیں کیا لہذا یہ بیان صرف صنف مرثیہ ہی تک محدود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صنف غزل میں تعشق نے ناسخ سے تلمذ حاصل کیا ہو، کیونکہ یہ تو

۱ص تاریخ اردو ادب — رام بابو سکسینہ — ص ۲۸۶

۲ص لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابو اللیث صدیقی — ص ۲۳۰

۳ص دورِ تعشق — مہذب لکھنوی — ص ۱۴

یہ تو طے شدہ اور یقینی امر ہے کہ تعشق کے والد سید میر زا انس ناسخ کے شاگرد تھے اور غزل گوئی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ لہذا یہ ممکن ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں نے صنفِ غزل میں ناسخ سے اصلاح لی ہو

اردو مرثیے کا ارتقاء میں مسیح الزماں تعشق کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"سید میر زا تعشق $\frac{۱۲۳۹-۱۳۰۱ھ}{۱۸۲۳-۱۸۹۱ء}$ نے بھی میر زا فصیح کی طرح اگرچہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ عراق اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ میں گزارا لیکن لکھنؤ کی ادبی فضا میں ہی پروان چڑھے اور یہیں کے رنگِ سخن سے انہوں نے کسبِ فیض کیا" [۱]

سفر اسطرح ہوتا رہا کہ یہی مرتبہ کربلائے معلیٰ کو اپنے والد کے ساتھ گئے۔ زیادہ عرصے تک وہاں قیام نہ ہوا صرف ایک ہی سال میں یہ واپس آئے لیکن دوسری مرتبہ کافی عرصے یعنی ۱۸ سال تک وہیں قیام رہا۔ اس دوران مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات پر تشریف لے گئے لیکن تیسری بار بھی زیادہ عرصے تک وہاں قیام نہ کیا بلکہ ڈیڑھ یا دو سال بعد ہی اپنے وطن تشریف لائے جتنا عرصہ بھی انہوں نے اپنے وطن سے دور گزارا اس دوران بذریعہ ڈاک اپنے کلام پر اپنے بھائی میر عشق یا اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے جب تیسری بار سفر سے واپس اپنے وطن آئے تو اسکے بعد سات یا آٹھ سال اس دارِ فانی میں رہے۔

غزل گوئی کے شوق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ تیسری بار سفر

---

[۱] اردو مرثیے کا ارتقاء — مسیح الزماں — ص ۲۸۵

مقاماتِ مقدسہ سے واپسی پر بھی غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا جسکا اندازہ مندرجہ شعر سے ہوتا ہے

پیری کی شاعری میں تعشق مزہ کہاں وہ شعر کسطرح سے ہوں جب وہ ہمیں نہیں۔ [1]

ساتھ ہی افسوس بھی کرتے ہیں۔

ہائے افسوس تعشق نہ ہوا پھر جانا ایسی ساعت سے چھٹے روضۂ شبیرؑ سے ہم [2]

صنف غزل اور صنف مرثیہ دونوں پر بیک وقت طبع آزمائی کرنے کا ایک مثبت پہلو ڈاکٹر جعفر رضا یہ بیان کرتے ہیں کہ مرثیے میں تغزل کا پہلو اپنایا اور اس طرح مسلسل توجہ اور مشق سے انکا رنگ سب سے منفرد قرار پایا

مہذب لکھنوی جو تعشق کے پیرو تے اور وارث تھے انکی غزلوں کا مجموعہ "دورِ تعشق" کے نام سے شائع کیا اور سنہ ۱۹۴۸ء یا سنہ ۱۹۴۹ء میں تعشق کے مراثی کے مجموعے "افکارِ تعشق" حصہ اول و دوم شائع کروائے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی تعشق کی شہرت کا سبب صنف مرثیہ کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"آخر دور کے مرثیہ گو شعراء میں انکا خاص درجہ ہے علاوہ مرثیوں کے غزلیں بھی کہتے تھے لیکن انکی شہرت کا دارومدار ان کے مراثی پر ہی ہے" [3]

---

[1] اردو مرثیے کا ارتقاء مسیح الزماں ص ۴۲۸

[2] " " " " " " ص ۴۳۰ بحوالہ دورِ تعشق (غزلیات کا مجموعہ)

[3] لکھنؤ کا دبستان شاعری ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص ۷۳۰

وہ میر انیس کے ہم عصر تھے۔ ڈاکٹر جعفر رضا مختلف مصنفین کے حوالوں کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"میر انیس اور میر تعشق کے تعلقات کی نوعیت ادبی تھی" [1]

ہمعصر اور ہم مشرب ہونے کی بنا پر انکے تعلقات آپس میں بڑے گہرے تھے میر انیس جب بھی کوئی مرثیہ لکھتے پہلے تعشق کو سنایا کرتے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کے فن کا اعتراف بھی کرتے لیکن قسمت کی گردش کہ جبکہ تعشق کو وہ دن بھی دیکھنا پڑا جبکہ انکے آپسی تعلقات میں کسی قدر کشیدگی آگئی شاید یہی وہ دور ہوگا جبکہ تعشق نے طویل عرصے کیلئے عراق میں سکونت اختیار کی۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ سید میر زا عشق دلبتان کے سرسبز اور زندہ شخصیت اور اسکے بانی تھے لیکن باوجود اسکے تعشق کو اس دلبتان میں انفرادی اور امتیازی حیثیت حاصل ہے

تعشق کی زبان اور انداز بیان سے متعلق ڈاکٹر جعفر رضا اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ

"تعشق کے زبان و بیان کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دلبتان عشق کی نمائندہ فرد ہیں انکی شاعرانہ صلاحیت میر عشق کی زیر نگرانی پروان چڑھی اور انہوں نے عمر بھر ان سے اصلاح لی۔" [2]

---

[1] دلبتان عشق کی مرثیہ گوئی — ڈاکٹر جعفر رضا — ص ۲۲۳

[2] " " " " " " " " — ص ۲۸۳، ۲۸۴

ڈاکٹر جعفر رضا کی تصنیف "دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی" میں تعشق کے مرثیہ گوئی کے ذیل میں سلام نگاری کا تذکرہ بھی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے کیونکہ زیرِ موضوع سلام کا شمار رثائی ادب میں ہی ہوتا ہے لیکن حیرت ہے کہ ڈاکٹر جعفر رضا نے عشق اور تعشق کی سلام نگاری کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ شائد یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے سلام نگاری کے تذکرے کو خارج از موضوع سمجھا۔ "عطرِ کلام" یعنی مجموعہ سلام جس کا ذکر عشق کے سلاموں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ تعشق کے تیس ۳۰ سلام دستیاب ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں "شمع تعزیت" (سلاموں کا مجموعہ) میں پروفیسر منیر مسعود تعشق کے سلام کی تعداد جو اس مجموعے میں شامل کی گئی ہے پانچ ۵ بتاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ پانچ سلام کونسے ہیں کیونکہ وہ نمونہ پیش نہیں کرتے لیکن "حسین پر سلام" مرثیہ سید علی رضوی میں صرف ایک سلام ملتا ہے

سلام

کوئی بھی ہمدم دمِ آخر نہ تھا شبیرؑ کا
دیر تک حسرت سے منہ دیکھا کئے شمشیر کا

نزع میں کہتا تھا حُر شدت تنفس کی نہیں
دم میرا دم بھر رہا ہے الفتِ شبیرؑ کا

سب چلے سجادؑ جب اٹھے پہن کر بیڑیاں
کوچ کا نقارہ نالہ ہو گیا زنجیر کا

اے نرے اخلاق اللہ رے مروت شاہ کی
دل کھنچ آیا جب کھنچا سینے سے پیکاں تیر کا

سخت گیری ہو جہاں تک تجھ میں ہو اے زمیں
میں بھی رستہ دیکھتا ہوں شاہِ خیبر گیر کا

اے تعشق نام کچھ نکلا نہ میرا روزِ حشر
تھا فقط مرقوم ذکر حضرتِ شبیرؑ کا [1]

---

[1] حسین پر سلام — سید علی رضوی — ص ۱۰۲

تعشق کے اکثر سلام ایسے ہیں جس کا آغاز لفظِ سلام، سلامی اور مجبری سے نہیں ہوتا مندرجہ ذیل سلام کو پڑھنے پر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ یہ انہوں نے مقاماتِ مقدسہ سے واپس اپنے وطن آنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سلام

حیف ہے روضۂ سلطانِ زمن چھوٹ گیا
خلد اک پھول ہے جس کا وہ چمن چھوٹ گیا

شاہ کرتے ہیں سفر بیاہ کے قابل ہے پسر
گھر کے بسنے کے دن آئے تو وطن چھوٹ گیا

سر کے ہمراہ گئے شام کی جانب سجاد
تنِ شہ دشت میں بے دفن و کفن چھوٹ گیا

رہ گئے قید میں بھر کر نفسِ سرد حرم
جب سنا کوئی گرفتارِ رسن چھوٹ گیا

شہ کو آتی ہے صدا چشمۂ کوثر ہے قریب
تجھ سے دریا اگر اے تشنہ دہن چھوٹ گیا

لختِ دل جانتے تھے ہر گلِ تر کو شبیرؑ
جس میں تھی بوئے محبت وہ چمن چھوٹ گیا

کہا زینبؑ نے یہ بیٹیوں سے کہ بڑھ کر لڑنا
منہ نہ دیکھوں گی جو تم سے یہ چلن چھوٹ گیا

سامرہ سے ہے نکل کر یہ تعشق افسوس
زندگی میں دیرِ سلطانِ زمن چھوٹ گیا

سلام رثائی ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس دیتا ہے۔ مرضیٔ معبود کے آگے امام مظلوم کے سر تسلیم خم کر دینے کے جذبے کو تعشق سلام کے دوسرے شعر میں پیش کرتے ہیں دنیاوی آسائشوں اور راحتوں پر رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر آنے والی مصیبتوں کو

ترجیح دیتے ہیں یہاں تک کہ اس گھرانے کے معصوم بچوں کے بھی دل میں اپنے آپکو راہِ خدا میں قربان کر دینے کا جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ اس گھرانے کی مائیں اپنے بچوں کو اس راہ میں ثابت قدم رہنے کی ہدایت کرتی ہیں۔

تعشق کی مظلومِ کربلا سے بے پناہ محبت اور اس در پاک سے وابستگی کا اظہار رثائے سلام کے اشعار سے ہوتا ہے۔

کربلا سے بعض کا جنت کا جانا ہو گیا — قافلہ کچھ شام کی جانب روانہ ہو گیا

ناموافق مجھ سے اے چرخِ کہن زمانہ ہو گیا — کربلا سے جانبِ فردوس جانا ہو گیا

اے تعشق کان میں مشتاق اس آوازکے — آئے دن رجعت کی غیبت کا زمانہ ہو گیا

دوسرے شعر سے تعشق کی گہری عقیدت کا ہوتا ہے کہ یہ سرزمینِ کربلا کو جنت سے بہتر ترجیح دیتے ہیں۔ جنت جہاں کی ہر انسان تمنا اور آرزو کرتا ہے جاہے وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو وہ جنت میں ہی جانا چاہتا ہے لیکن تعشق کربلا سے فردوس بھی جانا ہو تو اسے زمانے کے ناسازگار حالات بتاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہند کو واپسی پر بھی بہت ہی مایوس نظر آتے ہیں اور بار بار اپنے سلاموں میں اسکا تذکرہ بڑے ہی افسوس سے کرتے ہیں۔ ایک اور چیز جو ان کے سلاموں میں ملتی ہے وہ یہ کہ تقریباً ہر سلام کے آخری شعر میں وہ امام زمانہ کے ظہور کے مشتاق نظر آتے ہیں، اور ظہورِ امام میں تعجیل کے لئے دعا گو ہیں۔

مندرجہ بالا شعر اسی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ ہر کسی انداز سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

؎ کہیں خورشیدِ امامت ہے تعشق طالع
ظلمتِ دہر میں پیدا ہو سحر کی صورت

؎ اے تعشق یہ کہیں گے سب تجھے روزِ ظہور
تھا گدا دولتِ صاحب سے تونگر ہے آج

؎ مثلِ حیدر حضرتِ صاحب جو فرمائیں ظہور
ہو تعشق کفش برداروں میں قنبر کی طرح

تعشق کی دیرِ امامِ پاک سے اسقدر عقیدت و وابستگی، امامِ زمانہ کے ظہور کی خواہش اور خونِ امام کے بدلے کی آرزو، کربلا سے واپسی پر اظہارِ افسوس، کربلا کو فردوس پر ترجیح، ان تمام باتوں سے تعشق کی مذہبی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ تعشق نے صنفِ غزل اور صنفِ مرثیہ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ مراثی میں غزل کا پرتو ملتا ہے۔ انہیں غزل کی رنگینی سے مرثیے کو دل آویز بنا دینے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے جسکی مثال کیلئے ڈاکٹر جعفر رضا افکارِ تعشق جلد اول سے مرثیے کا ایک بند پیش کرتے ہیں۔

دل مرا الفتِ شبیرؑ سے بھر دے یارب — جو بہنے ابر پہ وہ دیدۂ تر دے یارب
جسمیں محبوب کا سودا ہو وہ سر دے یارب — رشکِ خورشید ہو وہ داغِ جگر دے یارب

خانۂ ماتمِ شبیرؑ بنے گھر میرا
زلزلے آئیں جو تڑپے دلِ مضطر میرا

ڈاکٹر جعفر رضا لکھتے ہیں

"الفتِ شبیرؑ کو محبوب کا سودا سمجھنا تعشق کی
تغزل پسند طبیعت کا ہی تقاضا ہے۔ وہ مرثیے کے شاعر
ہیں اور مرثیہ اہلبیت کی محبت کا نتیجہ ہے لیکن جس طرح
وہ یہاں دعا کر رہے ہیں وہ صرف غزل پسند مزاج کی پاسخ ہے
انہوں نے اپنے مراثی میں اکثر جگہوں پر غزلیت کیساتھ حسن و
عشق کی باتیں قلمبند کی ہیں، ہجر، فراق، وصال وغیرہ
کا تذکرہ وہ اپنے مراثی میں بڑی بے تکلفی سے کر دیتے ہیں۔" [1]

صنف مرثیہ جو رثا سے مشتق ہے اسکو غزلیت کا رنگ دیتے ہوئے دل آویز بنا دینا اور
صنف سلام جو غزل کی ہیئت ہی لکھا گیا ہے اور غزل کی طرح دردمندی، خلوص اور بے ریائی
کے مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے۔

"پیری" جو میر انیس کا محبوب ترین موضوع ہے جس پر میر انیس نے جا بجا اظہار
خیال کیا ہے۔ سلام جسکا پہلا شعر

؎ لحد میں سامنے جب دفتر حساب آیا
گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا

اس سلام کا اختتام اس طرح کرتے ہیں

---

[1] دلستان عشق کی مرثیہ گوئی ڈاکٹر جعفر رضا ص ۲۳۶

کوئی بھی سوتا ہے دیری میں اسطرح غافل

اٹھو انیس اٹھو سر پہ آفتاب آیا

بالکل یہی خیال کو تعشق اپنے سلام میں اسطرح کرتے ہیں جسمیں تغزل ملتا ہے

آمدِ پیری ہے جاتی ہے جوانی آنکھ کھول

سو چکا سائے میں اب سر دیر چلی آتی ہے دھوپ

انکے سلاموں میں کوئی نمایاں خصوصیت ایسی نظر نہیں آتی جو دلبتانِ عشق سے مخصوص ہو یا اسکی نمائندگی کرے۔ باوجود اسکے دورِ عروج میں انکا تذکرہ بھی نمائندہ حیثیت رکھتا ہے تعشق کے شاگردوں کی کثیر تعداد تو نظر نہیں آتی جسکی اک وجہ شاید یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میر عشق کی زندگی تک اپنے آپکو انکا شاگرد ہی سمجھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ دورِ جو شاعری کے عروج کا دور تھا وہی وطن سے باہر گزرا لیکن اسکے باوجود مصطفےٰ امیاں رشید، باقر صاحب حمید، مہدی صاحب جذبی اور دوسروں کے علاوہ پیارے صاحب رشید زیادہ شہرت کے حامل ہیں۔

تو اب نادر آ غالبی تعشق کے شاگردوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں میر عشق کے انتقال کے بعد وہ تمام شعراء جو ان کے شاگرد تھے وہ سب تعشق سے اصلاح لینے لگے۔ ان سب میں پیارے صاحب رشید ہی نے اس دلبتان کا نام روشن کیا۔

میر عشق کے انتقال کا تعشق کو گہرا صدمہ پہنچا جسکے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اسی طرح بہ مشکل تمام چھ سال اس دنیا میں اور گزارے اور

یکم اپریل ۱۸۹۱ء سنہ ۱۳۰۹ھ کو اس دنیائے فانی سے راہی عدم ہوئے۔

۔ پیارے صاحب رشید: ــــ اسم گرامی سید مصلح امیر اعرف پیارے اور رشید تخلص کرتے تھے۔ پیارے صاحب رشید کے نام سے شہرت حاصل کی۔

میر انیس کے نواسے اور سید میر نوازش کے پوتے تھے۔ ایک طرح سے پیارے صاحب رشید کی شخصیت دو خاندانوں اور دو دلبانوں یعنی دلبانِ انیس اور دلبانِ عشق کا سنگم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو اللیث صدیقی رشید سے متعلق لکھتے ہیں

"انیس اور انس دونوں خاندانوں کے کمالات کا مجمع البحرین ہیں" [1]

احمد مرزا صاحب کے لڑکے تھے۔ ولادت سنہ ۱۸۴۶ء سنہ ۱۲۶۳ھ کو لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ رشید کی تعلیم و تربیت میں انکے دادھیال کا بالخصوص میر عشق اور میر تعشق کا بڑا حصہ رہا۔ رشید ان دونوں ہی کے لاڈلے تھے۔ فقہ علم و ادب کے علاوہ وہ تمام فنون جیسے شہ سواری، فن سپہ گری اور تلوار چلانے کا فن رشید کو سکھائے گئے۔ چنانچہ عشق و تعشق کی محنت رائیگاں نہ ہوئی اور رشید نے ہر فن میں مہارت حاصل کر لی۔

حیدر رضا رشید کو تعشق کا جانشین اور انیس کا وارث قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

"رشید کی علمی استعداد انکے دور میں احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اور ساتھ ہی جانشین عشق اور وارث انیس ہونے کی بنا پر انکی بہت قابل کدر مانی جاتی تھی۔" [2]

---

[1] لکھنؤ کا دلبان شاعری — ابو اللیث صدیقی ص ۲۴۱

[2] دلبان عشق کی مرثیہ گوئی — ڈاکٹر حیدر رضا ص ۲۹

اپنے کلام میں بہت ہی نازک اور لطیف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ انکا نظریہ یہ تھا کہ مشکل اور بوجھل الفاظ کے استعمال سے اسکا لطف جاتا رہتا ہے۔ زبان و بیان کے استعمال میں اپنے خاندان ہی کی زبان کا خاص لحاظ رکھا۔ تعلیم و تربیت میں دردؔ صاحب کا زیادہ حصہ رہا اسکے باوجود انکے شخصیال نے بھی انکی سرپرستی کی۔ شاعری میں تو اپنے چچا عشق اور تعشق ہی کے شاگرد رہے لیکن کبھی کبھی میر انیس بھی اصلاح دیا کرتے تھے۔ حیدر بخش حیدری نے میر انیس سے بھی فیض پایا۔ ڈاکٹر رضا اپنی اس تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ

"مرشید نے شاعری شروع کی تو میر انیس نے انکی بہت ہمت افزائی کی اور سلسلۂ سخن جاری رکھنے کیلئے چچا میر عشق سے تلمذ حاصل کرنے کو کہا۔ لیکن کبھی کبھی خود بھی اصلاح دیدیا کرتے تھے اور انکی شاعری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔" [1]

اسمیں کوئی شک نہیں کہ شاعری کا آغاز رشید کے ہاں کمسنی ہی میں ہوا ہوگا کیونکہ سارے گھر اور خاندان شخصیال اور ددھیال میں شاعری کے چرچے تھے۔ تعشق کیطرح انکی شہرت بھی صنف مرثیہ گوئی سے ہوئی۔

رام بابو سکسینہ تاریخ اردو ادب میں انکی مرثیہ گوئی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"مرثیہ میں انہوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہاریہ کا اضافہ کیا جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہ آیا۔" [2]

---

[1] دلبستان عشق کی مرثیہ گوئی — ڈاکٹر جعفر رضا — ص ۲۹۱

[2] تاریخ اردو ادب — رام بابو سکسینہ — ص ۲۸۷

رشید نے مراثی اور غزل کے علاوہ سلام، رباعی اور قصیدے پر بھی طبع آزمائی کی۔ سلاموں میں غزل کا رنگ چھلکتا ہے میر انیس سے قرابت، انکی تقلید اور رشید کی علمی استعداد کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر جعفر رضا اس واقعہ کو مہذب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں لیکن وضاحت نہیں کرتے کہ مہذب نے کس تصنیف میں اس واقعہ کو پیش کیا ہے اور راقمۃ الحروف اس واقعے کو ڈاکٹر جعفر رضا کے حوالے سے پیش کرتی ہے اسطرح یہ حوالہ بالراست نہیں بلکہ بالواسطہ ہو جائیگا جسکی گنجائش تحقیق کے دامن میں بالکل نہیں ہے لیکن واقعہ بڑا دلچسپ ہے ڈاکٹر جعفر رضا ص ۲۹۲ پر بیان کرتے ہیں

واقعہ اسوقت کا ہے جبکہ انیس کے مندرجہ سلام کے چرچے تھے۔

؎ سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

انیس کے سلاموں کے چند اشعار جو بالکلیہ غزل کے لگتے ہیں مندرجہ سلام کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

؎ یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

رشید نے بھی اپنے نانا اس سلام کی بہت تعریف کی اور خاص طور پر مندرجہ بالا شعر کی بے پناہ تعریف کی جسپر وہاں موجود دوسروں نے بھی اس شعر کی بہت تعریف کی جسکے فوری بعد رشید نے میر انیس سے بہت ہی مخلصانہ انداز میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ شعر بجائے سلام کے غزل کا معلوم ہوتا ہے جسپر میر انیس نے اپنے نواسے سے بہت ہی محبت بھرے انداز میں سوال کیا کہ کیا انہوں نے

بھی کچھ کہا ہے جسپر رشید نے بڑی انکساری سے عرض کیا کہ ان میں یہ گستاخی کرنے کی ہمت نہیں میر انیس نے بہت اصرار کیا کہ جسپر رشید نے اپنا شعر سنایا جو میر انیس کی ہی زمین میں ہے شعر واقعی بہت خوب ہے اگرچہ رشید کے دوسرے سلاموں میں غزل کا رنگ جھلکتا ہے لیکن سلام کے اس شعر سے تغزل کا شائبہ بھی نہیں ہوتا - خالص سلام کا شعر معلوم ہوتا ہے جسمیں درد، کسک اور تڑپ موجود ہے۔ جو بھی اس شعر کو پڑھ لے سرزمین کربلا پر روز عاشورہ غنچے سے مجاہد علی اصغر علیہ السلام کی شہادت کا تصور اسکے ذہن کو جھنجوڑ دیتا ہے شعر درج ہے -

؎ بنا کے شکل مجاہد کی لے چلے حضرت

الٹ دیا علی اصغر کی آستینوں کو

اس شعر کو پڑھکر رشید نے نہ صرف اپنے نانا بلکہ تمام سامعین سے داد تحسین حاصل کی اور میر انیس نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ انکے بعد رشید ہی مرثیہ نگاری کو اپنے دادھیال لے جائیں گے

سفارش حسین رضوی رشید کی مرثیہ نگاری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اسطرح کرتے ہیں

"دادھیال غزل گو اور ننھیال مرثیہ گو رشید کے ورثے میں دونوں رنگ آئے جنھیں انہوں نے مرثیے میں اس انداز سے سمویا کہ مرثیہ گنگا جمنی ہو گیا یہ رنگ ایسا پسند آیا کہ لوگ رشید کے کلام پر سر دھننے لگے۔" ؎۱

آگے سفارش حسین مرثیے کی دو رنگی سے متعلق خود رشید ہی کے مرثیے کا ایک بند پیش کرتے ہیں

؎۱ اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۲۴۳

؎ میں بھی ہوں وارث طرزِ سخن میر انیسؔ ہوں تعشق کے سبب ملک مضامیں کا رئیس
مونس خلق ہوں میں میری زباں ہے جو سلیس ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں میں اور نفیسؔ
خوب تحقیق میں بچپن سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو ؎۱

اس بند میں رشید شاگردِ انیسؔ، عشق اور تعشق ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ امیر علی جونپوری اپنے تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو جلد اول میں رشید کے تلمذ کے تعلق سے کہتے ہیں

"غزل اور مرثیے میں وہ اپنے والد جناب احمد میرزا صابر صاحب اور جناب عشق کے شاگرد تھے۔ جناب میر انیسؔ صاحب سے کبھی اصلاح نہیں لی۔" ؎۲

لیکن خود رشید کے یہ مرثیے کا بند پڑھنے کے بعد امیر علی جونپوری کا بیان حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ رشید اپنے بند میں مندرجہ تین شخصیتوں کے شاگرد ہونے کا اقرار کرنے علاوہ وارث انیسؔ اور جانشین عشق ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

گویا پیارے صاحب رشید کی شخصیت انیسؔ و انسؔ دو خاندانوں کا حسین امتزاج ہے، ابو اللیث صدیقی "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں رشید کی سلام گوئی کے تعلق سے لکھتے ہیں

سلاموں میں غزل کا رنگ زیادہ اور مرثیہ کا کم ہے کیونکہ تعشق کی شاگردی نے غزل گوئی کی طرف راغب کر دیا ہے۔" ؎۳

؎۱ اردو مرثیہ سفارش حسین رضوی ص ۳۸۲
؎۲ تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو امیر علی جونپوری ص ۲۴۲، ۲۴۳
؎۳ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ابو اللیث صدیقی ص ۷۴۱

ابو اللیث صدیقی کے اسی نظریئے کی روشنی میں رشید کی سلام گوئی کا جائزہ لیں تو بہتر ہوگا۔ "حسین پر سلام" مرتبہ سید علی رضوی میں یہ سلام ملتا ہے۔

سلام

کیا لے کے خاک تربت سرور بنائینگے
دل اور ایک دل کے برابر بنائینگے

کرتے ہیں جمع اشک ہمارے ملائکہ
حوروں کے کان کیلئے گوہر بنائینگے

شہ دامنِ رضائے خدا کو یہ دینگے طول
اپنا کفن مزار کی چادر بنائینگے

ٹوٹے ہیں دل غریبوں کے پانی نہیں ملا
یہ جام بیٹھ کر لبِ کوثر بنائینگے

کرکے حسنؑ کو خلق ہوا حکیم کردگار
اک فخر خاندانِ پیمبر بنائینگے

ہو جائے غرق کشتیٔ امت مجال کیا
شبیر اپنے صبر کو لنگر بنائینگے

کہتی تھی ذوالفقار نہ تھی مجھ کو یہ خبر
شبیر مجھ سے تربتِ اصغر بنائینگے

مضموں نکال جاؤ ہزاروں تم اے رشیدؔ
گلدستہ ان گلوں کے سخنور بنائینگے

مندرجہ سلام میں رثائیت، ادبیت اور ساتھ ہی غزلیت بھی ملتی ہے علاوہ ازایں تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانۂ جاوید جلد سوم میں بھی لالہ سری رام نے پیارے صاحب رشید کے کلام سے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"سوزِ عشق، حسرت کے مضامین اچھے پیرایہ میں انکے

کلام میں ملتے ہیں۔ زبان بہت صاف اور شستہ برتتے
ہیں جو انکا خاندانی ورثہ ہے۔ بعض بعض اشعار ایسے
صاف اور اعلیٰ درجے کے کہہ جاتے ہیں کہ جس سے ان کا
کلام سخن مسلّم ہوتا ہے"۔ [1]

لالہ سری رام نے اپنے تذکرے میں رشید کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے جسمیں غزل
رباعی اور سلام کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ جہاں پر بھی سلام کے اشعار ملتے ہیں وہاں پر
مصنف نے واضح طور پر عنوان سلام لکھا ہے۔ سلام مکمل طور پر تو پیش نہیں کئے گئے
بلکہ تین یا چار اشعار سلام کے پیش کئے گئے۔ قبل ازیں جو مذکورہ سلام ابواللیث صدیقی
نے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہے اسکے اشعار بھی اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ اسکے علاوہ
اور جو سلام کے اشعار ملتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

سلام

نکل آئیں ہیں موجیں کوثر و تسنیم سے باہر — خبر پہنچی ہے پیاسے حضرت شبیر آتے ہیں
گرے میدان میں اکبر دوڑے ہیں ہر سمت سے اعدا — مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں
غرور اب لیا بڑھے گا ختم ہوئے اس درجہ پیری میں — ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہیں [2]

اس سلام کا پہلا اور دوسرا شعر اسطرح سے متضاد قرار پاتے ہیں وہ اسطرح
کہ پہلے شعر میں رشید کہتے ہیں کہ جنت کی نہروں کوثر و تسنیم کو جب خبر ہوئی کہ حضرت

---

[1] تذکرۂ ہزار داستان — لالہ سری رام — ص ۴۳۳
[2] تذکرۂ ہزار داستان — لالہ سری رام — ص ۴۳۴

شبیر پیاسے آ رہے ہیں تو وہ بھی باہر استقبال کے لئے نکل آئیں۔ اس شعر سے ایک طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرے شعر میں رشید حق پرستوں پر باطل پرستوں کے ناروا ظلم و زیادتی کو پیش کرتے ہیں کہ جب دوران جنگ علی اکبر گھوڑے سے سرزمین کربلا پر گرتے ہیں تو باوجود اسکے کہ علی اکبرؑ ہم شبیہ پیغمبر ہیں اور سارے مسلمان اسی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں لیکن ہر سمت سے اعدا یہی سوچکر دوڑتے ہیں کہ کسی طرح سے رسول اللہ کی تصویر کو مٹا دیا جائے یعنی اشرف المخلوقات کا شرف رکھتے ہوئے بھی ایک وحشیانہ اور بیدردانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص کیفیت ہے جو ان دونوں اشعار کو پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

علاوہ ازایں پیری کا موضوع تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص انیسؔ اور خاندان انیسؔ کا محبوب ترین موضوع ہے لہذا ہر شاعر نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ مندرجہ اشعار کے علاوہ سلام کے کچھ اور اشعار ملتے ہیں

سلام

زیر خنجر کہتے تھے شہ اب ملا لطف حیات
یوں بسر ہو گر تو عمر جاودانی چاہیے

جب صدا آتی ہے کیا درکار ہے کہتے ہیں شاہ
بس تیرے بندے کو تیری مہربانی چاہیے

کیا کریں کیونکر چھپائیں تشنگی شاہ غیور
ہونٹوں کی خشکی کہے دیتی ہے پانی چاہیے

مندرجہ سلام مکمل تو نہیں لیکن پیش نظر اشعار رثائیت اور اخلاقی مضامین کا

احاطہ کرتے ہیں۔ غزلیت کا اس میں رنگ نظر نہیں آتا۔

انسانی زندگی یا حیات کی منزل مقصود اسکی موت ہے جس سے انسان حتی الامکان اپنا دامن بچانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوتا۔ موت تو زندگی کی معراج ہے اور یقینی امر ہے لیکن کربلا والے اپنی زندگی کی معراج پر جلد سے جلد پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی منزل کو پالیں، اور اس منزل پر پہنچنے کیلئے ثابت قدمی اور اللہ کی مرضی پر راضی بہ رضا رہنا یقینی ہے اور یہ اہلبیت کا گھرانہ موت سے دامن بچانے کے بجائے موت کو گلے لگاتا ہے۔ چنانچہ انیسؔ نے بھی اپنے مرثیے میں اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

؎ اے موت جلد آ کہ بس اب زندگی ہے شاق
خنجر کی آرزو ہے شہادت کا اشتیاق

دوسرے شعر میں رشید اسی ثابت قدمی کو پیش کرتے ہیں کہ مظلوم کربلا سے سوال کرنے پر بھی وہ اپنی کسی خواہش کا اظہار نہیں کرتے بلکہ یہی فرماتے ہیں کہ اللہ کی مہربانی اگر شامل حال ہو تو کڑی سے کڑی منزل بھی بہ آسانی طے ہو سکتی ہے

تیسرا شعر قاری کے دل پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے کہ میدان کربلا میں اہلبیت پاک پر مسلسل تین شب و روز کی پیاس تھی جس سے شیر خوار بھی بچ نہ سکا۔ ان حالات میں امام اپنی تشنگی کا اظہار کیونکر کرتے، لیکن ہونٹوں کی خشکی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ تین روز سے ہونٹ تر نہیں ہوئے

علاوہ ازایں پیارے صاحب رشید کا ایک اور سلام دستیاب ہوا

شہ جو غصے میں بڑھے بند سپر کھولے ہوئے
جلد سدرہ سے چلے جبریل پر کھولے ہوئے

ہے اندھیرا قتل کے میدان میں چاروں طرف
فاطمہؑ کی بیٹیاں آتی ہیں سر کھولے ہوئے

صبح سے ہے آمدِ سرور کی رضواں کو خبر
منتظر ہے گلشنِ جنت کا در کھولے ہوئے

انتظار شاہ کی تصویر صحرا بن گئی
منہ کئے ہیں جانبِ در چشمِ تر کھولے ہوئے

کر کے فرصت شہ جہاں میں آئے ہیں مجمع ہے گرد
آپ بیٹھے ہیں لبِ کوثر کمر کھولے ہوئے

ہے سکینہ کو رہِ خالق میں لٹ جانے کا شوق
بیٹھی ہیں چادر سے کانوں کے گہر کھولے ہوئے

دل کو فرحت دیتی ہے گرمی میں تیروں کی ہوا
ہیں قبا کے بند شاہِ بحر و بر کھولے ہوئے

غم سکینہ کا ہوا نادم ہوئے دربان بہت
صبح تک رویا کئے زنداں کا در کھولے ہوئے

دستِ حُر وا کر کے بولا دلبرِ مشکل کشا
ایسے عقدے میں ہمارے بیشتر کھولے ہوئے

جا چکا ہنگامِ غفلت ہوش میں آؤ رشید
ہے سفر کا وقت بیٹھے ہو کمر کھولے ہوئے۔

مندرجہ سلام ادبی اور رثائی ہونے کے علاوہ اخلاقی اقدار بھی رکھتا ہے۔ سلام کے پہلے شعر میں امامِ مظلوم کی جلالت کو پیش کیا ہے جبکہ قبل ازیں سلاموں میں صرف امام کی مظلومیت کو پیش کیا گیا تھا۔ سلام کا مندرجہ شعر

غم سکینہ کا ہوا نادم ہوئے دربان بہت
صبح تک رویا کئے زنداں کا در کھولے ہوئے

راہِ حق میں کربلا والوں کی ثابت قدمی کا اظہار کرتا ہے کہ اس گھرانے کے لوگ وہ ہیں جو

سرکشانا گوارہ کرتے ہیں لیکن سر جھکانا نہیں، عمر کو اسمیں کوئی دخل نہیں۔ چھ مہینے سے لیکر ۶۲ سالہ ضعیفوں کے دل میں یہی جذبہ موجزن اور کارفرما ہے جسکے تحت وہ زندگی کی ہر کٹھن منزل کو بہ آسانی طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ دربان بھی اس حال زار کو دیکھ کر رو پڑتے ہیں اور اپنے بیجا ظلم پر نادم ہوتے ہیں۔

سلام کے مقطع سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ رشید نے یہ سلام اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

ہے سفر کا وقت بیٹے ہو عمر کھولے ہوئے۔

پیارے صاحب رشید کی شادی میر انیس کے فرزند رشید کی لڑکی سے ہوئی جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ دونوں خاندان ایکدوسرے کے اور بھی قریب آتے لیکن اسکے برعکس میر انیس اور عشق و تعشق میں کشیدہ ناخوشگواری پیدا ہوگئی۔ تعشق کے تذکرے میں اسکا ذکر آچکا ہے کہ شاید انیس سے ناخوشگواری تعلقات کی بناء پر تعشق نے عراق ہی میں ۱۸ سال گزارے۔ اسکا سبب یہ تھا کہ رشید کی شادی انکے ننھیال میں یعنی اپنی ماموں زاد بہن سے ہوئی تھی، جبکہ رشید کے دادھیال والوں کی خواہش تھی کہ انکی شادی میر عشق کی لڑکی سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور رفتہ رفتہ تعلقات بہت ہی کشیدہ ہوگئے۔

پیارے صاحب رشید نے تعشق کیطرح کئی سفر کئے لیکن قیامات قدسہ کے ہیں بلکہ بلگرام پور، عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدرآباد کے علاوہ سلسلۂ ذاکری کلکتہ، سلیم پور اور

کانپور کا بھی سفر کیا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں رام پور کا سفر کیا۔ اسکی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ جب یہ نواب صفدر علیخاں کے مشورے پر رام پور گئے تو نواب حامد علی والئی رام پور نے ان سے مجلس پڑھنے کی خواہش کی۔ جب رشید نے انکی یہ خواہش کی تکمیل کی تو انہیں رشید کی ذاکری بہت پسند آئی چنانچہ انہوں نے رشید کو ہر سال کلکتہ آنیکی دعوت دی جسکی بنا پر رشید بہ پابندی ہر سال کلکتہ جایا کرتے جسکا معاوضہ بھی وہ والئی رام پور سے پاتے تھے۔

ڈاکٹر جعفر رضا اپنی تصنیف میں عظیم آباد کے سفر کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں کہ

"رشید کو عظیم آباد میں میر انیس کے معتقدوں نے سنہ ۱۹۱۰ء م سنہ ۱۳۲۸ھ میں بلایا اور ان کی بہت قدر افزائی کی۔ باولی کے امام باڑہ میں عشرہ مجالس منعقد کیا گیا جہاں میر انیس نے شہرۂ آفاق مجلسیں پڑھی تھیں۔ رشید اس منبر پر پڑھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔" [1]

سرزمین حیدر آباد کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ بڑے بڑے مایہ ناز اور مستند اساتذۂ مرثیہ نگار بھی یہاں آتے رہے۔ اسی طرح پیارے صاحب رشید بھی مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوت بہت ہی اصرار و انکار کے بعد قبول کی لیکن سفر حیدر آباد کا کوئی سن نہیں ملتا کہ وہ حیدر آباد کب تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر جعفر رضا اپنی تصنیف میں سفر حیدر آباد کی تفصیل اسطرح پیش کرتے ہیں

---

[1] دبستان عشق کی مرثیہ گوئی — ڈاکٹر جعفر رضا — صہ ۲۹۴

"جب رشید حیدرآباد پہنچے تو اسٹیشن پر نواب بہرام الدولہ کے بیٹے نے استقبال کیا اور بہت اہتمام سے سالار جنگ کی بارہ دری میں قیام کرایا۔ یہیں انکے پہلے میر لفیس بھی فروکش ہوتے تھے۔ نواب بہرام الدولہ نے بڑے اہتمام سے مجلس عزا منعقد کی جسمیں عوام کے علاوہ حیدرآباد کے تمام امراء رؤسا شریک ہوئے۔ یہ مجلسیں حیدرآباد میں بہت مشہور ہوئیں۔ نظام حیدرآباد کو بھی اشتیاق پیدا ہوا اور اپنے ولی عہد عثمان علیخاں کے ہمراہ تشریف لائے اور اسکے بعد برابر آنیکا سلسلہ ہو گیا" ۱؎

نظام حیدرآباد نے رشید کے مرثیے کو بے انتہا پسند کیا اور رشید کی مدح میں رباعیاں کہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

؎ مداح امام دو جہاں میں یہ رشید — لاریب کہ اعجاز بیاں ہے یہ رشید
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا — میں کیا کہوں واللہ جواں میں یہ رشید (آصف)

جسکے جواب میں رشید کی مندرجہ رباعی ملتی ہے

؎ پیری میں جواں بن کے دیکھوں گا میں — اک جامہ نیا پہن کے دیکھوں گا میں
حضرت نے جواں کہا سنا تو نے فلک — ہر بار اب تجھ کو تن کے دیکھوں گا میں (رشید)

شہر حیدرآباد اور ریاست کے لوگ رشید کو بے حد پسند آئے جسکا ثبوت ان کی

مدحیہ رباعیوں سے ملتا ہے

نواب میر محبوب علیخاں کی وفات کے بعد نواب میر عثمان علیخاں ولی عہد سلطنت ہوئے۔ انکا عہد مجالس کے انعقاد، عزاداری اور عاشور خانوں کی تعمیر کے لئے سنہرا دور قرار پایا۔ مجالس کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ مجالس میں رشید کو بحیثیت ذاکر نمایاں اہمیت حاصل تھی۔ آصفجاہ سابع رشید کی ذاکری کے دل سے قائل تھے۔ ایک مرتبہ مجلس کا معاوضہ یا نذرانہ انہیں دیا گیا، جسپر رشید بہت ہی ناراض ہوئے۔

بہرام الدولہ جسکی دعوت پر وہ حیدرآباد آئے تھے انکے ہاں آخر تک مجالس پڑھتے رہے۔ چنانچہ حیدرآباد والے شعراء میں رشید کو بھی خاص مقام حاصل ہے۔

پیارے صاحب رشید کا انتقال ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ م ۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ہوا جسپر محشر لکھنوی جنکا شمار رشید کے مخلصین میں ہوتا ہے نے مصرعہ تاریخ لکھا ہے جو "دبستان عشق کی مرثیہ گوئی" میں ملتا ہے۔

؎ ہر ایک بیت پہ اک پاک گھر ارم میں ملا۔ ۱۳۳۶ھ

زیر نظر باب جو سلام نگاری کے دور عروج کا احاطہ کرتا ہے اسکی تکمیل اسوقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ میاں مشیر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ دبستان دبیر سے تعلق رکھتے ہیں

مشیر:- اسم گرامی گوہر علی صاحب تخلص مشیر تھا۔ میاں مشیر کے نام سے شہرت حاصل کی ۱۸۰۰ء میں ریاست بلہرا میں پیدا ہوئے۔ لیکن بعض ناگزیر حالات کی بناء پر نو سال کی عمر میں گھر سے نکلے اور لکھنؤ آئے۔ مشیر کے حالات ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے "دبستان دبیر" میں

دبیر کے شاگردوں کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے

مشیر نے خداداد صلاحیت اور ذہانت پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اوائل عمری ہی سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں میر ضمیر سے ملاقات ہوئی۔ وہ مشیر کی قابلیت اور اور صلاحیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ علم عروض کی تعلیم دی اور انہیں "دبستانِ دبیر" سے منسلک ہو جانے کا مشورہ دیا اور مرزا دبیر ہی نے انہیں مرثیہ گوئی کی راہ دکھلائی جس میں مشیر نے بے انتہا شہرت حاصل کی جسکے آگے مشیر کی مرثیہ گوئی بھی ماند پڑ گئی اگر وہ مرثیہ گو بھی کم درجے کے نہ تھے۔ ضمیر الدین حیدر کے دربار سے وابستہ تھے اور واجد علی شاہ کے درباری متوسلین میں بھی انکا شمار ہوتا تھا۔

ڈاکٹر حسن فاروقی لکھتے ہیں کہ

"دربار شاہی میں بھی مشیر اتنے بڑے مرثیہ گو تسلیم کئے جاتے تھے کہ وہ شاہی امامباڑہ میں باقاعدہ مرثیہ خوان کی حیثیت سے ملازم تھے۔" [1]

مشیر کی شہرت اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شاہزادے بھی ان کے تلامذہ میں تھے

عہدِ انیس و دبیر میں لکھنؤ کا دبستانِ شاعری دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا یہ انیسئے اور دبیریئے کہلاتے تھے۔ ان میں آپسی ادبی معرکے ہوا کرتے۔ یہاں مشیر کو یہ شرف حاصل تھا کہ یہ سارے دبیریوں سے سرگروہ تھے۔ عہد انیس و دبیر کے شعراء کی تعداد یہ ہو کر باوجود مرثیہ گو اور باکمال ہونے

---

[1] دبستانِ دبیر ڈاکٹر حسین فاروقی ص ۳۱۱

کے انیس اور دبیر کے آگے انکی شہرت نہ ہو سکی۔ مشیر کا شمار بھی ان ہی شعراء میں ہوتا ہے مراثی زیادہ پُر اثر ہوتے ہیں جسے پڑھ کر ہر چشم اشکبار ہو جاتی ہے

ہر سیہ اور مرثیہ دونوں متضاد اصناف ہیں باوجود اسکے ان دونوں اصناف میں بھی میاں مشیر نے شہرت حاصل کی۔

ہر سیہ گوئی کے ذریعے لوگوں کو مستقیم کر دیتے ہیں تو مرثیہ گوئی کے ذریعہ مبتلائے اندوہ غم کر دیتے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں تو مشیر کے ہم پلہ شاعر ملجاتے ہیں لیکن ہر سیہ گوئی میں مشیر کا جواب نہیں ملتا۔

ذاکر حسین فاروقی ہر سیہ سے متعلق لکھتے ہیں

"ہر سیہ کے لئے یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ میر ضمیر اسکے موجد تھے لیکن اسکا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا مثنوی مظہر العجائب میں جہاں ضمیر نے اپنی مرثیہ گوئی اور دوسرے اصناف سخن میں اپنے کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے وہاں ہر سیہ گوئی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے انکے کسی ہر سیہ کا بھی پتہ نہیں چلتا" [1]

لہذا میاں مشیر ہی کو ہر سیہ گوئی کا موجد قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ذاکر حسین فاروقی کے خیال کے مطابق مرثیہ میں ساقی نامہ کی ایجاد مشیر کے شاگرد ذکی بلگرامی نے کی ہے لیکن اسکے باوجود مشیر کے ساقی ناموں کی اہمیت اور مقبولیت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ساقی ناموں میں مندرجہ ساقی نامہ کا ایک بند زیادہ شہرت رکھتا ہے جو بچوں کی زبان زد

---

[1]

ہے جسے ذاکر حسین فاروقی نے مسدس کی ہیئت میں پیش کیا ہے

؎ تو اپنے ایک جام پہ نازاں ہے ساقیا چودہ پلانے والے میں پیر واہ ہے مجھ کو کیا

بتلائے دیتا ہوں تجھے میخانوں کا پتہ بطحا و کاظمین خراساں و سامرہ

خورشید مدعا میر ایرج شرف میں ہے

اک کربلا میں اک سرا ساقی نجف میں ہے

ساقی نامے کا مندرجہ بند ایک خاص خصوصیت یہ رکھتا ہے کہ اسمیں شاعر اپنے ساقی سے شراب مانگنے کے بجائے اپنے دل سیر ہونے کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساقی کو تمسخرانہ انداز میں کہتا ہے کہ تو اپنے ایک جام پر ناز کر رہا ہے جبکہ میرے ہاں چودہ پلانے والے موجود ہیں۔

عموماً ساقی نامہ یوں ہوا کرتا ہے۔ خود مشیر کے ساقی نامے کا مصرعہ ملاحظہ ہو

؎ امسال ساقیا مجھے عنقا شراب دے۔

ذاکر حسین فاروقی "دبستان دبیر" میں میاں مشیر کا تذکرہ کل بیس صفحات پر کافی تفصیل سے کرتے ہیں لیکن اسمیں سوائے مرثیہ گوئی و ہر سیہ گوئی کے کسی دوسری صنف پر طبع آزمائی کا کوئی ذکر نہیں چنانچہ یہ تذکرہ راقمۃ الحروف کی نظر میں نامکمل ہی ہے۔

"تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" جلد اول میں امیر علی جونپوری اگرچہ کہ میاں مشیر کا تذکرہ اسقدر تفصیلی نہیں کرتے لیکن باوجود اسکے وہ مشیر کی قصیدہ منقبت اور سلام گوئی کا

سلام مشیر

مجرئی عابدِ بیکس کو یہ صدمہ پہنچا
کس کے رسی سے ستمگار نے بندھا پہنچا

لاش قاسم کی اٹھانے کو جو آئے شبیر
انگلیاں پائیں کہیں اور کہیں پایا پہنچا

شاہ کہتے تھے کہ تلوار سے کٹتا ہے گلا
ہائے کس وقت میں آ کر خطِ صغرا پہنچا

کھل گیا سر تو یہ زینبؑ کہا یا جدّاہ
رتبہ یہ آپکی عزت کا یہ کچھ آ پہنچا

مجھ کو حیرت ہے یہی شمر کے کیا آیا ہاتھ
دختر حضرت شبیر کا کھینچا پہنچا

راہ میں یوں سر شبیر سے زینب نے کہا
ہائے کیا کیا کہوں جو جو مجھے صدمہ پہنچا

سر کھلا پشت پہ برچھی کی انی ہے کھائی
بھیا اب آپ کی خواہر کا یہ رتبہ پہنچا

جبکہ اک سوکھا سا مشکیزہ لئے خیمے سے
قوت بازوئے شہ تا لب دریا پہنچا

جھانک کر خیمے کے روزن سے سکینہ نے کہا
شکر ہے نہر پہ جا کر مرا سقا پہنچا

جب شتر باں نے کیا شاہ کے ہاتھوں کو قلم
روح زہرا و یداللہ کو صدما پہنچا

نیزہ اکبر کو ملا تیر ملا اصغر کو
جسکی تقدیر میں جو کچھ کہ لکھا تھا پہنچا

ہاتھ سے سلسلۂ صبر کو ہرگز نہ دیا
رسن ظلم سے عابد نے بندھایا پہنچا

سارباں کو نہ ذرا آہ کل آئی تب تک
جب تلک شاہِ شہیداں کا نہ کاٹا پہنچا

اے مشیر اب یہ دعا مانگ شہ والا سے
اپنے روضے پہ مجھے اے شہ والا پہنچا

(شمع تعزیت ص۷۰)

سلام مشیر

سوزِ غمِ حسینؑ ہے یہ اثر اب تک
پیتھرے ہے نکلتے میں سلامی لشکر اب تک

تقدیر کسی دل کو نہ دیوے غمِ اولاد
کیڑے ہوئے ہاتھوں سے ہے زہرا جگر اب تک

جب تعزیے اٹھتے ہیں علم ہوتے ہیں آگے
بھائی کے لئے بھائی ہے سینہ سپر اب تک

نے بالیاں باقی رہیں نے گوشِ سکینہؑ
باقی رہا ذکر ستم بد گہر اب تک

مقتل میں یہ بابا غمِ عباسؑ اٹھایا
کیڑے ہوئے فرقد میں ہیں ہولا کمر اب تک

زنداں میں سکینہ نے کہا شاہ کے سر سے
لی آپنے بابا نہ ہماری خبر اب تک

ہوتی بھی حسینؑ اور طمانچے بھی میں کھائے
سوجے ہوئے ہیں گال ہمارے یہ ورم اب تک

ستائی عباس ہے مرنے پہ بھی بیدا
مشکیزہ لگاتے ہیں علم میں شرر اب تک

یہ آبروئے شبر و شبیر ہے ورنہ
کس کے لئے دو حصے ہوا ہے گہر اب تک

ولوالی ہے ہر نائرِ شبیر کو زہرا
آتی ہے صدا اور دھنے یہ ہے ہے پسر اب تک

زینبؑ کے پسروں میں جو آئے تو یہ اغل
کیجا یہ نہیں دیکھے تئی شمس و قمر اب تک

مرنے پہ بھی ثابت ہے علمداریٔ عباسؑ
ہے تعزیے کے پاس علم جلوہ گر اب تک

غافل نہیں ایک آن غمِ شاہ سے زہرا
اللہ کو دکھلاتی ہے داغِ جگر اب تک

مثلِ گہرِ اشکِ مشیر جگر افگار
دیکھے نہ کبھی آنکھ سے ہمنے گہر اب تک

شمع تعزیت (ص ۱۸۱، ۱۸۰)

ذکر اس طرح کرتے ہیں

"شاعری کا بچپن سے شوق تھا قصیدے منقبت اور سلام کہتے تھے" [1]

سفارش حسین رضوی نے بھی اپنی تصنیف "اردو مرثیہ" میں مشیر کا ذکر بہت ہی مختصر طور پر کیا ہے اور سلام گوئی کا تذکرہ بھی انہوں نے نہیں کیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں مشیر نے صنف سلام پر بھی طبع آزمائی کی لیکن باوجود تلاش بسیار کے ان کے سلام دستیاب نہ ہو سکے تھے پروفیسر منیر مسعود نے سلاموں کے جس مجموعے "شمع تعزیت" کی نشاندہی کی ہے اسمیں شعراء کے نام اور ان کے سلاموں کی تعداد تین بتاتے ہیں۔ راقمۃ الحروف موصوف کی بیحد مشکور ہے کہ آپ نے علمی رہنمائی کی اور اس مقالے کے لئے دو سلام روانہ کئے۔ دبستان دبیر سے تعلق رکھنے والے ایک اور شاعر کا تذکرہ یہاں اسلئے کیا جا رہا ہے کہ راقمۃ الحروف کو انکے سلاموں کا دیوان دستیاب ہوا۔ مداح کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

مدّاح:۔ سید اولاد حسین رضوی نام اور مدّاح تخلص کرتے تھے۔

سی۔ آئی۔ ای چیف سٹلمنٹ آفیسر صوبہ متوسط پہرسہ ضلع بھرت پور کے عہدے پر فائز تھے۔ مدّاح آلِ رسولؐ سے ہٹ کر کسی اور صنف پر طبع آزمائی نہیں کی یقیناً اسی بناء پر اپنا تخلص مدّاح رکھا۔ خاندان بھی معمولی نہ تھا۔ معزز اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۶ جون ۱۸۲۶ء کو پہرسہ میں پیدا ہوئے۔ ہنگام غدر سے قبل والد ایسٹ

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو امیر علی جونپوری ص ۴۵

انڈیا کمپنی کی عملداری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے لیکن ہنگام غدر میں انکے والد قتل کر ڈالے گئے۔

متواح نے آگرہ کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اپنے والد کے انتقال سے ایک سال قبل یعنی ۱۸۵۶ء میں ڈپٹی کلکٹر بندولبست کے عہدے پر فائز ہوئے اور والد کے قتل کئے جانے کے بعد بھی بڑی مستقل مزاجی سے اپنی ذمہ داری کو نبھاتے رہے جسکے صلے میں غدر کے ہنگامے کے بعد خلعت فاخرہ سے نوازے گئے جو انگریزی سرکار کی جانب سے انہیں ملی تھی۔

متواح کو سب سے پہلا ہندوستانی ڈپٹی کمشنر ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ ۱۸۷۷ء میں خان بہادر اور ۱۸۸۲ء میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملا اور ۱۸۸۵ء کو وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ اس قدر اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود بھی متواح نے اپنی آخرت کو فراموش نہ کیا بلکہ مدح اہلبیت سے اپنے قلم کو عزت بخشتے رہے۔ اس طرح دنیا و آخرت دونوں کو ساتھ ساتھ سنوارا گویا شاگرد دبیر ہونے کا متواح نے حق ادا کر دیا۔ مرزا صاحب کا کلام انہیں ازبر تھا۔ اگر کوئی کسی دوسرے شاعر کی تعریف کرتا ہوا کہتا کہ فلاں شاعر نے نیا مضمون باندھا ہے تو یہ جواباً مرزا صاحب کے اسی مضمون میں باندھے ہوئے اشعار سنا دیتے۔

متواح کا کلام نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان میں بھی ملتا ہے سارا کلام اہلبیت کی مدح میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی متواح کی سلام گوئی کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ

"متراح کے سلام صاف، شستہ اور شیریں زبان میں ہیں۔
خلوص فکر اور جذبہ دلی کے ساتھ ہی ساتھ ان میں تاثیر شعریت
اور مضمون آفرینی کے جوہر بھی موجود ہیں بندش اور شکل زمینوں
میں بھی جو شعر کہے ہیں ان میں بھی شعریت اور تاثیر قائم رکھی ہے،
جو انکی پختہ مشقی کی دلیل ہے۔" [1]

سلام کا دیوان "زاد سبیل آخرت" کے نام سے ملتا ہے جو ۱۳۱۵ھ کا شائع شدہ ہے
یہ کل ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ضخیم دیوان ہے جسمیں ۱۵۶ صفحات تک سلام ملتے ہیں
یہ رثائیہ، لعتیہ اور منقبتی ہیں۔ لعتیہ صفحات پر قطعے، رباعیات خمسہ پر قصیدہ، خمسہ
پر غزل، مخمس بہ سلام دگیر شعراء تضمین بر شعر غالب اور تضمین بر رباعی ملتی ہے

شاہ است حسین بادشاہ است حسین

پر بھی متراح نے تضمین لکھی ہے

سلام کے علاوہ قطعے رباعیات، خمسے تضمین وغیرہ سب مدح اہلبیت پر مبنی ہیں
اپنی تصنیف سے متعلق متراح کے کئی تاریخی قطعات ملتے ہیں جنمیں سے ایک درج ہے

قطعہ

یہ ایک حقیر ترین بندوں میں ہے متراح — ازل سے لے کے دن سے وہ ہے عاشق شہ کونین
سلام خمسوں میں اسنے پر ائے کسب ثواب — مصیبت شہ بکیں لکھی بہ شیون و شین

---

[1] دلستان دبیر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۴۳۷

تھی فکر سال کی اسکو کہا یہ ہاتف نے — صحیح سال ہے۔ ہو یہ برائے نذر حسین
۱۳۱۵ھ

مندرجہ تاریخی قطعے سے سن اشاعت نکلتی ہے۔ ازل سے عاشق شہ کونین ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ قلم دوسری اصناف سے آشنا نہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی قطعات رباعیات اور مثنوی پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔

مختلف شعراء نے بھی مدّاح کے کلام کی مدح میں تاریخی قطعات لکھے ہیں جن میں خود مدّاح کے فرزند بھی شامل ہیں جنکے اشعار درج ذیل ہیں۔

ہے یہ مجموعہ سلام و خمسہ کا — جس میں ہے احوال شاہ بے وطن
والد ماجد نے ہے اسکو لکھا — تا کہ پائیں فیض اس سے مرد و زن
میں نے بھی چاہا لکھوں تاریخ و سال — ہو اگر تائید روح پنجتن
ناگہ ہاتف نے کہا موسیٰ سے یہ — لکھ سر احسان سے منظور حسن
۱۳۱۴+۱ھ

مدّاح کے دیوان کا آغاز نعتیہ کلام سے ہوتا ہے جسکا پہلا شعر درج ہے

؎ سرکار ذوالجلال ہے سرکار مصطفیٰ
سب انبیاء میں لمعۂ انوار مصطفیٰ

سلام بالکل نعتیہ بھی نہیں بلکہ رثائیہ بھی ہے۔ مندرجہ شعر رثائیت پر مشتمل ہے

؎ دشت بلا میں باغیوں کے ظلم و جور سے
بے آب خشک ہو گیا گلزار مصطفیٰ

بالکل اسی طرح دوسرے سلام میں منقبت و رثائیت ساتھ ساتھ ملتی ہے۔ تقریباً

سلاموں کا آغاز لفظ مجرئی، مجرا یا سلامی، سلام سے ہوتا ہے۔ اکثر سلام کافی طویل ہیں۔ ستیانوے یا سو اشعار پر مبنی سلام بھی ملتے ہیں۔

مشکل زمینوں میں بھی جو سلام ملتے ہیں وہ ادبیت کے اعتبار سے بوجھل معلوم نہیں ہوتے بلکہ اسمیں شعریت باقی ہے جسکی وجہ سے تاثر برقرار رہتا ہے۔ سلام کے کچھ اشعار درج ہیں۔

سلام

۱۔ مجرئی یوں شاہ کی تصویر کھینچ — حلقِ اقدس پر خطِ شمشیر کھینچ

۲۔ کھینچ لو، تصویرِ عباس و علم — مشک کھینچ اور اسکے اوپر تیر کھینچ

۳۔ یاد کرکے زاری اہلِ حرم — تو بھی ایدل نالۂ شبگیر کھینچ

۴۔ کہتے تھے رہ گیر یہ سجاد سے — خار تو تلوؤں سے اے دلگیر کھینچ

۵۔ بولی بانو غش میں ہے عابد مرا — شمر بستر سے نہ بے تقصیر کھینچ

روضۂ شہ کی طرف مدّاح کو

اے دعائے صبح کی تاثیر کھینچ

مندرجہ سلام کیلئے تصور شرط ہے۔ رثائیہ اور رقت آمیز اشعار پر مبنی ہے بہت ہی مؤثر انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔

مدّاح کا انتقال ۱۳ محرم ۱۳۳۳ھ کو آگرہ میں ہوا۔ مزار حضرت شہید ثالث میں دفن ہوئے۔

سلام گوئی کے دورِ عروج کے شعراء کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا

جب تک کامل کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

کامل :- نام علی میاں، کامل تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ انہیں مجتہد کے فرزند ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ شاعری کا آغاز صنف قصیدہ، سلام اور منقبت سے ہوتا ہے بعد ازاں مرثیے کہنے لگے۔ امیر علی جوشنوری لکھتے ہیں کہ

"کامل صاحب کے مرثیوں کا معیار کافی اونچا تھا مگر خاندان انیس کا اثر لوگوں کے دلوں پر اتنا گہرا تھا کہ انکا سکہ نہ چل سکا۔ جناب انیس کی مرثیہ نگاری کی دھوم مچی تھی۔ ان کا چراغ نہ جل سکا" [1]

لیکن باوجود اسکے تقریباً ہر تذکرہ نگار نے کامل کا تذکرہ کیا ہے جسکی وجہ یہی ہے کہ انکے کلام میں ہر وہ چیز موجود ہے جو کلام کو معیاری بناتی ہے۔

راقمۃ الحروف کے نظریئے کے مطابق اگر انیس سے کامل کے کلام کا تقابل کیا جائے تو کامل کا پلہ ہی بھاری رہے گا کیونکہ انیس شہنشاہ مرثیہ میر انیس کے فرزند ہونے کا شرف رکھتے ہیں اور شاگرد انیس میں جو خاندان مرثیہ گویان کی چھٹی پشت کے نمائندے ہیں۔ شاعری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ مرثیہ گوئی ہی کے ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ چاروں سمت سے مرثیہ گوئی کی گونج سنائی دے رہی ہے چنانچہ ایسے شاعر کا صنف مرثیہ میں شہرت حاصل کرنا تعجب خیز امر نہیں جبکہ کامل کا کلام بھی انیس سے کچھ کم رتبے

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو حصہ اول — امیر علی جوشنوری — صفحہ ۴۰۵

کا نہیں لیکن چونکہ خاندانِ انیس کے چرچے تھے لہذا کامل کی شہرت ماند پڑ گئی۔
کامل کی شخصیت کا جائزہ لیں تو علم ہوگا کہ کامل کا تعلق لکھنؤ کے کسی بھی
نامور دبستان سے نہ تھا۔ جیسے دبستانِ دبیر، شاگردانِ انیس اور دبستانِ عشق
وغیرہ۔ کامل کا شمار مرثیہ گوئی کے انفرادی شعراء میں ہوتا ہے۔
ڈاکٹر صفدر حسین خاندانِ انیس، دبستانِ دبیر اور دبستانِ عشق کے مرثیہ گو
شعراء کے نام گنواتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں

"انفرادی طور پر مرثیہ کہنے والوں میں مولوی مہدی حسین ماہر
علی میاں کامل، بنے صاحب، مشتاق، اصغر حسین فاخر، میر
مہدی کمال، تشفی، اعجاز اور خورشید وغیرہ تھے"۔ [1]

نفیس اور کامل کا تقابلی جائزہ لینے سے راقمتہ الحروف کا مقصد ہرگز نفیس
کو نیچا دکھانا یا انکے کلام کی اہمیت سے انکار کرنا نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نفیس
نے مرثیہ گوئی کے لئے میدان بالکل ہی صاف اور حالات سازگار پائے جبکہ علی میاں
کامل کیلئے صنف مرثیہ پر طبع آزمائی اتنی آسان نہ تھی باوجود اسکے کلام معیاری ہے۔
پروم شری علی جواد زیدی نے اپنے رسالے میں کامل کے تین سلاموں کا انتخاب کیا ہے
ایک سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

وطن تھا آہ کنعانِ رسالت جن جبینوں کا
بہا صحرا میں پانی ہو کے خوں ان نازنینوں کا

ستاروں کی چمک تھی خاک و خوں آلودہ لاشوں میں
پڑا تھا کھیت جنگل میں عرب کے مہ جبینوں کا

---

[1] رزم نگارانِ کربلا ڈاکٹر صفدر حسین ص ۱۱۱

فلک نے آہ کیوں تو ڑا انہیں سنگِ حوادث سے — علیؑ و فاطمہؑ کا گھر تھا معدن جن نگینوں کا

جواں کیا کیا سہی قامت شہِ دیں ساتھ لے کے چلے — حسینی فوج گلدستہ تھی مترب کے حسینوں کا

جگہ دی تھی سرِ خاک آسماں نے ان کے لاشوں کو — مکاں رتبے میں تھا عرش معلیٰ جن مکینوں کا

ستایا بیٹھا غربت میں اولادِ سمیہ کو — کیا برباد بے دینوں نے گھر عترت نبیوں کا

تفاخر شخصیت میں ہے مجھے اس وصف میں کامل — ثناخواں ہوں رسولِ حق کے بارہ جانشینوں کا

واقعی کامل کا یہ سلام ہر طرح سے کامل نظر آتا ہے۔ زمین کا انتخاب بھی واقعی بہت خوب ہے۔ ساتھ ہی پیمبر شہری علی جواد زیدی کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ میر انیس کا مشہور سلام جو "زمینوں کو" "نگینوں کو" اور "مکینوں کو" کی زمین میں ہے یہ کل بتیس (۳۲) اشعار پر مبنی ہے۔ بالکل اسی طرح سے کامل کا مندرجہ سلام بھی "زمینوں کا" "مہ جبینوں کا" "نگینوں کا" اور "مکینوں کا" کی زمین میں ہونے کی وجہ سے اسیر میر انیس کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مدیار بھی کچھ کم نہیں اور آخر میں ثناخوران اہلبیت ہونے پر فخریہ انداز بھی انیس جیسا ہی ہے۔ اگر کامل آخر میں اپنے تخلص کا استعمال نہ کرتے تو اس سلام پر میر انیس ہونے کے سلام کا دھوکہ ہوتا۔ کامل کا فخریہ انداز بھی تو اپنا ہی ہے۔

تفاخر شخصیت میں ہے مجھے اس وصف میں کامل
ثناخواں ہوں رسولِ حق کے بارہ جانشینوں کا

اپنے اس مقطع کامل نہ صرف اپنے ثناخواں چہاردہ معصومین ہونے پر فخر کرتے ہیں بلکہ صنف سلام پر کامل عبور رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کامل کا ایک اور سلام قابل دید ہے۔

سلام

عزیز شام سے سو سو رہے بجھا کے چراغ
جلائے غیروں نے میری لحد پہ لا کے چراغ

جگہ تو زخم کی باقی نہیں ہے سینے میں
بغور دیکھ لے اے داغ دل اٹھا کے چراغ

نفس کی آمد و شد یوں ہے عہد پیری میں
قریب صبح جلے جیسے جھلملا کے چراغ

گرا چکا تھا کنوئیں میں سواد جہل مجھے
دلائے آل نے کی رہبری دکھا کے چراغ

سیاہ کفر سے ہوتا تمام روئے زمیں
اگر زمانے میں ہوتے نہ مصطفیٰ کے چراغ

اسی حرم کی تجلی حریم قدس میں ہے
رواق عرش کی زینت میں کربلا کے چراغ

ولی کے نور کا پرتو پڑے اگر شب کو
جلائے آئینہ جام جہاں نما کے چراغ

نہ رہ سکا کسی پردے میں نور علم نہاں
کہاں کہاں نہیں رکھا چھپا چھپا کے چراغ

ہوائے دہر کو گزرے نہ شاق اے کامل
ہماری قبر سے رکھیں الگ ہٹا کے چراغ۔ [1]

راقمۃ الحروف نے چاہا کہ مندرجہ سلام مختصراً پیش کرے لیکن کوئی شعر بھی ایسا نظر نہ آیا جسے رد کیا جا سکے۔ اپنے بیش قیمت اور انوکھے خیالات کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ انداز بیان بہت ہی خوب ہے۔ سلام نہ صرف رثائی اور منقبتی ہے بلکہ ساتھ ہی غزل

---

[1] حسین پر سلام — سید علی رضوی — ص ۱۵۸

کا رنگ بھی کہتا ہے

مندرجہ شعر ملاحظہ ہو

؎ نفس کی آمد و شد یوں ہے عہدِ پیری میں
قریب صبح جلے جیسے جھلملا کے چراغ

اس عہد کے شعراء میں وحید کا تذکرہ بھی از حد ضروری ہے یہ خانوادۂ انیس ہی کے چشم و چراغ ہیں۔

وحید :- میر انس برادر میر انیس کے فرزند تھے۔ خانوادۂ میر انیس کے چشم و چراغ ہونے کے ناطے کلام میں زبان و بیان، تشبیہات و استعارات کے استعمال میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ امیر علی جونپوری نے اپنے تذکرے میں وحید کا سن پیدائش نہیں بتایا ہے البتہ سن وفات ۱۸۸۶ء لکھتے ہیں۔

"۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کے محلے باورچی ٹولہ میں انتقال ہوا۔" [1]

کیں تعجب ہے کہ ابواللیث صدیقی اپنی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کے سلسلے میں وحید کا تذکرہ نہیں کرتے لیکن "باقیاتِ انیس" جلد اول میں خانوادۂ میر انیس کی تصاویر ملتی ہیں جنکا مختصر سا تعارف اکبر حیدر کشمیری نے کروایا ہے۔ وحید کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

میر انیس کے بھتیجے میر ہادی نام وحید تخلص ۱۸۳۲ء میں

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو جلد اول — امیر علی جونپوری — ص ۵۲۲

پیدا ہوئے۔ مرثیہ گوئی میں بڑا اچھا مذاق تھا۔ اپنے
والد میر مہر علی انس کے شاگرد تھے۔ اپنے چچا میر انیس کے
مرثیوں پر مرثیے کہے اور سلاموں کی تضمین بھی خوب کیں۔
خوانندگی بھی خوب فرماتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں محلہ باورچی ٹولہ
میں انتقال ہوا۔ حکیم بندے مہدی کے مقبرے میں والد ماجد
میر مہر علی انس کے برابر دفن ہوئے۔" [1]

وحید کا سلام جو خاص و عام کی زبان زد ہے اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے درج ذیل ہے۔

سلام

آہ سوزاں لب تک آئی اشک ناب آنے کو ہے — جوش میں گل میں دھواں اٹھا گلاب آنے کو ہے
سامنے عادل کے عصیاں سے حجاب آنے کو ہے — دوڑ اے رحمت کہ اب فرد حساب آنے کو ہے
یاد کیا کرتے ہیں طفلی کو جوانی میں بشر — وقت پیری کا ابھی بعد شباب آنے کو ہے
ماتم شبیر میں اٹھتا ہے رو کر کون کون — دیکھئے کس کس کے حصے میں ثواب آنے کو ہے
آستیں الٹی ہے شہ نے اب الٹتی ہے زمیں — قلب تھراتا ہے ڈر سے انقلاب آنے کو ہے
طوق پہناتے ہیں ظالم عابد بیمار کو — جسم لرزاں ہے گہن میں آفتاب آنے کو ہے
لشکر ناری سے حر نکلا تو آئی یہ ندا — بہر استقبال ابن بوتراب آنے کو ہے
خاک سے اب پاک ہوگا تو گنہ دھو جائینگے — لے ہوا بولی کہ رحمت کا سحاب آنے کو ہے۔

---

[1] باقیات انیس جلد اول مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدر کشمیری ص ۱۵۸

قلب نازک پر غبار آنے نہ دیجو اے زمیں — تیرے گھر مہماں غلام بوتراب آنے کو ہے

اے فرشتو ایک دم تھم جاؤ پھر کرنا سوال — میرا مولا بہر تلقین جو رب آنے کو ہے

نزع میں کرلوں زیارت اے اجل دم لے ابھی — جو میرا مشکل کشا ہے وہ جناب آنے کو ہے

عالم رویا میں دیکھے گی سکینہ باپ کو — جاگنے پر بخت میں زنداں میں خواب آنے کو ہے

شہ کو پیری میں دکھاتا ہے فلک اکبر کا داغ — ہو کے رخصت گھر سے نکلے میں عقاب آنے کو ہے

سال ہے اٹھارواں عارض پہ سبزہ ہے نمود — حسن مٹ جانے کو ہے مرگ شباب آنے کو ہے

مدح آل مصطفےٰ دم بھر نہ کم ہو اے وحید

عندلیب گلشن زہرا خطاب آنے کو ہے [1]

سلام کل بیس اشعار پر مبنی ہے۔ طوالت کے پیش نظر سلام کو مختصراً پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ اشعار میں انداز بیان اور مضامین کا انتخاب نہایت عمدہ ہے۔ نہ رثائی بلکہ اخلاقی مضامین کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

"پیری" کا موضوع تو ایسے لگتا ہے جیسے یہ خانوادۂ میر انیس کی میراث ہے

قطعہ بند اشعار بھی سلام میں ملتے ہیں۔

اے فرشتو ایک دم تھم جاؤ پھر کرنا سوال

میرا مولا بہر تلقین جو رب آنے کو ہے۔

اس شعر میں وحید نے ایسی کیفیت کو نظم کیا ہے جس کے لئے تصور شرط ہے۔

تصور ہی شعر کی اس کیفیت کا بخوبی احاطہ کر سکتا ہے۔ ادبی تخلیق کی یہی پہچان

---

[1] عطر کلام مجموعہ سلام مرتبہ سید صغیر حسن شمس زیدی الواسطی ص ۹۰۸

ہے کہ وہ کسی مادی شئے کی محتاج نہیں بلکہ صرف ذہنی ہوتی ہے۔

ایک اور شعر بھی اسی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔

نزع میں کر لوں زیارت اے اجل دم لے ذرا

جو مرا مشکل کشا ہے وہ جناب آنے کو ہے

سلام کا مقطع منقبتی انداز رکھتا ہے۔

اسطرح انیس و دبیر اور دلبتانِ انیس و دلبتانِ دبیر اور دلبتانِ عشق تک پہنچنے پر صنف سلام گویا معراجِ کمال پر پہنچ چکی تھی۔ عہدِ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ تک تو سلام صرف رثائیت اور اہلِ بیت اطہار پر عقیدت کے موضوعات پر غور کرتا ہے اور اسمیں بیت کی کوئی پابندی نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر بیت میں سلام دستیاب ہوتے ہیں لیکن عہدِ میر انیس اور مرزا دبیر میں سلام کیلئے غزل کی ہیئت متعین ہو چکی۔ سلام کے موضوعات صرف رثائی نہیں رہے بلکہ اسمیں اخلاقی مضامین بھی شامل ہو چکے۔ میر انیس کے ہاں ایسے بھی سلام ملتے ہیں جو صرف رثائی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے سلام بھی ہیں جو حمد، نعت، منقبت اور رزم و بزم پر مشتمل ہیں جنکو پدم شری علی جواد زیدی نے علیحدہ ترتیب دیکر تحت اللفظ اور سلام سوز کا عنوان دیا ہے۔ تحت اللفظ میں وہ تمام موضوعات پر مبنی سلام موجود ہیں جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن سوز کے سلام کے تحت صرف رثائی سلام ہی ملتے ہیں۔ یہ علیحدہ ترتیب صرف انیس کے سلام تک محدود ہے لیکن دوسرے شعراء کے سلاموں میں مندرجہ بالا تمام موضوعات اجتماعی طور پر ملتے ہیں۔

اخلاقی مضامین اور خیالات کی نزاکت و بلندی اور اشعار میں غزلیت کا
رنگ اس دور کی خاص خصوصیات ہیں۔

کیفی سب سے پہلی صدی تک پہنچتے پہنچتے غزل کی ہیئت ہی صنف سلام کے لیئے
مخصوص نہیں رہی بلکہ آزاد نظم کی ہیئت میں بھی سلام لکھے جانے لگے اور زیادہ تر نعتیہ
و منقبتی سلام گوئی نے مروج پایا کہ کیونکہ صنف مرثیہ ہو یا صنف سلام یہ تو
موضوعی اصناف ہیں۔ چاہے کسی بھی ہیئت میں لکھے جائیں یہ اپنی شناخت
نہیں کھو سکتے۔

بیسویں صدی میں سلام گوئی

نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کا احیاء

اسیر، داغ اور امیر کے سلام کی روایت

اقبال کا انداز ایک اجتہاد

مسرور، شہید یار جنگ شہید

اور

حفیظ، سحر، میر عثمان علی خان اور عثمان کے سلام

یہ ایک مستند حقیقت بن چکی ہے کہ مرثیہ ہو یا سلام یہ موضوعی اصناف ہیں ہیئت کی تبدیلی ان اصناف کی شناخت میں مانع نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء سے لیکر دورِ حاضر تک سلام ہر ہیئت میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ وہ تمام اشعار سلام ہی کہلانے کے مستحق ہوئے جو شہدائے کربلا یا بزرگانِ دین کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کئے جائینگے چاہے وہ کسی بھی ہیئت میں لکھے گئے ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ عہدِ انیس و دبیر سے قبل سلام کی کوئی ہیئت معین نہ تھی لیکن عہدِ انیس و دبیر میں اور اسکے بعد سلام کے لئے غزل کی ہیئت متعین ہو چکی چنانچہ میر انیس اور مرزا دبیر کے کل سلام اسی ہیئت میں ملتے ہیں لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ عہدِ انیس و دبیر کے بعد سلام گو شعراء اسی مخصوص ہیئت کے پابند ہو گئے بلکہ بیسویں صدی میں آزاد نظم کی ہیئت میں بھی سلام کہے گئے۔

جسطرح مرثیہ لفظ "رثا" سے مشتق ہے جسکے معنی میت پر بین کرنا ہے ضمناً مرثیہ کی تعریف کی مناسبت سے ہر وہ نظم مرثیہ کہلانے کی مستحق ہوگی جسمیں قریبی رشتہ داروں یا کسی بھی شخص کی موت پر اظہارِ افسوس کیا جائے لیکن اسے عام مرثیے سے ممیز کرنے کیلئے شخصی مرثیے کا نام دیں گے، اور مرثیے کا عام تصور واقعات کربلا ہی پر مبنی نظم ہوگی۔ بالکل اسیطرح صنفِ سلام کا عام تصور بھی واقعات کربلا کا احاطہ کریگا۔ ایسے سلام بھی ملیں گے جسمیں حضور سرورِ کائنات ہر بطورِ عقیدت

سلام بھیجا گیا ہے۔ یہ نعتیہ سلام کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھیں گے اور ایسے سلام کی کمی نہیں جسمیں بزرگانِ دین پر خلوص دل کے ساتھ نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہو۔ یہ سلام منقبتی سلام کہلائیں گے۔ لیکن سلام کا عام رجحان ثنائی سلام ہی ہوگا کیوں کہ پیش نظر مقالہ سلام کی اُس مخصوص قسم تک محدود نہیں ہے نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کا تذکرہ بھی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی میں نعتیہ و منقبتی سلام نے دوبارہ رواج پایا کیوں اسکا مطلب یہ نہیں کہ بیسویں صدی میں صرف اور صرف نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کا شعور رہی کارفرما رہا بلکہ ساتھ ساتھ ثنائی سلام گوئی بھی فروغ پاتی رہی۔

ڈاکٹر ڈاکٹر حسن فاروقی "دلبستانِ دبیر" میں میر انیس کے بعد ضعف مرثیہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"انیس و دبیر کے بعد جو مرثیہ گو میدان میں آئے انکو ہم تین طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا طبقہ وہ جو ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۵ء تک فنِ مداحی کی خدمات انجام دیتا رہا۔ دوسرا طبقہ وہ جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۰ء تک اس فن سے وابستہ رہا اور تیسرا طبقہ وہ جو آج بھی اس صنفِ سخن کا پرچم بلند کئے ہوئے ہے" [۱]

ڈاکٹر ڈاکٹر حسن فاروقی کے اس نظریئے کا اطلاق ضعفِ سلام پر بھی ہوتا ہے کہ انیس و دبیر کا دور جو ضعفِ سلام کے لئے دورِ عروج قرار پاتا ہے۔ انکے بعد سلام گوئی

---

[۱] دلبستانِ دبیر ڈاکٹر ڈاکٹر حسن فاروقی ص ۲۰۷

کی زد زوال نہیں آیا بلکہ یہ میدان ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا - ان میں ایسے شعراء بھی ملیں گے
جنکی شاعری کا آغاز میر انیس کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا اور یہ انیسویں صدی کے پہلے دہے
تک بقید حیات رہے یعنی یہ شعراء انیسویں صدی کے درمیان ایک سنگ میل کی حیثیت
رکھتے ہیں جیسے اسیر، امیر مینائی اور داغ وغیرہ کچھ شعراء ایسے بھی ملیں گے جو عہد انیس
و دبیر کے بعد کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں - یہ سبھی بیسویں صدی عیسوی چوتھے دہے تک اپنے
فرائض انجام دیتے رہے جن میں علامہ اقبال، مسعود، نجم آفندی، شہید، عثمان
اور حوشی جیسے اساتذہ شامل ہیں - بعد ازاں وہ شعراء ملتے ہیں جو آجتک اس صنف کا
پرچم بلند کئے ہوئے ہیں - نہ صرف اس صنف کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں اور صرف سلام گوئی
کی اس اولیت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ ایسے آزاد نظم کی شکل میں ہیئت کر کے
صنف سلام کے موضوعی صنف ہونے کا ثبوت دیتے ہیں -

سلام کے مضامین میں ہر عہد کی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں لائی گئیں -
کبھی یہ صرف ثنائی مضامین پر مشتمل ہوا کرتا تو کبھی ایسے تبلیغی، اصلاحی اور اخلاقی رنگ
دیا گیا - کبھی غزل کا انداز اپنایا گیا تو کبھی نعتیہ اور منقبتی مضامین ہی کا احاطہ کیا گیا جبکہ
بیسویں صدی کی مرثیہ گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے شمار حسین رضوی لکھتے ہیں کہ

"یہ دور مرثیہ گوئی کا محض تقلیدی اور روایتی ہے
اسوقت مرثیہ لکھنے والے میں جدت اور اپج مفقود ہیں
پچھلوں کے نقش قدم پر چلنا اور اسطرح چلنا کہ پاؤں لغزش نہ کریں

انکی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ دنیا بدل رہی تھی
وقت کروٹ لے رہا تھا مگر یہ آنکھیں موندے لکیر پر چلے
جا رہے تھے۔ مرثیہ کو مقبولیت بھی اب وہ نہ رہی تھی۔ اسلئے
مرثیہ کہنے والوں کی تعداد بھی کم ہونے لگی تھی" [1]

یعنی سفارش حسین رضوی کے کہنے کے مطابق بیسویں صدی کے ابتدائی دور (پہلی چوتھائی)
میں مرثیہ میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ شعراء اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے
رہے۔ چنانچہ مرثیہ اپنے روایتی انداز میں لکھا جانے لگا۔ ساتھ ہی سفارش حسین رضوی
یہ بھی بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی میں مرثیہ کی مقبولیت میں کمی ہونے کی وجہ سے
مرثیہ گو شعراء کی تعداد بھی کم ہونے لگی۔ لیکن ضف سلام کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔
بیسویں صدی عیسوی میں نہ ہی ضف سلام محض روایتی اور تقلیدی رہا۔ بہ اعتبار ہیت
بہ اعتبار موضوع سلام میں تبدیلی آئی۔ موضوع صرف ثنائی نہ رہا بلکہ نعتیہ و منقبتی مضامین
کو دوبارہ ضف سلام میں جگہ دی گئی۔ اور ہیت کے اعتبار سے سلام میں تبدیلی اسطرح آئی
کہ غزل کی ہیت جو دورِ عروج میں سلام کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اس سے ہٹ کر مثنوی
کی ہیت اور آزاد نظم میں بھی سلام لکھے جانے لگے۔ آل رضا نے "سلام آخر" مثنوی کی
ہیت میں لکھا تو احمد فراز نے ضف سلام کے لئے آزاد نظم کا انتخاب کیا۔ یعنی یہ کہنا
بیجا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی ضف مرثیہ کیلئے راس نہ آئی یا ناخوشگوار
ثابت ہوئی لیکن ضف سلام کے لئے خوشگوار۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہر مرثیہ گو شاعر نے

---

[1] اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی — ص ۴۰۵

اہلبیت اطہار کی خدمت میں سلام عقیدت پیش کیا ہے کہیں ایسا نہیں کہ صرف مرثیہ گو شعراء ہی نے صنف سلام پر طبع آزمائی کی ہے۔ اگر یہی حقیقت ہوتی تو شاید بیسویں صدی کا آغاز صنف سلام کہیئے بھی ناخوشگوار ثابت ہوتا، اور صنف مرثیہ کی طرح صنف سلام پر بھی سکوت طاری ہوتا۔ لیکن نہ صرف مرثیہ گو بلکہ تقریباً ہر شاعر نے پیغمبر خدا، اہلبیت اطہار اور بزرگان دین پر تحفۂ درود و سلام پیش کیا ہے۔

ضمیر اختر نقوی "اردو مرثیہ پاکستان میں" مراحی میں سلام نگاری سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مراحی کے مرثیہ نگار شعراء سلام اور قصیدے بھی کہتے ہیں لیکن اسکے علاوہ سکیڑوں شعراء صرف سلام ہی کہتے ہیں اور ایک ایک شاعر نے ہزاروں سلام تصنیف کئے ہیں" [۱]

سلام نگاری کے تعلق سے ضمیر اختر نقوی کا یہ خیال نہ صرف مراحی بلکہ ہر دستانی شعراء پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ ہر دستان میں بھی ایسے شعراء ملتے ہیں جنھوں نے سکیڑوں سلام لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں بھی سلام گو شعراء کی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اسیر امیر مینائی اور داغ کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن سے نعتیہ و منقبتی سلام گوئی کی روایت بیسویں صدی کے شعراء کو ملی لہذا ان شعراء کی سلام گوئی کا تذکرہ ناگزیر حیثیت رکھتا ہے

اسیر: ظفر علی نام اور اسیر تخلص کرتے تھے۔ دلبستان لکھنؤ سے تعلق رکھتے

---

[۱] اردو مرثیہ پاکستان میں — ضمیر اختر نقوی — ص ۲۰۲

اور سلسلۂ مصحفی کے نامور شاعر تھے۔ والد کے نام اور سلسلۂ نسب سے متعلق ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں

"انکے والد کا نام سید مودعلی تھا اور سلسلۂ نسب حضرت عباس علمدار تک پہنچتا ہے" ۱؎

اگرچہ ۱۸۰۰ء میں قصبۂ امیتھی میں پیدا ہوئے لیکن بعد ازآں لکھنؤ آگئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم باقاعدہ اپنے والد اور چچا سے حاصل کی۔ اسطرح علمی قابلیت اور صلاحیت بھی کچھ کم نہ تھی۔ عہدِ نصیرالدین حیدر سے لیکر عہدِ واجد علی شاہ تک اعلیٰ عہدوں پر ~~فائز~~ مامور رہے ابتداءً محکمہ صدر امانت میں بحیثیت امین ملازمت کا آغاز ہوا۔ بعد ازآں عہدِ امجد علیشاہ میں محکمہ عالیہ وزارت میں میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آخر کار عہدِ واجد علیشاہ میں خطاب سے سرفراز ہوئے۔ "تدبیرالدولہ، مدیرالملک، بہادر جنگ" کا خطاب پایا لیکن سلطنت لکھنؤ کے زوال کے بعد واجد علیشاہ کی مصاحبت باقی نہ رہی۔

نواب محمد سعید خاں بہادر والد نواب یوسف علیخاں والئی رامپور جو ان دنوں لکھنؤ میں مقیم تھے اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ بعد کے واقعات ابواللیث صدیقی اسطرح تحریر کرتے ہیں

"جب نواب یوسف علیخاں خود مسند نشین ہوئے تو انہوں نے گھر بیٹھے انکا وظیفہ مقرر کر دیا۔ انکے بعد نواب کلب علیخاں کا دور آیا انہوں نے ازراہ قدردانی لکھنؤ سے بلا کر رامپور میں رکھا" ۲؎

لہذا کچھ عرصہ رامپور اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں گزارا کرتے تھے۔ معاشی فکر و پریشانی سے آزاد

۱، ۲؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی ص ۵۹۵، ۵۹۶

بہت ہی پُر سکون زندگی بسر کرتے تھے۔

امیر کی شعری صلاحیت کا اندازہ درام بابو سکسینہ کی مندرجہ عبارت سے ہوتا ہے

یہ واجد علی شاہ سے متعلق لکھتے ہیں

"بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے" [1]

ساتھ ہی انکی متعدد تصانیف سے بھی انکی شعری صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ

ازیں حضرت عباس علمدار سے سلسلۂ نسب ملنے کے بعد ثنائی شاعری سے دوری کا تو

تصور بھی بعید از قیاس ہوتا۔ اس تعلق سے ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں

"مرثیوں اور سلام کا ایک مجموعہ بھی تھا جسکا ذکر امیر مینائی

نے "تذکرہ کاملانِ رامپور" میں کیا ہے لیکن یہ مجموعہ شاید کسی

ہنگامے میں تلف ہو گیا"۔ [2]

باوجود اسکے ایک سلام دستیاب ہوا۔ امیر علی جونپوری اپنی تصنیف اور سید علی رضوی

حسین پر سلام میں اسی ایک سلام کو پیش کرتے ہیں۔

سلام

حسن حسین ہے ذکر جنابِ امیر کا — جوشن ہے نام پاک صغیر و کبیر کا

قولِ علی حدیثِ پیمبر سے کم نہیں — فرمان بادشاہی ہے ستقہ وزیر کا

آیا نظر جلیلہ کو جلوہ جو طور پر — پرتو تھا ایک خرد درخشاں ضمیر کا

---

[1] ہسٹری آف اردو لٹریچر — درام بابو سکسینہ — ص ۲۶۰

[2] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری — ابواللیث صدیقی — ص ۵۹۷

کیونکر نہو بلند سلیماں سے مرتبہ — دوشِ نبیؐ ہے پایہ علی کے سریر کا

موسیٰ کے ہاتھ میں نہ رہے کسطرح عصا — درباں تھا بابِ علم رسولِ کبیر کا

قبضہ میں اس جناب کے ظاہر شمس ہے — قائل جہاں ہے رجعت مہر منیر کا

لغزش کہاں قدم کو اگر دستگیر ہے — بازو نبی کا ہاتھ خدائے قدیر کا

حاصل تھا بعدِ مرگ سلیماں کا مرتبہ — تابوت خود اٹھا شہ گردوں سریر کا

نامِ علی ہو وردِ زباں وقتِ نزع بھی

ہو خاتمہ بخیر الٰہی اسیر کا

مندرجہ بالا سلام میں بیک وقت نعت و منقبت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ساتھ ہی اسیر کا ایک اور سلام راقمتہ الحروف کو دستیاب ہوا جو مجموعہ سلام میں ملتا ہے۔ یہ مجموعہ قدیم ترین شعراء کے سلام پر مشتمل ہے جو ناقص الاول ہے۔ لہٰذا یہ کہنا دشوار ہے کہ مندرجہ مجموعہ کس نام سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ مختلف شعراء کے سلام اس میں ملتے ہیں چنانچہ مجموعہ سلام کہا گیا۔ یہ کل ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ بوسیدہ کاغذ سے ہی اسکی قدامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مطبع یوسفی سے شائع ہونے والی دوسری کتابوں کے نام اور قیمت ملتی ہے۔ لیکن مرتب کا بھی علم نہیں ہوتا۔

مندرجہ ذیل سلام قبل ازیں پیش کئے گئے سلام سے بالکل مختلف رنگ میں ہے۔

سلام

اے مجرئی سرور نے رکھا سر تہہ خنجر
دکھلا دئیے کیا صبر کے جوہر تہہ خنجر

شہ کہتے تھے کس طرح سے اکبر کو رضا دوں
رکھ دیوے کلیجہ کوئی کیونکر تہہ خنجر

جو کشتہ ہے عالم میں تڑپتا ہے دم قتل
تڑپا نہ مگر سبط پیمبر تہہ خنجر

گو سنگدلی شمر نے کی پیر شہ دیں نے
چھاتی پہ رکھا صبر کا پتھر تہہ خنجر

خنجر کی نہ قاتل کی نہ زخموں کی خبر ہے
تکتے تھے سوئے لاشۂ اصغر تہہ خنجر

تھے امت عاصی کے شفاعت کے جو عقدے
سب کھول گیا سبط پیمبر تہہ خنجر

آتی تھی یہ آواز دم قتل شہ دیں
کر شہ کو نہ اے شمر ستمگر تہہ خنجر

تنہا نہیں ہوتے ہیں حسین ابن علی قتل
ہیں پنجتن پاک بھی خنجر تہہ خنجر

محبوب خدا لیتے تھے جس حلق کے بوسے
افسوس کریں اسکو ستمگر تہہ خنجر

واللہ یہ حوصلۂ ابن علی تھا
قاتل کو دعا دیتے تھے سرور تہہ خنجر

افسوس کہ جو عقد امامت کا ہو سردار
ہوئے وہ تپاں مثل کبوتر تہہ خنجر

زینبؑ نے کہا حیف یہ قسمت میں لکھا تھا
ہو سامنے خواہر کے برادر تہہ خنجر

سنکر خبر قتل پدر کہتے تھے سجاد
ہمکو بھی کریں کاش ستمگر تہہ خنجر

کیا شاہ کو ہوتی تھی طلب آب دم قتل
آتا تھا نظر چشمۂ کوثر تہہ خنجر

کیوں پار ہو امت کا نہ بیڑا کہ شہ دیں
تھے خون کے دریا میں شناور تہہ خنجر

رہ رہ کے دم قتل یہی دھیان تھا شہ کو
دیکھے نہ مجھے زینب مضطر تہہ خنجر

ماتم کرے کیونکر نہ اسیر جگر افگار
مذبوح ہوا سبط پیمبر تہہ خنجر

۱؎ مجموعہ سلام
ص ۸۶، ۸۷

سلام کافی طویل یعنی ستّرہ (۷۰) اشعار پر مبنی ہے لیکن شائد ہی کوئی شعر ایسا ہو جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ سارے سلام میں ثنائی عنصر غالب ہے۔ ساتھ ہی اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں۔ سلام اسقدر مؤثر انداز کا لکھا ہے کہ قاری کی آنکھ نئے اشکوں کا دریا امنڈتا ہے۔

یہ تو حقیقت ہے کہ استاد کی شہرت کا دار و مدار کسی حد تک شاگرد کی شہرت پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ شاگردوں میں امیر مینائی، احمد علی شوق اور ریاض نے کافی شہرت پائی۔ باوجود اسکے ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ

"خود امیر کی شاعری ایک خاص رنگ کی ترجمان ہے" [۱]

اپنے مضمون کی بلندی پر خود امیر بھی ناز کرتے ہیں۔

فکر سے مضمون بلند ایسا ہمارا ہو گیا
عرش اعظم کا یہ موتی گوشوارا ہو گیا

۱۸۸۱ء میں ۸۱ سال کی عمر پا کر لکھنؤ میں انتقال کیا

شاگردوں میں امیر مینائی نے ہی کافی شہرت پائی جسکا اندازہ اسطرح ہو سکتا ہے کہ تاریخ اردو ادب میں انکا دور عہد امیر و داغ کے نام سے موسوم ہے۔ کوئی بھی عہد اگر شاعر کے نام سے موسوم کیا جائے تو اس شاعر کی شہرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے امیر و داغ کا عہد ذوق و غالب کے بعد کا عہد ہے۔ ذوق و غالب کی طرح دونوں بھی کامیاب فن کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دونوں ہی پر گو شاعر ہیں لیکن

---

[۱] ص

رنگ جدا جدا ملتا ہے

امیر مینائی :— امیر احمد مینائی نام اور امیر تخلص کرتے تھے۔ اپنے آپ کو مینائی کہلوانے کا سبب یہ ہے کہ شاہ منیار رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ سے خاندانی تعلقات رکھتے تھے۔ مولوی کرامت محمد کے لڑکے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں ناصر الدین حیدر کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ امیر علی جوشنوری بھی اپنی تصنیف "تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" امیر مینائی کی اسی تاریخ ولادت سے متفق ہیں جو رام بابو سکسینہ نے بتائی ہے لیکن ابو الایث صدیقی کے ہاں تاریخ ولادت یہ نہیں ملتی۔ اس سلسلہ میں وہ "دبدبہ امیری" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ناصر الدین حیدر کے زمانے میں ۱۷ شعبان ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۶ء کو امیر مینائی کی ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم و تربیت والد کی نگرانی میں ہوئی۔ تعلیم کی بعض منزلیں فرنگی محل میں طے ہوئیں اور یہیں سے شعر و شاعری کی ابتدا ہوئی۔" [1]

امیر مینائی کا شمار مفتی صدر اللہ صاحب جیسے مشہور عالم کے شاگردوں میں ہوتا ہے جن سے آپ نے عربی کی بعض کتابیں پڑھیں۔ شاعری میں یہ مظفر علی اسیر کے شاگرد ہوئے۔

اسیر کو واجد علی شاہ کے استاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ لہٰذا ان ہی کی بدولت امیر مینائی کی رسائی دربار میں ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد یہ واجد علی شاہ کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" اسی عہد کی تصانیف ہیں لیکن دور حاضر میں یہ ناپید ہیں۔ شومئی تقدیر کہ دیوان بھی مرتب ہو کر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے باعث شائع نہ ہو سکا اور تلف ہو گیا۔

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابو الایث صدیقی ص ۲۲۵ بحوالہ دبدبہ امیری

۱۸۵۷ء یعنی غدر کے ہنگامے کے بعد دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ اجڑ چکے چنانچہ دہلی اور لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے شعراء نے اپنے اپنے وطن کو خیرباد کیا۔ چنانچہ مٹیا برج کلکتہ، فرخ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، فیض آباد اور حیدرآباد کو آباد کیا۔ مختلف شعراء نے مندرجہ بالا مقامات پر سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی چنانچہ امیر مینائی دربار رامپور سے وابستہ ہو گئے جس سے متعلق امیر علی جونپوری لکھتے ہیں

"لکھنؤ اور دہلی کی تباہی کے بعد یہی ایک ایسا دربار تھا جہاں ہر فن کے کامل موجود تھے جن کا ذکر تذکروں میں کیا گیا ہے" [1]

شعراء کی دربار رامپور سے وابستگی کے تین وجوہات رام بابو سکسینہ اس طرح بیان کرتے ہیں

"ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلے پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعراء کے قدردان تھے اور شعراء کی محنت و جگر کاوی کے بدلے ہمیشہ انکو بیش بہا انعامات و ظائف سے سرفراز کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔" [2]

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو — امیر علی جونپوری — ص ۱۲۴

[2] تاریخ اردو ادب — رام بابو سکسینہ — ص ۳۵۳-۳۵۲

امیر مینائی نے تذکرہ "لعبوان انتخاب یادگار" بھی تصنیف کیا۔ اس سے تاریخ ۱۸۷۳ء نکلتی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد بھی آئے۔ ان دنوں داغ کا قیام بھی حیدرآباد میں تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ داغ کے پاس بھی قیام کیا اور اتفاق سے مختصر سی علالت کے بعد ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

امیر مینائی کی کئی تصانیف ملتی ہیں۔ پہلا دیوان "مراۃ الغیب" کے نام سے شائع ہوا۔ نواب کلب علیخاں کے دربار سے "ملک الشعراء" کا خطاب پایا۔ رامپور میں قیام کے دوران ہی امیر مینائی نے "امیر اللغات" کی تدوین کی جو کچھ اہم کام نہ تھا، کہیں علم ہیں رکن وجوہات کی بنا پر دربار رامپور سے ترک تعلق کرکے امیر لکھنؤ واپس آئے۔

امیر مینائی کی شاعری کو ادوار میں تقسیم کیا جائے تو عہد قیام رامپور ان کی شاعری کا پہلا دور قرار پائے گا اور لکھنؤ واپس آکر امیر مینائی کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسرا دیوان "ضمیمہ خانہ عشق" کے نام سے ملتا ہے۔ دوسرے دیوان میں کلام کا رنگ پہلے دیوان کے مقابلے میں بدلا ہوا ہے جس کی وضاحت خود امیر مینائی اس طرح کرتے ہیں

؎ پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر
دیوان میں اب کا رنگ نہیں ہے کہیں نہیں۔ [1]

کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کرکے دوبارہ رامپور سے طلبی ہونے پر رامپور چلے گئے۔ اسی اثنا میں میر محبوب علیخاں والی حیدرآباد کلکتہ ایڈورڈ روانہ ہوئے۔ بنارس

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابواللیث صدیقی — صفحہ ۶۰۳

میں امیر مینائی کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جسپر انہوں نے امیر مینائی کو ملازمت کیلئے بنارس میں طلب کیا۔

امیر مینائی کی متعدد تصانیف اور رسالوں کے علاوہ کئی مجموعے اور دیوان ملتے ہیں۔

"خاتم النبیین" کے نام سے نعتیہ دیوان ملتا ہے جسکی اشاعت ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء میں عمل میں آئی۔ اردو زبان کے تین مشہور نعت گو شعراء میں محسن کاکوروی اور بہیدم شاہ وارثی کے ساتھ امیر مینائی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس سے متعلق ابواللیث صدیقی تحریر کرتے ہیں کہ

"امیر کو غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن پر بھی قدرت تھی چنانچہ کلام کا ایک نمایاں حصہ نعتیہ اور معرفت و تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے اور اسطرح انیس اور دبیر کے ساتھ ساتھ محسن اور امیر کا نام بھی لکھنؤ کے مصلحین میں ممتاز نظر آتا ہے"[1]

الیاسین کہ مشہور نعت گو شاعر ہونے کی وجہ سے امیر مینائی کے سارے سلام بھی نعتیہ ہی ہوں لکھ مندرجہ بالا ابواللیث صدیقی کے اقتباس کی روشنی میں انکے بارے انیس و دبیر کی طرح ثنائی سلام بھی ملتے ہیں چنانچہ انیس و دبیر کیطرح امیر کا شمار بھی لکھنؤ کے مصلحین میں ہونا بعید از فہم نہیں۔

عہد امیر جسمیں صنف غزل عاشقانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی کلام امیر پر تبصرہ کرتے ہوئے ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی صہ ۲۰۶

"اس دور میں بھی امیر کے کلام میں سب سے نمایاں عنصر حمد، نعت اور منقبت کے مضامین کا ہے"۔ [1]

کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں

؎ سامانِ عفو کیا ہیں کہوں قصہ مختصر — بندہ گناہگار تھا خالق کریم تھا
کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع — جسنے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا
روشن ہیں آفتاب سے اعجاز مصطفیٰ — انگلی اٹھی کہ ماہ فلک پر دو نیم تھا
کب مجھ سے مثل سایہ چھٹے پنجتن کے پاؤں — پانچوں سواروں میں بزیر گلیم تھا

نعتیہ کلام کے مجموعوں سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فن نعت گوئی میں انہیں نہ صرف عبور حاصل تھا بلکہ بے پناہ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ مجموعوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مسدس صبح ازل (۲) مسدس شام ابد (۳) مسدس لیلۃ القدر
(۴) مسدس ذکر شاہ انبیاء (۵) خیابان آفرینش (۶) محامد خاتم النبیین دیوان نعتیہ ذکر شاہ انبیاء وغیرہ

امیر مینائی کی نعت گوئی کا تذکرہ تو تقریباً ہر تصنیف میں ملتا ہے لیکن سلام گوئی کا تذکرہ کسی نے بھی نہیں کیا سوائے رئیس احمد جعفری کے رئیس احمد جعفری نے تصنیف "اقبال اور عشق رسول" میں باب سوم "اردو کے تین نعت گو" میں امیر مینائی کی نعت گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

---

[1] لکھنؤ کا لسانی شاعری — ابو اللیث صدیقی — ص ۶۰۸

پیغمبرِ اسلام کی ولادت باسعادت کے بعد اب سلام پر زبان کھلتی ہے"[1]

سلام بہ ہیئت مسدس

سلام

کر دو خبر یہ محفلِ میلاد شاہ ہے
یاں آمدِ جناب رسالت پناہ ہے
امت چلے رسولؐ کی یہ جلوہ گاہ ہے
سیدھی یہی بہشت میں جانے کی راہ ہے
دربارِ عام گرم ہوا اشتہار دو
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

آتا جو آنے والوں کو پاتے ہیں جبرئیل
خود جا کے در تلک انہیں لاتے ہیں جبرئیل
رتبہ بہ رتبہ سب کو بٹھاتے ہیں جبرئیل
موقع سے کیا صفوں کو جماتے ہیں جبرئیل
دربارِ عام گرم ہوا اشتہار دو
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

لو آمدِ حبیبِ خدائے قدیر ہے
آتا ہے آج وہ جو بشیر و نذیر ہے

---

[1] اقبال اور عشقِ رسولؐ — رئیس احمد جعفری

آتا ہے وہ جو صاحبِ تاج سریر ہے
رونق فزاء ہے خلق کا جو دستگیر ہے

دربارِ عام گرم ہوا اشتہار دو
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

غزل کی ہیئت جو سلام کے دورِ عروج میں صنفِ سلام کیلئے مستقل ہو چکی تھی امیر کا مندرجہ بالا سلام پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی کے آخر سے ہی سلام کی ہیئت بدلنے لگی تھی۔ مسدس کی ہیئت جو عہدِ انیس و دبیر میں مرثیے کیلئے وقف ہو چکی تھی اب اس صدی کے آخر میں سلام بھی مسدس کی ہیئت میں لکھا جانے لگا۔ امیر مینائی نے مسدس کے پانچویں اور چھٹے مصرعے کو سارے سلام میں دہرایا ہے یہ بھی یقیناً ایک جدت ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور سلام کی نشاندہی سید علی رضوی "حسین پر سلام" میں کرتے ہیں۔ پرم شری علی جواد زیدی نے بھی اپنے رسالے العلم مرثیہ و سلام نمبر میں امیر مینائی کے اسی سلام کو مختصراً پیش کیا ہے جو منقبتی رنگ رکھتا ہے۔ کل بارہ اشعار پر مبنی ہے۔

سلام

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے
کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ سے کی دغا
گویا یہود موسیٰ عمراں سے پھر گئے

امت کے سرکشوں نے نہ کی نوح سے وفا
کیا روسیاہ دیو سلیماں سے پھر گئے

کافر ہوئے کہ کعبۂ دیں کو کیا خراب
مرتد ہوئے کہ قبلۂ ایماں سے پھر گئے

مطلق کیا نہ پاس خدا و رسولؐ کا
کیسے فریب بازی شیطاں سے پھر گئے

آئے مدد کیواسطے جن و ملک مگر
انکار پادشاہ غریباں سے پھر گئے

دیندار تھے جو لوگ وہ شہ پر فدا ہوئے
بیدیں جو تھے وہ دینِ سلیماں سے پھر گئے

ثابت قدم جو تھے وہ رہے کربلا میں ساتھ
مست اعتقاد مستئ ایماں سے پھر گئے

اصحاب گو قلیل مخالف کثیر تھے
منہ سب کے لشکرِ شہ ذیشاں سے پھر گئے

ٹھہرے مقابلے پہ نہ اہلِ مباہلہ
بدعہد کیسے قول سے ایماں سے پھر گئے

ٹلتی ہے خاکیائی سے آئی ہوئی بلا
اکثر نکل کے شیر نیستاں سے پھر گئے

آسودہ دل ہو رہ نہ زیارت سے آمیر
سو بار آئے شوق فراواں سے پھر گئے ۔ [1]

داغ بھی امیر مینائی کے عہد سے وابستہ ہیں ۔ باوجودیہ دونوں مختلف دبستانوں سے تعلق رکھتے تھے، اردو ادب میں انکا عہد "عہد امیر و داغ" کے نام سے موسوم ہے ۔ ان سے متعلق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ

"جسطرح داغ دہلی اسکول کے آخری نمائندے ہیں
اسی طرح امیر لکھنوی اسکول کی آخری یادگار ہیں۔" [2]

باوجود اسکے گہرے دوستانہ تعلقات بھی رکھتے ہیں چنانچہ انکے عہد سے ان دونوں دبستانوں کے شعراء میں جو آپسی چشمک پائی جاتی تھی وہ بھی ختم ہو گئی ۔

داغ دہلوی :— نواب مرزا خاں نام اور داغ تخلص کرتے تھے ۔ سنہ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ نواب شمس الدین خاں کے لڑکے تھے ۔ داغ ابھی چار یا پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ تعلیم و تربیت اور پرورش کا مسئلہ تھا ۔ اس مسئلہ کا حل اسطرح سے نکلا کہ انکی ماں نے مرزا احمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر ولیعہد بہادر شاہ، شہنشاہ ہند کیساتھ نکاح کر لیا اور شوکت محل کے خطاب سے سرفراز ہوئیں ۔ ماں

---

[1] حسین بر سلام مرتبہ سید علی رضوی صہ ۱۱۸، ۱۱۹
[2] جلوہ لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی ۶۰۶، ۶۰۷

کے ہمراہ داغ بھی لال قلعہ پہنچے اور وہاں انکی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی داغ بھی فطرتاً رنگین طبیعت کے مالک تھے۔ قلعہ میں شعر و سخن کے چرچے نے داغ کو از حد متاثر کیا۔ چونکہ مرزا فخرو بہادر ذوق سے فخر تلمذ رکھتے تھے لہذا داغ بھی ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ مشاعروں میں بھی اپنے استاد کے ساتھ جاتے اور داد سخن حاصل کرتے۔ کچھ ہی عرصے میں پختہ کار شاعر ہو گئے۔ اس تعلق سے تمکین کاظمی گلزار داغ کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ

"ذوق اپنے ساتھ ہر مشاعرے میں داغ کو لے جاتے تھے اور جن مشاعروں میں شاہ ابوظفر کی غزل جاتی اسے ذوق ہی سناتے اور اور ذوق کی غزل داغ پڑھا کرتے تھے۔ قلعہ میں سوائے شاعری کے اور کوئی کام داغ کو تھا ہی نہیں اسلئے اس دس سالہ مدت میں داغ نے اتنی ترقی کر لی جتنی اور لوگوں نے تیس سال میں بھی نہیں کی تھی" [۱]

داغ کی شاعری کا آغاز گیارہ سال کی عمر یعنی ۱۸۴۱ء سے ہوا اور استاد ذوق کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا۔ ان بارہ سالوں نے داغ نے اپنے استاد کی بے پناہ شعری صلاحیت سے پورا استفادہ کیا۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال اور ایک ہی سال کے بعد غدر کے ہنگامے نے داغ کے ہوش و حواس کھو دیئے۔ لہذا اور شعراء کی طرح یہ بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور اہل خاندان کیساتھ رامپور آئے۔ یہاں نواب یوسف علیخاں بہادر حکمران تھے۔ جنھوں نے داغ کی ممکنہ مدد کی لیکن کوئی مستقل روزگار داغ کو میسر نہوا۔ ۱۸۶۵ء میں نواب

---

[۱] گلزار داغ (دیباچہ) تمکین کاظمی ص ۳

یوسف علیخاں کا انتقال ہوا۔ اکیسال بعد نواب کلب علیخاں بھادر والئی رامپور نے داغ کو اپنا مصاحب مقرر کیا اور مرزا داغ کی خدمت انکے سپرد کی گئی یہی وجہ ہے کہ شہسواری سے بھی ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ۱۸۵۵ء تا ۱۸۸۷ء یعنی ۳۲ سال کے طویل عرصے تک داغ کا قیام رامپور ہی میں رہا۔ قیام رامپور سے متعلق اکثر تذکرہ نگاروں کا یہی خیال ہے کہ داغ کو رامپور میں بہت ہی آرام ملا۔ لہذا وہ اسے آرامپور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قیام رامپور کے عرصے میں داغ نے نواب کلب علیخاں بھادر کے ہمراہ مختلف مقامات کا سفر بھی کیا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کی اور یہیں پر زیادہ شہرت ملی

مرزا بالو سکسینہ لکھتے ہیں کہ

"نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے"۔ [1]

لیکن ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علیخاں کی موت نے داغ کا آرام و سکون اور چین سب کچھ چھین لیا۔ حسرت و یاس کے عالم میں رامپور سے ترک تعلق کیا اور دہلی روانہ ہوئے ابتدا میں غدر کے ہنگامے کے بعد جب دہلی سے رامپور چلے گئے تھے امیر اور منیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنا وطن چھوڑ کر رامپور آئے تھے۔ داغ کے ان تمام سے شعری معرکے بھی ہوئے۔ جسکے متعلق تمکین کاظمی تحریر کرتے ہیں

"امیر تو داغ کے مقابلے میں کیا آسکتے تھے۔ انکے استاد سکیر نے ابھی ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا مگر داغ کو پیچھا نہ دکھا سکے۔ اس

---

[1] تاریخ اردو ادب۔ مرزا بالو سکسینہ۔ ص ۳۶۷۔

طرح جلال و منیر بھی داغ کے آگے اپنا چراغ نہ جلا سکے" [1]

مجموعہ عرصہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچے۔ حضور نظام سے پہلی بار ملاقات ہوئی کہیں کوئی مثبت نتائج برآمد نہ ہوئے لہذا یہ واپس دہلی چلے گئے۔ ۱۸۹۱ء میں میر محبوب علیخاں والی دکن کی طلبی پر دوبارہ حیدرآباد آئے مستقل قیام کا اشارہ چیمکا اور محبوب علیخاں والی دکن کے استاد مقرر ہوئے تنخواہ کے علاوہ انعام و اکرام بھی عطا کیا گیا اور ساتھ ہی "فقرب سلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کے معزز خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ ظاہر ہے کہ خوشحالی و فارغ البالی سے گزارتے لگے۔ تقریباً اٹھارہ سال حیدرآباد میں قیام رہا۔ معزز طبقے میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ شاگردوں کی تعداد بھی کافی بڑھنے لگی شاگردوں میں صرف علامہ اقبال کا نام ہی لیا جائے تو ان کے استاد کامل ہونے کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں داغ کے کئی شاگرد جھوڑے ہیں۔ داغ کا انتقال ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں ہی ہوا۔

ذخیرہ کلام میں چار دیوان کے علاوہ ایک مثنوی "فریاد داغ" قطعات اور رباعیات ملتے ہیں۔ داغ کی رثائی شاعری کی تاریخ سے متعلق امیر علی جوشنیوری "تذکرہ مرثیہ نگاران اردو" میں تحریر کرتے ہیں

"دہلی کی مرثیہ نگاری کا آخری دور داغ کا زمانہ ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شعراء دلی چھوڑ کر جا چکے تھے" [2]

---

[1] گلزار داغ (دیباچہ) تسکین کاظمی ص ۳

[2] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو حصہ اول امیر علی جوشنیوری ص ۲۲۰

امیر علی جونپوری داغ کی مرثائی شاعری کے نمونہ کلام میں چند اشعار پیش کرتے ہیں جسے وہ مرثیہ کے بتاتے ہیں لیکن دراصل وہ سلام کے اشعار ہیں۔ اسی کہ سلام کو سید علی رضوی "حسین پر سلام" اور پدم شری علی جواد زیدی رسالہ "العلم" مرثیہ و سلام نمبر میں پیش کرتے ہیں۔ کل گیارہ اشعار پر مبنی سلام ہے۔ لفظ "عجز" سے سلام کا آغاز ہوتا ہے

سلام

عجز کو جو تھے زیر آسماں بیٹھے ہوئے
بھوکے پیاسے بیکسوں بے خانماں بیٹھے ہوئے

شورِ ماتم سنکے اہلبیت کا سب اہلِ شام
شادیاں کرتے تھے گھر میں شادماں بیٹھے ہوئے

وا دریغا دستِ عابد میں تو ہو اُن کی مہار
اور اونٹوں پر چلیں یکسو ساربان بیٹھے ہوئے

امتِ عاصی کے حق میں شاہ نے مانگی دعا
جانبِ قبلہ زمیں پر نیم جاں بیٹھے ہوئے

کوفیوں نے خود بلا کر یہ ستم برپا کیا
اپنے گھر تھے چین سے شاہِ زماں بیٹھے ہوئے

حق پر خنجر چلا سبطِ رسول اللہ ﷺ کے
کھائی میں عابد نے غم کی برچھیاں بیٹھے ہوئے

بیٹھے بیٹھے ثبت تھیں پر ہی پڑھی تھی نے نماز
زخم کاری تھے بہت تا استخواں بیٹھے ہوئے

کہہ رہے تھے العطش جو وقت سب اہلِ حرم
سب کی سنتے تھے شہ کون و مکاں بیٹھے ہوئے

حضرتِ عابد کو بھی تھا زندگی میں اتنا لحاظ
ہم سے غافل ہوں نہ دریا پر یہاں بیٹھے ہوئے

شاہ کے ماتم میں روئے میں بہت حور و ملک
دیکھنا جنت میں بھی ہونگے مکاں بیٹھے ہوئے

حج و زیارت تو ہے اب کربلا کو بھی چلو
داغ موت ہوگئی تمکو یہاں بیٹھے ہوئے [1]

---

[1] "العلم" مرثیہ و سلام نمبر مدیر پدم شری علی جواد زیدی ص ۱۴۵

سلام خالص رثائی ہے اور لفظ "مجبرا" سے اسکا آغاز ہو رہا ہے۔ پیش نظر مقالے کے دوسرے باب میں یعنی "سلام کی زمرہ بندی" کے تحت راقمۃ الحروف نے دستیاب شدہ سلاموں کی وضاحت کی ہے کہ ایسے سلام بھی ملے جنکا آغاز لفظ "مجبرا" سے ہوتا ہے۔ لہذا یہاں لفظ "مجبرا" سے متعلق تھوڑی سی وضاحت کرنا بیجا نہ ہوگا تاکہ ضنف سلام کا تقدس برقرار رہے۔

متقدمین نے رثائی ادب میں جو زمرہ بندی کی تھی اسمیں سوز، واویلا اور ماتم تحتی اصناف تھیں جنکا ذکر راقمۃ الحروف نے اپنے ایم۔فل کے مقالے "حیدرآباد میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد" میں "مرثیہ کی ذیلی شکلوں" کے عنوان سے کیا ہے۔ سلام کے سیاق "مجبرا" کی تحتی ضنف بھی سلام کے موضوعات سے متعلق بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ سلام صرف واقعات کربلا میں مستعمل نہیں ہوتا بلکہ سرکار دوعالم کی خدمت میں بھی سلام پیش کیا جاتا ہے اور کچھ بزرگان دین کے لئے بھی لیکن "مجبرا" مخصوص تھا کربلا کیلئے۔ سلام کیلئے یہ ضروری نہیں تھا کہ اسمیں لفظ سلام استعمال کیا گیا ہو لیکن "مجبرا" کیلئے مجبری یا مجبرا کا لفظ ناگزیر حیثیت رکھتا تھا لیکن بعد ازاں لفظ "مجبرا" کی حرمت برقرار نہ رہی اور یہ لفظ دربار و درگاہ سے نکلکر بالاخانے تک پہنچ گیا تو کچھ بزرگوں نے اسے ترک کرتے اس تحتی ضنف کو سلام میں ضم کر دیا لیکن باوجود اس کے دور حاضر میں بھی حیدرآباد کی مجالس میں مندرجہ ذیل مجبرا مقبول ہے۔

؎ کہتی تھی یہی زینب دکھیا میرے مبرن دا مجبرا لو میرا
یہ مجمع بابا تم پہ فدا میرے مبرن دا مجبرا لو میرا

مندرجہ مجبرے سے لفظ "مجبرا" کی بے حرمتی کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مجبور و بے بس

بہن کا اپنے بھائی کیلئے "مہر" لفظ مہر کی حرمت اور تقدس کو دوبالا کر دیتا ہے۔

انیسؔ، امیرؔ اور داغؔ یہ ایسے شعراء ہیں جنھوں نے غدر کے ہنگامے اور اسکی تباہیاں دیکھی تھیں۔ اس ہنگامے سے شعر و ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دلبستانِ دہلی اور دلبستانِ لکھنؤ کا خاتمہ ہو چکا۔ عموماً مسلمان اور بالخصوص شعراء مایوسی اور نا امیدی کے بحرِ بیکراں میں غرق ہو چکے لیکن شاعر چونکہ ساری قوم کیلئے حساس دل رکھتا ہے لہذا وہ بھی اس جنگ میں اپنے قلم جیسے ہتھیار سے لیس ہو کر کود پڑا۔ ان حالات میں واقعہ کربلا نے شعراء کی ہمت افزائی کی۔ امام حسینؑ اور انکے اصحاب و انصار کے کارنامے مشعلِ راہ بنے۔ انکا سہارا لیکر شعراء نے بالکل ہی نکمی، ہاری ہوئی مردہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

دورِ حاضر کے ان شعراء میں اقبالؔ، جوشؔ، جمیلؔ مظہری، نجمؔ آفندی، احسانؔ دانشؔ، آلِ رضا اور ماہرؔ القادری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نعت ہو یا منقبت یا فلسفہ شہادت امام حسین علیہ السلام، اقبالؔ کا نظریہ دوسرے شعراء سے مختلف ہے اگرچہ نعت و منقبت سے متعلق دوسرے شعراء کے خیالات میں بھی بلندی، اندازِ کلام میں زور، لفظ پر اقتدار اور خلوصِ عقیدت سب کچھ موجود ہے لیکن باوجود اسکے علامہ اقبال کی بات ہی کچھ اور ہے۔

انیسؔ احمد جعفری اقبال اور عشقِ رسولؐ میں دوسرے شعراء سے علامہ اقبالؔ کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان شاعروں کے پاس لفظ و معنی کا طلسم تھا۔ جذبات کا تموج تھا
خیالات کی بلندی تھی۔ احساسات کی رفعت تھی۔ اسلوب بیان کی
جدت تھی۔ انداز کلام کی ندرت تھی۔ الفاظ پر حاکمانہ اقتدار تھا۔ پیرائیہ
بیان پر ملوکانہ فرمانروائی تھی۔ انکے پاس خلوص بھی تھا محبت بھی تھی
ذات رسالتمآب سے والہانہ عشق بھی تھا لیکن مجھے معاف کیا جائے
اگر میں یہ عرض کروں کہ ان سب میں مگر بھی وہ بات نہ تھی جو اقبال میں تھی" [1]

؎ عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

دوسرے شعراء نے جو نعت و منقبت پیش کی ہیں وہ بے پناہ خلوص و عقیدت اور وابستگی
کے تحت اور رسالتمآب سے ثواب دارین حاصل کرنے اور اپنی آخرت کو سنوارنے کی خاطر
کی ہے لیکن علامہ اقبال نے صرف ان مقاصد کی خاطر ہی نعت و منقبت کا تحفہ پیش نہیں
کیا بلکہ ان مقاصد کے ساتھ ہی وہ سیرت رسولؐ کو پیش کرکے وہ مسلمانوں کو دعوت
عمل دیتے ہیں کیونکہ اقبال کا پیغام عمل ہے۔ انکا نظریہ یہ ہے کہ

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

کیونکہ علامہ اقبال نے چشم ظاہر سے سرکار رسالتمآب کی سیرت، کردار اور اسوۂ
حسنہ پر نظر نہیں ڈالی تھی بلکہ چشم بینا سے انہوں نے یہ جلوے دیکھے تھے۔ لہذا۔
یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو بھی بیدار کریں چنانچہ کہتے ہیں

---

[1] اقبال اور عشق رسولؐ از رئیس احمد جعفری (اردو) صفحہ ۱۸۷

جنہیں باطل پہ عیاں جوہرِ ایماں کر دے
دے کے ذروں کو جلا مہرِ درخشاں کر دے

سرکارِ رسالتمآب کا طرح وہ مسلمانوں کو بھی پاک و پاکیزہ، حق و صداقت پر مبنی با اوصاف اور با اخلاق زندگی گزارنے کا پیغام دیتے ہیں۔ نعت گوئی سے متعلق رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں،

"سرکارِ رسالت مآب کے اسوۂ حسنہ علامہ اقبال کے ذہن پر اس طرح چھائے یہ سب کچھ دیکھکر اقبال اقبال بن گیا۔ اسکی زبان سے جو نکلا وہ نغمہ بن گیا۔ اسنے اپنے رسول کی مدح میں جو زبان کھولی تو سب سے بازی لے گیا۔ اسلئے کہ دوسروں نے ذاتِ رسالتمآب کا جلوہ اتنے زاویوں اور پہلوؤں سے نہیں دیکھا جتنے زاویوں اور پہلوؤں سے اقبال نے دیکھا" [1]

نظم ذوق و شوق اقبال کا اندازہ یکھو اسطرح ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب (ذوق و شوق)

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی تصنیف "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" میں رقمطراز ہیں

---

[1] اقبال اور عشقِ رسول از رئیس احمد جعفری ص ۱۹۱

"شہادت حسینؑ کی نئی معنوی جہت اور طرف سب سے پہلے اقبال کی نظر گئی اور اسکا پہلا تخلیقی اظہار اقبال کے فارسی کلام میں ملتا ہے۔ اقبال کی اردو شاعری کی مثالیں بہت بعد کی ہیں۔ بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ رموز بیخودی اس سے ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آچکی تھی۔ اس میں "در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" کے عنوان سے جو اشعار ہیں یقیناً انکو اس نئے معنیاتی رجحان کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے" [1]

پیش نظر مقالہ چونکہ اردو زبان سے متعلق ہے لہذا اسمیں فارسی اشعار بطور نمونہ پیش کرنا بے محل ثابت ہوگا۔ اسی لئے بال جبریل کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جس سے انکے انداز فکر پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ فلسفۂ عشق بیان کرتے ہوئے محمدؐ کے دل کو عشق کا نقطۂ اول قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی ذات کی روشنی میں زندگی کے درجات کا تعین کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں عشق کا تصور حقیقت پر مبنی ہے۔ راہ عشق میں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کے کردار کو جانثار نا گزیر حیثیت رکھتا ہے۔ عشق حقیقی کا بیان اسوقت تک مکمل ہو نہیں سکتا جب تک کہ فہرست میں حیدر کرارؑ، امام حسینؑ اور مادر حسینؑ کے نام نہ شامل ہوں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اسکی حسینؑ، ابتدا ہے اسمٰعیل

---

[1] سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ — از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۳۰

جمالِ عشق و مستی بے نوازی

جلالِ عشق و مستی بے نیازی

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر

زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی !

عشق سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق (ذوق و شوق)

استادِ محترم ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی اپنی تصنیف "جہانِ افکار" میں رقم طراز ہیں

"شاعرِ اقبال کا یہ پورا نظامِ فکر اور نظریہ یک رخا ہوتا ہے نامکمل ہوتا اگر وہ عورت کیلئے کسی ذات سے صفات کا استخراج نہ کرتے۔ اقبال نے یہ گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا کے اسوۂ کاملہ کو عورت کے سامنے پیش کیا۔ بتول مزرعِ تسلیم کا حاصل ہیں۔ خاور مرکزِ پرکارِ عشق ہیں۔ فرزندوں کی سیرت ماں سے ہوتی ہے۔ بیٹوں کو دیکھو، شوہر کو دیکھو، صدق و صفا کو دیکھو، اس دل کو دیکھو جو محتاج کے سوال پر اس حد تک گداز ہو جاتا ہے کہ چادرِ یہودی کے یہاں فروخت کر کے سوال پورا کیا جاتا ہے۔ جس کے آنسوؤں

کے چراغ جا نماز پر جلتے ہیں۔" [۱]

؎ مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ

مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

دورِ حاضر میں بھی اقبال جب ان لائق تقلید کرداروں کی کمی کو محسوس کرتے ہیں تو بے انتہا درد سے لبریز آہیں دل سے نکلتی ہیں۔ بڑے مایوس ہو کر کہتے ہیں

؎ قافلۂ حجاز میں اک حسینؓ بھی نہیں

اور کبھی کہتے ہیں ؎ گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

؎ اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرارؓ بھی نہیں

علامہ اقبال کے احساسات کو ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں

"آج کے انسان کو ضرورت ہے کہ آئینہ ذات میں رنگ صفات تلاش کرے۔ ان نقوش قدسیہ کے اسوۂ کاملہ کو اپنائے جن سے راہِ حیات کی شب تاریک روشن و تابناک ہے اس میراث اور اسی سرمایۂ کا وارث ہے۔" [۲]

؎ اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری (فقر)

---

[۱] جہانِ افکار ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی ص ۱۱۲

[۲] جہانِ افکار ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی ص ۱۱۳

علامہ اقبال کے ہاں "سجدے" کا تصور کچھ اس طرح ملتا ہے ایسے سجدے جو
پیکر نوری کے سجدوں کو بھی مات کر دیتے ہیں۔

؎ وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی ہے
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

ایک اور سجدے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں

؎ بوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذاں میں تیری رادِ سحر ہیں

سجدے کی حقیقت اسطرح بیان کرتے ہیں کہ سجدہ صرف سر جھکانے ہی کا نام نہیں بلکہ
اس میں تصور بھی ہو اور عمل بھی ہو تب ہی وہ سجدہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ایسا
سجدہ جس سے فرشتے بھی دم بخود رہ جائیں۔ ایسا سجدہ کہ جب کسی ایک کے آگے سر
جھکے تو وہ تا قیام قیامت کسی اور کے آگے جھکنے نہ پائے۔ ایسا سجدہ جس سے سر
اٹھے اس کبد لوک نیزہ پیر اٹھایا جائے اور اٹھانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سر بلند ہو جائے

؎ وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجدید حرام

یہ سجدے کوئی اور سجدے نہیں بلکہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور علامہ اقبال
ایسے ہی سجدے کے دل سے قائل ہیں جو مکمل اطاعت الٰہی کا تصور رکھتے ہوں
امامت کے تعلق سے لکھتے ہیں

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

امام ذی وقار کی حقیقت اسطرح سارے زمانے پر آشکار کرتے ہیں۔

؎ یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اور کہتے ہیں کہ

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

اقبال چاہتے ہیں کہ قوم میں ویسا ہی جذبۂ ایثار و قربانی پیدا ہو جو امام حسین علیہ السلام کے اصحاب و انصار میں تھا چنانچہ دعائیہ انداز میں کہتے ہیں کہ

خلافت کی بنا دنیا میں پھر ہو استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

دور حاضر کے علماء کو نصیحت کرتے ہیں کیونکہ قوم کی ترقی و بیداری اور شعور کیلئے علماء بھی ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ مردہ قوم میں جان ڈالنے کے لئے اور اسمیں احساس پیدا کرنے ذمہ داری علماء پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لہذا اقبال انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ وہ حضرت امام حسین کے اسوۂ حسنہ پر نظر ڈالیں۔

؎ نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ دین و سیاست دونوں آپس میں جدا نہیں ہونا چاہیے لہذا لکھتے ہیں۔

؎ جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ شہید کربلا امام حسین علیہ السلام نے امت محمدی کو یہ پیغام دیا ہے

؎ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

لہذا ہر مومن کو چاہیے کہ وہ اسوۂ شبیرؑ کی پیروی کرتا ہوا مال غنیمت اور سلطنت کا طلبگار نہ ہو بلکہ راہ حق میں اپنا سر کٹانا پسند کرے۔

علامہ اقبال کے تصور فقر و خودی، تصور عشق اور تصور سجدہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شہدائے کربلا کے عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں تب ہی تو وہ قوم کو اسوۂ شبیری اور اسوۂ کاملہ کی تقلید کا پیغام دیتے ہیں۔ اگرچہ کہ علامہ اقبال کے ہاں باقاعدہ طور پر سلام تو نہیں ملتے لیکن انکے مندرجہ بالا تمام اشعار ہی سلام سے کچھ کم نہیں۔ کیونکہ سلام میں بھی شاعر شہدائے کربلا، رسالتمآب اور بزرگان دین کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کر کے انکی خدمت میں سلام عقیدت بھیجتا ہے اور اقبال کے اشعار کو پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی در اہلبیت سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ واضح الفاظ میں سلام نہیں بھیجتے لیکن سارے زمانے کو رسالتمآب اور شہدائے کربلا کی تقلید کا پیغام دیتے ہیں نہ صرف انکی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں بلکہ انکے کرداروں کی عظمت کو پیش کرتے ہوئے ساری قوم کے آگے ان کی نظیر پیش کرتے ہیں۔ ان تمام کرداروں کی عظمت کو پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال ساری قوم کو دعوت عمل دیتے ہیں۔ لہذا یہ اشعار خود ہی سلام سے کم نہیں

کہیں ایک مرتبہ خود ہی کہتے ہیں

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق

دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

یعنی دل صبح و تا شام برابر صلوٰۃ اور درود بھیجتا رہتا ہے کیونکہ وہ سطحی طور پر ان کرداروں کا جائزہ نہیں لیتے بلکہ اسکے لئے اپنی چشم بینا کا استعمال کرتے ہیں۔

قومی شاعر ہونے کی بنا پر قوم سے متعلق روح محمدؐ سے استفسار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اے روح محمدؐ

شیرازہ ہو ملت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے

ہر جنید ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیابان سے حدی خوان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ — آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

بیشک علامہ اقبال کا انداز اردو شاعری میں ایک اجتہاد سے کسی طرح کم نہیں جسے سے کہ ایک مایوس اور ہر انسان قوم میں بیداری، بین الاقوامی اتحاد، تحریک خلافت اور آزادی وطن کی سعی مسلسل کا آغاز ہوا جسنے کہ مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے اور عزم حسینی کو شعل راہ بنانے کا پیغام دیا۔

خریدیں نہ ہم جسکو اپنے لہو سے

مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

علامہ اقبال سے متعلق ڈاکٹر وحید اختر اپنے انشائیے "جدید مرثیے کے محرکات و اسالیب" میں رقم طراز ہیں کہ

"جینیس (GENIUS) ہر زبان میں ایک مظہر PHENOMENON ہی ہوتا ہے جیسے اقبال جو اپنے ماضی قریب اور حال کے شعراء کے درمیان سب سے الگ ایک شعری معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب کے یہ معجزے منفرد ہوتے ہیں۔ ان میں تسلسل نہیں ہوتا البتہ انکا اثر جاری رہتا ہے۔" [1]

ڈاکٹر وحید اختر کا یہ خیال صد فی صد حقیقت پر مبنی ہے کہ ادب کے معجزے منفرد ہوتے ہیں اور ان میں تسلسل باقی نہیں رہتا۔ لہذا اسی دور میں حیدرآباد میں ہمیں ایسے شاعر بھی ملتے ہیں جنھوں نے سلام گوئی کے لئے طرز جدید کو نہیں اپنایا بلکہ روایتی انداز ہی میں صنف سلام پر طبع آزمائی کی اور ایک کثیر تعداد میں سلام لکھے۔ ان شعراء میں مسرور، شہید یار جنگ شہید، والئی دکن نواب میر عثمان علیخاں عثمان کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسرور:- میر محمد علی نام اور مسرور تخلص کرتے تھے۔ مسرور کا شمار حیدرآباد کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنکی شاعری کا بیشتر حصہ آزادی سے قبل کا ہے۔ مسرور ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی میر جعفر حسین مقبول تھا۔ وہ محکمہ دار الانشاء میں مددگار ناظم تھے۔ مسرور عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ حدیث و فقہ و منطق کی بھی تعلیم حاصل کی۔ جوڈیشل Judicial کا امتحان پاس کرکے

---

[1] مضمون "جدید مرثیے کے محرکات و اسالیب" از ڈاکٹر وحید اختر۔ رسالہ العلم مرثیہ و سلام نمبر ص ۵۱

کچھ دنوں وکالت کرتے رہے لیکن بعد میں بہرام الدولہ کے اسٹیٹ میں منصفی کی خدمت پر فائز ہوئے۔

مسرور کی شاعری کا آغاز چودہ سال کی عمر سے ہوتا ہے جس وہ حضرت ناجی سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا اوسلام سے کی اور بعد میں غزلیں، قصیدے، نوحے اور مرثیے پر بھی طبع آزمائی کرنے لگے لیکن آخر میں صرف نوحے اور مرثیے ہی کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا۔ انکے نوحے بے شمار میں اور دستیاب ہیں اور زیور طبع سے بھی آراستہ ہیں لیکن مراثی و سلام زیور طبع سے آراستہ نہیں اگرچہ رہیہ بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں یہی وجہ ہیکہ عام طور پر لوگ انہیں مرثیہ و سلام گو شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف نوحہ گو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

راقمۃ الحروف کو مسرور کے سلاموں کی دو بیاضیں دستیاب ہوئیں جن میں بیاض نمبر تین میں کل چالیس اور بیاض نمبر چھ میں کل پندرہ سلام ملتے ہیں۔

مسرور کا غیر مطبوعہ کلام جس میں (۲۰) بیس مراثی اور بے شمار سلام و قصائد، رباعیات و قطعات اور غزلیات کا ذخیرہ انکے شاگرد باقر امانت خوانی کے فرزند حسن امانت خوانی کے ہاں بطور امانت محفوظ ہیں۔

مسرور کا شمار شاگردان ناجی میں ہوتا ہے۔ یہ معاصرین انیس میں حیدرآباد کے سربرآوردہ شعراء میں خاص مقام رکھتے تھے۔ مسرور نے بھی اردو کے مرثائی ادب میں اپنے نوحہ و سلام سے اپنے لئے منفرد جگہ بنائی۔

مسدور کے سلام مختصر بھی ہیں، اور کافی طویل بھی۔ چھتیس اشعار پر مبنی بھی سلام بھی ملتے ہیں۔ سلام گوئی کے روایتی انداز میں بھی ایک نیا انداز انہوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ سلام مسلسل بھی لکھے ہیں جس میں واقعات کا تسلسل ملتا ہے۔

بیاض نمبر (۳) کا سلام ملاحظہ ہو۔

مسجد میں قتل تیغ سے مشکل کشا ہوا
گھر میں خدا کے محشر تازہ بپا ہوا

مندرجہ سلام (۳۷) اشعار پر مبنی ہے۔ مطلع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت علی ابن ابی طالب کی شہادت پر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں نہ صرف امیر المومنین کی شہادت کے واقعات ملتے ہیں بلکہ امام حسن اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت تک کے واقعات کو تسلسل کیساتھ پیش کیا ہے جس میں یقینی طور پر دیگر شہدائے کربلا کے واقعاتِ شہادت بھی ملتے ہیں۔ سلام خالص رثائی انداز رکھتا ہے لہذا کافی پر سوز اور پُر اثر ہے۔ علاوہ ازیں اس کلام میں سلاست و بلاغت پائی جاتی ہے۔ مسدور ذکرِ غم سرور کو درس ایثار و وفا قرار دیتے ہیں۔ نہ صرف امام حسین علیہ السلام بلکہ کربلا کے ہر شہید میں اس جذبے کی موجودگی کی وضاحت کرتے ہیں جس میں شش ماہا بھی شامل ہے۔ لکھتے ہیں

سلام

درس ایثار و وفا ذکرِ غمِ سرور میں ہے　　قوت تنظیم قومی مدح کے دفتر میں ہے

کچھ اثر غصہ کا جو عباس کے تیور میں ہے — صف بہ صف گرتی ہے بھاگڑ شام کے لشکر میں ہے

ہچکیاں بن بن کے آتی ہیں دعائیں مرتے دم — شوکتِ اسلام کی حسرت دلِ اصغر میں ہے

صدقۂ گوشِ سکینہ نے دکھایا ہے اثر — دیکھنا سوراخِ غم اب تک دلِ گوہر میں ہے

جان دیکر کھولتے ہیں دین کی راہیں حسینؑ — شمر ہے بالیں پہ اور سر سجدۂ داور میں ہے

چھینتے ہو فرقِ زینب سے تو کیا ہاتھ آئیگا — ظالمو پیوند پر پیوند اس چادر میں ہے

آپکی حالت ہے اور مسرور کی آنکھیں حسین — کیا کہوں کیسی تڑپ ہے جو دلِ مضطر میں ہے

بے بنیاد باتوں سے مسرور کو سخت نفرت ہے وہ ایسے واقعات کو بیان کرتے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہوں جبتک کسی بھی واقعہ کی اصلیت سے واقف نہیں ہوتے اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں۔ روایات کو بھی وہ جوں کا توں پیش نہیں کرتے بلکہ اسکی تحقیق کے بعد ہی اسے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ "بین" کھلے الفاظ میں ادا نہیں کرتے بلکہ اشارتاً و کنایتاً ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ بین امامِ وقت یا خانوادۂ رسولؐ کی شان سے بعید ہیں، لیکن اسکے لئے بھی جو اشارے اور کنایہ کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی سخت سے سخت دل کو پگھلا دیتے ہیں۔ سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

حسنِ یوسف پر ہم احسانِ نظر رکھتے نہیں — حسنِ اکبر کا نہ سودا ہو وہ سر رکھتے نہیں۔

محوئے روئے آل میں خود بیں نظر رکھتے نہیں — کیا خبر دنیا کی ہم اپنی خبر رکھتے ہیں

خاتمہ کی جنگ ہے اک تیغ ہے بس اور حسین
مرنے والے ذوقِ احساس سپر رکھتے نہیں

صبر کے مالک ہیں حضرت پھر بھی اکبر کی ہے موت
کیا حسین انسان کا دل اور جگر رکھتے نہیں

ہے یہی مسرور دنیا اسکی یا مالی نہ پوچھ
جو زباں و قلب و طینت حیلہ گر رکھتے نہیں

مندرجہ سلام کل تیس ۳۰ اشعار پر مبنی ہے جسکا ہر شعر تاثر بھرپور رکھتا ہے

بالخصوص مندرجہ شعر

صبر کے مالک ہیں حضرت پھر بھی اکبر کی ہے موت
کیا حسینؑ انسان کا دل اور جگر رکھتے نہیں

اس شعر میں مسرور حضرت علی اکبر کی شہادت پر حضرت امام حسینؑ کی زبانی بحیثیت باپ بین نہیں پیش کرتے بلکہ مندرجہ بالا شعر سے ساری انسانیت کو نادم کر دیتے ہیں۔ ہر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جسکا جواب اسکا ذہن نہیں دے پاتا بلکہ آنکھیں چھلک جاتی ہیں اور یہی اسکا جواب ہے۔ مسرور اپنے اس خاص اسلوب کے آپ ہی مالک ہیں۔

مسرور نے مولسؔ اور انیسؔ کے سلام پر تضمین بھی لکھی ہے جسکا مشہور سلام

؎ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

کی تضمین اس طرح کرتے ہیں

؎ خلافِ عقل نہ سوجھا کبھی ذہینوں کو
نہ دیکھا پاؤں پہ ہرگز جبیں کی چینوں کو

کیا نہ لپیٹ لہی نے فلک نشینوں کو
سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اکثر اشعار میں استفہامیہ انداز ملتا ہے جیسے

کسطرح تیر ستمگار نے جوڑا ہوگا
سینے معصوم پہ لیا پیار نہ آیا ہوگا

مسدس کی دونوں بیاضوں میں تقریباً (۵۸) سلام ملتے ہیں کہیں کسی میں بھی لفظ سلام، سلامی، سلاما اور سلامی کا ذکر نہیں ملتا۔

مسدس کا اشتعال ۱۳۵۵ھ میں ہوا

میر مہدی علی شہید یا رجنگ شہید — میر مہدی علی نام

شہید یار جنگ خطاب اور شہید تخلص کرتے تھے۔ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے شہید کے جدِ اعلیٰ سید زین العابدین ہمدم طباطبائی مہاراجہ جیند ولال شاداں کے عہد میں شیراز سے حیدرآباد آئے تھے۔ مہاراجہ کو انکی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہید کو ذوقِ شاعری ورثہ میں ملا تھا۔ جگر آغا نوحہ اور سلام سے ہوا۔ پیارے صاحب رشید کو شہید نے اپنا استادِ سخن تسلیم کیا اور اصلاح لینے لگے۔ بعد ازاں نظم طباطبائی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ مرثیہ، رباعی اور غزل میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے لیکن مجموعہ عرصہ بعد صنف غزل سے ترکِ تعلق کیا اور مرثیائی شاعری کا سلسلہ برقرار رہا۔ رباعیات کا مجموعہ "تسبیح خیال" کے نام سے شائع ہوا اور ان کے سلام صد سلام (حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم) کے نام سے شائع ہوئے۔ علاوہ ازاں شہید کے منتخب سلام "وادی السلام" کے نام سے پاکستان سے شائع ہوئے ہیں جس میں شہید کی سلام گوئی سے متعلق سعادت علی رضوی، سید ہاشم رضا اور نصیر ترابی نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

صد سلام کی یہ تینوں جلدوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہید نے اپنی زندگی کو سلام گوئی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ سلام بھی ایسے جو دل کی گہرائی تک پہنچ جائیں جسکے ہر شعر سے خلوص و عقیدت جھلک رہی ہو۔ سلام گوئی میں درد اور تاثر سے متعلق شاعرِ اہلبیت علامہ نجم آفندی منتخب سلام کے مجموعے (وادی السلام)

میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"شہید السیاسی سننے سنانے والا انسان جب سلام کہتا ہے تو

یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ درد والم کے حدود سے کبھی باہر آیا ہی نہ ہوگا" [1]

صرف درد والم ہی نہیں بلکہ شاعرانہ خوبیاں بھی شہید کے سلام میں ملتی ہیں۔ سلام میں غزل کا رنگ بھی موجود ہے اگرچہ انہوں نے لکھنؤ ہجرت کے بعد ہی غزل گوئی ترک کر دی تھی۔ اکثر سلام غزلوں کی زمین میں ملتے ہیں۔ جیسے

؎ اجبر الغدت ادا کرے کوئی

شاہ بیرسر فدا کرے کوئی

غزل کی زمین میں سلام لکھنے سے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

؎ اس طرح میں بھی اک سلام شہید

اس زمیں کو بھی آسماں کر دے

غزل کی زمین میں سلام لکھنے کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کی زمین کو آسمان جیسی بلندی عطا کرنا چاہتے تھے۔

اشارہ اور کنایہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

؎ دلاش بچے کی خود ہی دفنا کر

صبر کی انتہا کرے کوئی

مرثیہ کی طرح شہید کے ہاں بھی استفہامیہ انداز بھی ملتا ہے۔

---

[1] "وادی السلام" میر مہدی علی شہید تاثرات نجم افندی ص ۷

؎ کس کا لاشہ لئے آتے ہیں حسینؑ ابن علیؑ
کیوں حرم فاطمہؑ کبرا کو اٹھا دیتے ہیں

زبان اور طرزِ بیان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ پیارے صاحب رشید کے شاگرد ہونے کے ناطے زیادہ سے زیادہ رنگ انکے کلام کا ملتا ہے۔ ردیف اور قافیے کی سختی سے یا بندی کی ہے۔ نامانوس الفاظ کا کم سے کم استعمال ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلاست اور روانی ابتدائی کلام ہی سے ملتی ہے۔

سلام میں لفظ سلام، سلامی، بجرا اور بجرائی جیسے الفاظ تو دلستان عشق ہی سے ہمدوش ہیچ غائب ہونے لگے۔ چنانچہ پیارے صاحب رشید نے تو ان الفاظ کا استعمال ہی ترک کرنا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاگردِ رشید مہدی علی شہید نے بھی اپنے استاد ہی کے راستے کو اختیار کیا، اور مندرجہ بالا الفاظ کو متروک قرار دینے لگے لہذا شہید کے صد سلام کی تین جلدوں میں بھی یہ الفاظ عنقا ہیں۔ یکجہ سلاموں میں ہی بعد تلاش لبسیار یہ الفاظ ملتے ہیں۔

صد سلام حصۂ دوم کا آغاز سلام کے مندرجہ شعر سے کرتے ہیں جسمیں وہ شاہِ کربلا کی نظرِ کرم کے متمنی ہیں تاکہ نوکری سنور جائے۔ لہذا کہتے ہیں

تجھے واسطہ شہ کربلا تیرے دل کے سوز و گداز کا
تیری اک نظر ہی جواب ہے میرے صد سلام نیاز کا

ایک مقام پر کہتے ہیں

؎ پہنچے سرِ اسلام علیؑ کی جناب میں
مجھکو لیتیں ہے وہ جو کہیں گے جواب میں

رثائی ادب یا صنف سلام پر طبع آزمائی صرف واقعات کربلا کے بیان اور شاعر کے جذبات عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ اسمیں شاعر کا مقصد بھی شامل ہوتا ہے شاعر بالآخر انسان ہے اور انسان ہونے کے ناطے عیب و ہنر دونوں کا مجموعہ ہے لہذا وہ سلام گوئی کو اپنے لیئے وسیلۂ نجات سمجھتا ہے چنانچہ تقریباً ہر سلام میں اسی آرزو کا اظہار کرتا ہوا سلام کا اختتام کرتا ہے

؎ حبیب ابن مظاہر کے مقابل ہو لحد میری
شرف ملجائے مجھ کو

اپنی آرزو اور خواہش کی تکمیل ہونے پر یقین کامل رکھتے ہوئے کہتے ہیں

؎ کیا حسینؑ ابن علیؑ کے جود میں شک ہے شہید
یہ رہیں باتیں بے تابیاں تھوڑی سی جانے واسطے

مندرجہ ذیل سلام جس میں لفظ سلام استعمال کیا گیا ہے مختصر الفاظ میں شہید کی سلام گوئی کی وضاحت کرتا ہے۔

سلام

کبھی کبھی جو میں شب میں سلام لکھتا ہوں — تو لفظ لفظ بحکم امام لکھتا ہوں
گمان نہ کر امامت کا ہو کہیں اس پر — میں اپنے قلب پہ مولا کا نام لکھتا ہوں

بس اور اسکے سوا کچھ لکھا نہیں جاتا
فقط قلم سے میں نذرانِ شام لکھتا ہوں

علیؑ کی مدح سرائی ہے مشغلہ میرا
میں صبح و شام خدا کا کلام لکھتا ہوں

وفورِ گریہ سے کچھ کچھ لکھا نہیں جاتا
حسینؑ کہہ کے علیہ السلام لکھتا ہوں

مجھے حبیبؔ کی قسمت پہ رشک آتا ہے
میں در پہ شاہ کے جب اپنا نام لکھتا ہوں

عریضہ لکھتا ہوں میں جب کسی کی خدمت میں
شہید سب کی طرف سے سلام لکھتا ہوں [1]

سلام کے مطلع ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سلام جس کا ہر لفظ بغیر حکیم امام کے لکھا ہی نہ گیا ہو کس قدر بلند پایہ ہوگا۔ اب اسکے بعد شہید کے سلام گوئی کی خصوصیات بیان کرنا گویا روشنی کے آگے دیا جلانے کے مساوی ہوگا

ایک سلام کے مقطع میں کہتے ہیں

؎ مجھ سے کہتے ہیں حبیب ابن مظاہر اے شہید
تو درِ شاہ ہر اسیر پاسباں ہوئے کو ہے۔

شہید کی یہ آرزو ۱۹۶۳ء میں پوری ہوئی اور شاہ شہداؑ کے در پر پاسبانی کے اشتیاق میں اس دنیا سے سدھارے۔

---

[1] وادی السلام شہید ۳۰

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علیخاں عثمان:—

(ایچ - ای - ایچ)

اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصف جاہ سابع نظام دکن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ یوں تو عہد اور زندگی سے متعلق کئی کتابیں اور رسائل شائع ہو چکے ہیں۔ عہد حاضر میں سیدہ طیبہ بیگم کی تصنیف آصف جاہ سابع سے متعلق ملتی ہے۔

تاریخ دکن کے اوراق میں آصف جاہ سابع کی حیات کے گوشے کچھ اس طرح ملتے ہیں۔ ۱۲۸۳ھ دکن کی تاریخ میں مبارک و مسعود اسلئے قرار پاتی ہے کہ اسی سال آصف جاہ سابع میر عثمان علیخاں نظام دکن تولد ہوئے۔ خوشی اور مسرت کا اظہار نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ سارے ہندوستان میں کیا گیا۔ یہ وضاحت کی ضرورت ہی نہیں کہ نواب میر عثمان علیخاں عثمان نواب میر محبوب علیخاں آصفجاہ سادس کے فرزند تھے۔

پانچ سال کی عمر سے بڑی دھوم دھام سے تعلیم کا آغاز ہوا جسکے لیئے کئی اساتذہ مقرر کئے گئے۔ نواب عماد الملک اور سید علی شوستری بحیثیت اساتذہ فارسی مقرر ہوئے۔ عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیئے مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ کو مقرر کیا گیا جو عربی کے علاوہ دینی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ نہ صرف عربی، فارسی اور دینی تعلیم حاصل کی بلکہ انگریزی کی تعلیم بھی باقاعدہ استاد سے حاصل کی۔ ہر زبان کی باقاعدہ تعلیم اور خداداد ذہنیت نے قابلیت کو دوگنا کر دیا۔

سپاہیانہ فنون جیسے شہسواری اور سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا - اس طرح دونوں صلاحیتیں پہلو بہ پہلو پیروان چیز ہتی رہیں - ساتھ ہی آپ بھی محل مبارک پیرانی حویلی قومیم میں پیروان چیز ہتے رہے -

تعلیم و تربیت کیساتھ ہی سیر و سیاحت اور دربارون وغیرہ میں بھی یہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ برابر شریک رہتے - لہذا امورِ سلطنت کا تجربہ اوائل عمر سے ہی عملی طور پر حاصل کیا - ۱۳۲۹ھ میں سریر آرائے سلطنت نظام دکن قرار پائے جسکی شخصیت پر سرزمین دکن بجا طور پر ناز کر سکتی ہے وہ عہد عثمانیہ دکن کیلئے مستہر اور قرار پاتا ہے -

علم و ادب اور نظم و نسق سے دلچسپی کی بناء پر کافی محنت اور جانفشانی سے سرزمین دکن کو علم و ادب کا گہوارہ بنا دیا - اسکا ثبوت جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ملتا ہے حکومت کا قیام جسمیں امورِ مملکت کی بخوبی انجام دہی رعایا کی خوشحالی کا باعث بنی جسکے لئے انکے ذہن رسا کی داد دینی پڑتی ہے -

انکی شہرت صرف بحیثیت حاکم نہیں بلکہ انکے مثالی کردار کی وجہ سے بھی ہے - آجتک کوئی ایسا کردار تاریخ کے صفحات پر ابھر نہ سکا جسکی شخصیت عدل و انصاف، مذہبی رواداری اور سادگی ایک مثال قائم کر سکے

مندرجہ تمام خوبیوں کے علاوہ شاعری سے لگاؤ اور دلچسپی فطری امر ہے کہنا چاہیے کہ یہ ذوق انہیں نے وراثت میں پایا - کیونکہ نواب میر محبوب علیخاں بھی ذوق شاعری سے نا آشنا نہ تھے، بلکہ آصف تخلص کیا کرتے تھے جسکا مشہور و مقبول سلام

؎ فدا ہوں اسپہ سلامی ہے جسکا نام حسینؑ
سر امیں فرآ قامرا امام حسینؑ

ظل سبحانی کے ذوق شاعری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کمسنی سے ہی یہ متقدمین اور متاخرین کے دیوان جمع کرتے اور کلام کا انتخاب فرماتے جو قابل تعریف ہوتا۔ کلام کا نہ صرف انتخاب فرماتے بلکہ اسکے اشعار موقعہ و محل کی مناسبت سے اپنے خاص انداز سے ادا کر جاتے۔ رفتہ رفتہ شعر کہنے لگے جسکے لئے پہلے داغ اور پھر جلیل کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا۔ کسی بھی شاعر کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اسنے ابتداء ہی سے معیاری اشعار کہے ہوں، لیکن یہ شرف صرف عثمان کو حاصل ہے۔

عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں عثمان کا کلام ملتا ہے۔ آپکا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

عثمان کی شاعری عاشقانہ اور مذہبی دونوں رنگ میں ملتی ہے لیکن عثمان نے اپنی شاعری کا آغاز عشقیہ رنگ سے کیا۔ بعد ازاں مذہبی شاعری کا آغاز ہوا یا عاشقانہ شاعری عشق حقیقی پر مبنی نہیں بلکہ عشق مجازی پر مبنی ہے جیسے

؎ "شبہ کی چوٹ کھائی ہے تو کر پہلے جگر پیدا
اگر ذوق تماشا ہے تو کر ذوق نظر پیدا"

بالآخر عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ لہذا یہیں سے انکی مذہبی شاعری کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ عشق مجازی کا اثر دیرپا نہیں ہوتا بلکہ

عارضی ہوتا ہے اسکی یہہ نسبت عشق حقیقی عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز اسکا مذہب ہے جسکی پابندی اسکے لئے وسیلۂ نجات ثابت ہو سکتی ہے۔ عثمانؔ کی مذہبی شاعری مذہب و اعتقاد کے استحکام اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کیلئے بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ عثمانؔ کا نعتیہ کلام بھی ملتا ہے۔ یہہ عثمانؔ کے جذبات عقیدت سے لیس ہے۔ اگرچہ حاکم وقت تھے لیکن باوجود اسکے پیغمبرؐ اسلام کے امتی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

؎ میں عثمانؔ زیر دامانِ نبیؐ ہوں
میرے کام آئے کیا سایہ ہما کا

عثمانؔ کے ہاں رثائی اور منقبتی دونوں طرح کے سلام ملتے ہیں۔ رثائی سلام کافی درد و تاثیر سے پُر ہیں جسکو پڑھنے پر آنکھیں بساختہ اشکبار ہو جاتی ہیں۔ سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

ایک سجادؑ تھے جن پر ہوئیں تعزیریں دو
پائے نازک میں پنھائی گئیں زنجیریں دو

نسخۂ عفو گناہ شمع مزار تاریک
خاک قبر شہ والا کی ہیں تاثیریں دو

مہ و خورشید فلک پر جو نظر آتے ہیں
رخ ہمشکل نبیؐ کی ہیں یہہ تنویریں دو

شمر کہتا تھا علم لے لو بہا دو پانی
قتل عباسؑ کی ہیں بس یہی تدبیریں دو

ابروئے سبط پیمبر کا جو رہتا ہے خیال
دمبدم چلتی ہیں دل پر مرے شمشیریں دو

وصف کیا شبرؑ و شبیر کا عثمانؔ ہو رقم
ہو بہو حیدرؑ صفدر کی ہیں تصویریں دو

؎ مرقع سخن جلد دوم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۲۷۳

مندرجہ سلام نہ تو خالص رثائی ہے اور نہ ہی خالص منقبتی ہے۔ کل سات اشعار میں تین اشعار منقبت اور چار اشعار رثاء پر مشتمل ہیں۔ سلام کا آغاز سلام، سلامی مجرا اور مجری جیسے الفاظ سے نہیں ہوتا۔ اس سلام میں شاعر نے لفظ "دو" کا التزام رکھا ہے لہذا ہر چیز کو دو بتاتے ہیں۔ زنجیریں دو سے مراد دوہری زنجیر ہے۔

دوسرا سلام بھی اسی انداز پر لکھا گیا ہے یعنی نعتیہ و منقبتی رنگ ملا جلا ہے۔

سلام

ہے گلا سرور کا اور قاتل کا خنجر تیز ہے
کربلا کا سانحہ بھی کیا قیامت خیز ہے

سرگذشت کربلا سنئے کلیجہ تھام کر
حرف حرف اس داستانِ غم کا درد انگیز ہے

رنج و غم کھاتے ہیں عابدؑ فرقتِ شبیرؑ میں
نعمتِ کونین سے بیمار کو پرہیز ہے

بس گئی ہے عطر میں قتل کی ساری سرزمیں
اکبر ذی جاہ کی کیا زلف عنبر بیز ہے

نشہ اسکا حشر تک عثماں اتر سکتا نہیں
بادۂ حبِ علیؑ سے دل مرا لبریز ہے

مندرجہ بالا سلام کے ابتدائی تین اشعار تو خالص رثائی اور درد و غم میں ڈوبے ہوئے میدان کربلا کے بلا و محن کا اظہار کر رہے ہیں اور آخری دو اشعار میں مغموم اور رنجیدہ دلوں کی تسلی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

قبل ازیں راقمۃ الحروف نے عشق حقیقی سے متعلق لکھا تھا کہ یہ عشق عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے۔ اس خیال کو عثمان اپنے سلام کے مقطع میں اسطرح پیش

کرتے ہیں کہ جو کوئی حُبِ علیؑ کی شراب پی لے۔ وہ تا قیامت اپنے ہوش میں
نہیں آسکتا اور محبت اہلبیت سے اسکا دل لبریز ہوتا ہے۔ وہ کبھی راستہ نہیں بھٹکتے
نہیں پاتا بلکہ صراط مستقیم پر چل کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک اور سلام جو خالص منقبتی انداز رکھتا ہے

سلام

ہے علیؑ اللہ کا ہمنام نام الیاتو ہو — خانہ زاد عشق ہو ذوالاحترام الیاتو ہو
انس و جن و وحش و طیر و قدسی و عثمان و حور — سب کے سب بیعت کریں جبکی امام الیاتو ہو
لہر رہی تھی خود شجاعت حضرت عباسؑ کی — مرد میداں شیر دل صاحب حسام الیاتو ہو
اکبر و اصغر کا جذبہ دیکھکر کہتا تھا حیرؑ — ماہ تو الیا تو ہو ماہ تمام الیاتو ہو

رنگ پیدا کرو عثمان شاہ دیں کی مدح میں
سب کہیں صد آفریں حسن کلام الیاتو ہو۔ [1]

عثمان اپنے کلام کے اس رنگ کو شاہ دیں کی مدح کی تاثیر قرار دیتے ہیں
لہذا ایک سلام کے قطعہ میں کہتے ہیں

مدح شبیرؑ میں کیا رنگ سخن نے عثماں
میرے اشعار ذرا اہل ہنر دیکھیں تو

---

[1] مرقع سخن جلد دوم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صـ ۲۷۳

آئیے اور قطع میں لکھتے ہیں

محمدؐ کی نگاہِ لطف کا صدقہ ہے اے عثماں

جو مل جاتے ہیں تجھ کو تیری تقدیر کے ٹکڑے

مندرجہ بالا قطعوں سے عثمانؒ کی دیر محمدؐ اور آلِ محمدؐ سے وابستگی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں حکومت آصفیہ کا اختتام ہوا لیکن آپ کو راج پرمکھ کی حیثیت سے حکمران قرار دیا گیا لیکن ۲۴ فبروری سنہ ۱۹۶۷ء کو یہ چراغ پوری طرح گل ہو چکا۔

یہ سلسلہ مدح گوئی اور شاعری نسل آصفی میں برقرار رہا۔ شجیع کے دربار کو اس خصوص میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ شجیع خود شاعر بھی تھے اور شعراء کے مربی بھی چنانچہ بہت سے نام ایسے ملتے ہیں جنھوں نے شجیع کے دربار سے وابستہ رہ کر والاشاں کی استادی کا شرف حاصل کیا ہے۔ ان میں جلیل فانی، نجم اور جوشش کے نام نمایاں ہیں جنھوں نے نہ صرف شہزادہ کو بلکہ اک عہد کو متاثر کیا ہے اور فیض پہنچایا ہے۔

بہ تقسیم

دورِ جدید کے شعراء

نجم آفندی، جوش، آلِ رضا، جمیل مظہری
احسان دانش، ماہر القادری، برق موسوی، شاہد صدیقی، شجیع
باقر امانت خانی
وحید اختر
اور
احمد فراز کے سلام

غزل پر اثرات

اردو ادب کے تمام نقّاد مرثیے کے دورِ جدید کے شعراء میں
جوش ملیح آبادی کا نام سرِ فہرست لکھتے ہیں۔ جن کے کلام نے
۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء سارے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔
چنانچہ جوش کو انقلابی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس نے
جنگِ آزادی میں اسطرح حصہ لیا کہ قلم کے ہتھیار سے اپنے آپ کو
لیس کیا اور شاعری کی زرہ بکتر پہنی تاکہ ظلم کے ہر وار کو وہ اس پر
روک سکیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش نے مرثیے کے مقصد
اور اُس کی عظمت کو تو برقرار رکھا لیکن انداز بیان بالکل ہی بدل دیا۔
ان کا سب سے پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" ہے جو ۱۹۱۸ء میں لکھا گیا
مندرجہ بالا نظریہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ مرثیے
کا آغاز جوش ملیح آبادی کے ہاتھوں ہوا۔ چنانچہ جوش کا نام دورِ جدید
کے شعراء میں سرِ فہرست ملتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت سے بعید
نہیں کہ جوش کی یہ اولیت صرف صنفِ مرثیہ ہی تک محدود ہے
صنفِ سلام میں یہ اولیت شاعرِ اہلبیت، حضرت علامہ نجم آفندی کو
حاصل ہے۔ سید علی رضوی "حسینؑ پر سلام" کے مقدمے میں اسی
نظریئے کو پیش کرتے ہیں۔

"نجم آفندی بلاشبہ صنفِ سلام کو عصرِ حاضر کے تقاضوں
سے ہم آہنگ کرنے اور اسے عوام کی آواز بنانے والے

پہلے شاعر ہیں جن کے سلام رجز ہیں، دعوت بھی ہیں
تبلیغ بھی ہیں اور درس بھی۔ نجم آفندی کے بعد ان کی
تقلید میں سلام لکھنے والوں کا بڑا گروہ پیدا ہو گیا[1]

دورِ جدید کے ان سلام گو شعراء کا مقصد نہ صرف سرکارِ رسالت مآب پر اور شہدائے کربلا پر عقیدتاً سلام بھیجنا تھا اور نہ ہی صرف واقعاتِ کربلا کو بیان کرکے رونا اور رلانا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عزمِ حسینؑ سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنا تھا اور انھیں ظالموں کے خلاف سینہ سپر ہو کر میدانِ جنگ میں کھڑا ہونے پر آمادہ کرنا اور انھیں ظلم کے خلاف نعرہ زن کرنا تھا۔

سید علی رضوی لکھتے ہیں کہ

"ایسے ہی سلاموں کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے اور حساس طبقے میں سیاسی ہلچل پیدا ہوئی تو یہ سلام ان کے ہاتھ میں ایک سپر بن گئے جو ظلم کے ہر وار کو روک سکتے تھے"[2]

بحیثیت سرگروہ جدید سلام گو شعراء شاعرِ اہلبیت علامہ نجم آفندی کی حیات اور سلام گوئی کا تذکرہ یہاں ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] حسینؑ پر سلام (مقدمہ) مرتب سید علی رضوی ص ۳۵
[2] " " " " ص ۲۴

علامہ نجم آفندی :۔ مرزا اجمل حسین نام تھا اور نجم تخلص کرتے تھے۔ شاعر اہلبیت، خطاب تھا۔ بزم اکبر آبادی کے لڑکے تھے سنہ ۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ترکی النسل تھے۔ آباو اجداد کب ہندوستان آئے اس کا خود نجم آفندی ہی کو علم نہیں۔ جد اعلیٰ مرزا جعفر علی فصیح کے چھوٹے بھائی مرزا نجف علی بلیغ تھے۔ فصیح نے بار بار زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں بھی فصیح بغرض حج و زیارات مقامات مقدسہ کیلئے روانہ ہوئے۔ جن سے متعلق نجم آفندی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر کرتے ہیں۔

"مرزا فصیح نے کعبۃ اللہ اور حاجیوں کی اتنی خدمت
کی تھی کہ ترکی حکومت نے اُن کو آفندی کا خطاب دیا
جو نسلاً بعد نسلاً استعمال ہو سکتا تھا" [1]

یہی وجہ ہے کہ یہ نسل در نسل اپنے نام کے ساتھ "آفندی" لکھنے کے حقدار ہوئے آباو اجداد نے آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ لہذا یہ اکبر آبادی بھی کہلائے بنجم دس برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوئے۔ اپنے ماموں مرزا علی حسین قیصر کے زیر پرورش رہے ننھیال اور دادھیال دونوں طرف سے ذوق شاعری ورثہ میں ملا تھا۔ نجم نے ابتدائی اردو، فارسی اور قرآن کی تعلیم اپنے رشتے کے چچا مرزا محمد ہادی سے حاصل کی۔ بعد ازاں مفید عام ہائی اسکول آگرہ سے مڈل پاس کیا۔ اس تعلق سے وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔

"میری تعلیم اُس زمانے کے مڈل تک ہوگئی مگر کم از کم انگریزی کی دو ہزار
کتابیں ہر قسم کی نظر سے گزری ہیں، اردو فارسی گھر پر پڑھی عربی نہ پڑھ سکا" [2]

---

[1] النجم از نجم آفندی صـ۲۷

[2] " " " " نجم اپنے خطوط کے آئینے میں صـ۲۶۲

نجم کے اس بیان سے اُنکی قابلیت اور انگریزی زبان میں ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے کہ صرف مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بے پناہ قابلیت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ ہندی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان میں مہارت رکھنے کے باوجود انگریزی تہذیب و تمدن سے بیزار اور انگریزی حکومت سے نالاں تھے۔ اسکول ہی کے ماحول میں نفرت کی آگ بھڑکتی رہی۔ بالآخر آگ کے ان شعلوں نے کلام کی صورت اختیار کرلی۔

بارہ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز ہوا ابتداء میں اپنے والد بزم آفندی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد طبیعت کی جدت نے ان کے کلام کو اصلاح کی بندش سے بھی آزاد کردیا۔ اصلاح سخن کی فکر سے آزاد ہوکر قومی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ خود ملازمت سے مستعفی ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ محکمۂ ریلوے دہلی میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے ۱۹۲۵ء تک یعنی کل بارہ سال ملازمت کی۔ مسٹر ٹیوسٹن ان کے افسر اعلیٰ تھے۔ ایک مرتبہ نعیم نجم کی کھدر پوشی پر اعتراض ہوا جس پر نجم کافی بگڑے اور نوبت تلخ کلامی تک آپہنچی۔ بعد ازاں بطور سزا ان کا تبادلہ آسنسول کردیا گیا۔ بالآخر نجم نے اس ملازمت سے مستعفی ہوتا ہی بہتر جانا اور ۱۹۳۵ء کے اواخر ہی میں وہ حیدرآباد دکن پہنچے۔

یہ ایک قومی کام کے سلسلے میں حیدر آباد آئے۔ نواب شہید یار جنگ اور حکیم محمد عباس کے ہمراہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع کے دربار میں داخلہ ہوا۔ وہاں انھوں نے ایک غزل سنائی جس کے چند شعر درج ہیں۔

کعبہ و دیر سے پیام آئے　　تیری جانب جو چند گام آئے
سن رہے ہیں تمہارا افسانہ　　کہیں سٹائد ہمارا نام آئے
نجم صاحب کو راستہ دینا　　مذہب عشق کے امام آئے

اس طرح نجم دربار شجیع سے وابستہ ہو گئے اور شجیع کے استاد مقرر ہونے کا شرف بھی ملا۔ ۱۹۵۵ء تک یہ دربار داری کے فرائض بحسن و خوبی نبھاتے رہے لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد دربار داری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جس کے مختلف اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ جس کو تفصیلی طور پر بیان کرنا مقالے کو طول دینا ہو گا۔ لیکن ذریعۂ معاش کی پریشانی کا حل کچھ اس طرح تلاش کیا کہ جہاں دربار سے وابستگی کے سلسلے میں ماہانہ چار یا پانچ سو روپے ملا کرتے تھے اب دربار سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد صرف سات سو روپے وظیفہ مقرر ہوا۔ اس لئے ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر جعفر رضا نے اپنے لڑکوں کے لئے انھیں اتالیق مقرر کیا۔ جس کا معاوضہ پچھتر روپے ملتا رہا۔ جس کے باعث ہمیشہ پریشانیوں میں مبتلا رہتے۔

نجم کی تین لڑکیاں اور دوسرے عزیز و اقارب چونکہ کراچی میں مقیم تھے۔ بھائی کوکب آفندی تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے۔

یہی وجہ تھی کہ نجم بھی ۱۹۷۱ء میں ان سے ملاقات کے لئے عارضی ویزا پر پاکستان گئے۔ علامہ رشید ترابی صاحب نے نجم کی بڑی قدر کی اور وہاں نجم ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ تین مہینے کراچی میں قیام کے بعد لاہور گئے اور وہاں کی محفلوں کو گرمایا۔ اگرچیکہ عارضی ویزا پر پاکستان گئے تھے جس کی مدت ختم ہونے پر انھیں نوٹس بھی ملی لیکن مشیت الٰہی کے مطابق مستقل طور پر وہیں کی خاک میں سکونت اختیار کی۔ ۱۳۹۵ھ م ۱۹۷۵ء کو شاعر اہلبیت خدمت اہلبیت اطہار میں پہنچے۔

نجم نے اپنی اڑتیس تصانیف چھوڑی ہیں۔ جن میں نوحوں کے مجموعے مجموعۂ مراثی، رباعیات و قطعات کے علاوہ سلام کا مجموعہ "دارالسلام" بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں مرثیہ "فتح مبین" اور "کاروان ماتم" مجموعۂ نوحہ جات میں بھی سلام ملتے ہیں۔

شاعری سے متعلق علامہ نجم آفندی اپنی منظوم تصنیف "تاثرات زیارت" کے پیش لفظ میں اس طرح کرتے ہیں۔

"میری شاعری کی ابتدا ہی مدح اہلبیت سے ہوئی" [1]

نجم کے انداز کلام کو سراہتے ہوئے حکیم الملک حکیم سید محمد عباس "کاروان ماتم" کے مقدمے میں لکھتے ہیں

"شاید ہی کوئی مدح اہلبیت میں وقت اور ماحول کو اسطرح سمیٹ لیتا ہو۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو نجم صاحب کو صرف شاعر ہی نہیں مفکر ثابت کرتی ہے" [2]

---

[1] تاثرات زیارت (پیش لفظ) از علامہ نجم آفندی صہ ۲

[2] کاروان ماتم آفندی مقدمہ از حکیم الملک حکیم سید عباس

طرز جدید کے سلام جن میں سلام کے روایتی انداز سے بغاوت ملتی ہے۔ ہیئت بھی اب وہ نہ رہی جو انیس و دبیر کے عہد میں متعین ہو چکی تھی اور نہ ہی سلام گوئی کا مقصد اب صرف وہی رہا۔ جو انیسویں صدی عیسوی میں تھا۔ بلکہ قوم کو بیدار کرنا اور ظالموں کے خلاف انھیں میدانِ جنگ میں گرفتار ہونے کی ترغیب دینا تھا۔ اور اسوۂ حسنہ شبیری کی نظیر ان کے سامنے پیش کرنا تھا۔

سید علی رضوی لکھتے ہیں کہ

"یہ سلاموں کی ترقی کا ایک ایسا زینہ تھا جس پر پرانے شاعر چڑھ نہیں سکتے تھے" [1]

علامہ نجم آفندی نے ان سلاموں میں تبلیغ کی شان پیدا کر دی، وقت اور ماحول کے مطابق اس کو ملی اور قومی شعور سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ لہذا اپنے سلاموں سے متعلق خود اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

بہت پیام ملیں گے مرے سلام میں نجم
نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

ریاض فاطمہ اپنے ایم۔ فل کے مقالے "نجم آفندی بحیثیت شاعر" میں علامہ کی سلام گوئی سے متعلق اظہار خیال کرتی ہوئی لکھتی ہیں)

"نجم یقیناً وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے واقعاتِ کربلا کو پس منظر میں رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے

---

[1] حسینؑ پر سلام (مقدمہ) از سید علی رضوی ص ۲۴

مطالبِ سلام کے مضامین) استعمال کئے ہیں
امام عالی مقام اور آپکے انصار کی بے مثال
قربانیوں، ان کے عزم و استقلال کو نجم نے
جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ مایوس و ناامید
مصیبت زدہ مسلمانوں کے دل میں احساس بیداری
پیدا ہو۔ اپنے حق کے لئے لڑنے کی امنگ اور
حوصلہ پیدا ہو۔ نجم کے اس انداز کو دیگر شعراء
نے بھی اپنایا ہے۔ لیکن اولیت کا شرف
نجم کو حاصل ہے"[1]

لہٰذا رباعیات بھی علامہ کے تبلیغی انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

؎ آنکھوں میں تری زبان پر قولِ علی جذبہ کوئی ان حدوں سے آگے نہ چلا
اللہ وہی قوم ہو سب سے پیچھے جس قوم میں ہو معرکۂ کرب و بلا

اس طرح قوم کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرتے ہیں اور انھیں للکارتے ہیں

نجم کے سلام بھی عنوان کے تحت ملتے ہیں جو ایک نیا انداز ہے
سلام بعنوان "کار نمایاں" میں شہدائے کربلا کے اسوۂ حسنہ کو اسطرح
پیش کرتے ہیں۔ سلام غزل ہی کی ہیئت میں ہے۔

---

[1] نجم آفندی بحیثیت شاعر مقالہ برائے ایم فل عثمانیہ یونیورسٹی از ریاض فاطمہ صـ ۱۱۰، صـ ۱۱۱

کارنمایاں

خدا کی راہ میں کارنمایاں ایسے ہوتے ہیں — تہہ خنجر کئے سجدے مسلماں ایسے ہوتے ہیں

وہ پیاری پیاری شکلیں دیکھکر آل پیمبر کی — ستاروں نے کہا اے چاند انساں ایسے ہوتے ہیں

حسینی قافلہ اے کربلا پیاسا گزرتا ہے — عطش پر صبر کر لیتے ہیں مہماں ایسے ہوتے ہیں

جوانی رن سے کہتی آرہی ہے لاش قاسمؑ پر — کہ اسلامی جوانمردوں کے ارماں ایسے ہوتے ہیں

مسافر کا تن بے سر ہے اور شب کا اندھیرا ہے — کسی کی لاش پر گیسو پریشاں ایسے ہوتے ہیں

قدم پر سر کے دم نکلا حبیب ابن مظاہرؑ کا — محبت کے وفا کے عہد و پیماں ایسے ہوتے ہیں

ہزاروں سے ترائی چھین لی جب ایک پیاسے نے — لب ساحل پکارے مرد میداں ایسے ہوتے ہیں

یہ مرنا تجھ کو ابن عوسجہ کے لال زیبا تھا — وفاداروں کے لخت دل مری جاں ایسے ہوتے ہیں

نوائے شکر سجاد حزیں اور شام کی منزل — سکون و صبر کے ہر درفشاں ایسے ہوتے ہیں

خراج اشک حسرت لے لیا دربار قاتل سے — مقرر بزم دشمن میں در افشاں ایسے ہوتے ہیں

خدا ہی جانے دل سے کیا کہا ہوگا مانگا ہوں نے — سکینہ کو خبر کیا تھی کہ زنداں ایسے ہوتے ہیں

سنا کر نجم قصہ کربلا والے شہیدوں کا
مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

نجم اپنے طرز جدید کے کلام کا مقصد خود اسطرح بیان کرتے ہیں چاہے وہ سلام ہو یا نوحہ، رباعی ہو یا قصیدہ یا مرثیہ۔

"عصر حاضر ہر شعبہ تحقیق و تدقیق کا زمانہ ہے۔ نظریں سائنسی سے سبب زیادہ حقائق کی تلاش کرتی ہیں۔ مافوق الفطرت حالات اور معجزات کے بجائے محمد و حسینؑ کے اسوۂ حسنہ واقعات کے سبق آموز

پہلوؤں اور فلسفیانہ نتائج کا مطالعہ مدنظر ہوتا ہے"[1]

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ سلام رثائی ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ جس میں علامہ کربلا والوں کی نظیر پیش کرکے مسلمانوں کو مردِ میداں بنانا چاہتے ہیں۔

نجم کے سلام مخمس اور مسدس کی ہیئت میں بھی ملتے ہیں اور یہ بھی عنوان کے تحت ملتے ہیں۔

مدینہ کا سلام مخمس کی ہیئت میں ملتا ہے

مدینہ کا سلام

سفر ہے کس کا کہ طوبا سلام کہتا ہے — فراز عرش معلیٰ سلام کہتا ہے
یہ کون جاتا ہے کعبہ سلام کہتا ہے — مسافروں کو مدینہ سلام کہتا ہے
مسافروں کو مدینہ سلام کہتا ہے

حبیبِ پاک سنا ہے کہ خونچکاں ہوگی — کہاں نماز تہہ تیغ جانستاں ہوگی
زمیں وہ آپ کے سجدوں سے آسماں ہوگی — بنی علیؑ کا مصلا سلام کہتا ہے
مسافروں کو مدینہ سلام کہتا ہے

سلام رثائی و منقبتی انداز رکھتا ہے

ایک اور سلام بھی مخمس کی ہیئت میں ملتا ہے جس کو نجم نے ایلچی کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

---

[1] تاثرات زیارت پیش لفظ — نجم آفندی ص ۵

ایلچی

اے مسلم غریب صداقت کے ایلچی — دینِ مبینِ حق کی حکومت کے ایلچی
پیغمبرِ خدا کی امانت کے ایلچی — ایثار کے وفا کے شرافت کے ایلچی
لاکھوں سلام تجھ پہ کہ تب کے ایلچی

تنہا یہ فوج تھی ابنِ زیاد نے — طبقے الٹ دیے ترے جوشِ جہاد نے
پیہم شکست کھائی گروہِ عناد نے — مارا تجھے فریب سے اہلِ عناد نے
لاکھوں سلام تجھ پہ کہ تب کے ایلچی

حضرتِ مسلم ایلچی امام حسینؑ کے تنہا ہزاروں کے لشکر سے لڑنے کی نظیر پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کے حوصلے بلند کرتے ہیں۔ اور ان میں جوشِ جہاد پیدا کرتے ہیں۔ سلام رثائی بھی ہے اور ساتھ ہی منقبتی بھی۔ اسوۂ انصارِ حسینؑ کو پیش کرتے ہوئے اسی کی پیروی کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔

اسوۂ انصار کے عنوان سے بھی سلام ملتا ہے۔

اسوۂ انصار

پھر نہ پیدا ہوا شبیر سا شبیر کوئی — اس سے دیکھی نہیں ایثار کی تصویر کوئی
امتِ جد کی محبت میں یہ پابندی تھی۔ — ورنہ عابد کو سکھاسکتا تھا تجہیز کوئی
دامنِ آلِ نبیؐ ہاتھ سے چھوٹے کیونکر — اس سے بہتر نہیں قرآن کی تفسیر کوئی

ف ۱۲ اشعار

مرحبا اسوۂ انصار حسین ابن علی
ان کی تصویر سے ملتی نہیں تصویر کوئی
خون شبیر کا اسلام کی بنیاد میں ہے
ایسی محکم نظر آئیگی نہ تعمیر کوئی
نجم شاعر ہے حسین ابن علی کے در کا
اور دنیا میں نہ منصب ہے نہ جاگیر کوئی

سلام "علی کا شباب" میں بھی نجم اسوۂ آل پیمبر سے سبق سیکھنے کی قوم کو تاکید کرتے ہیں۔

سبق حسین کی محنت سے لو خدا کے لئے
لہو بہایا تھا کیا ارض کربلا کے لئے
ملے نہ ہونگے علی کو وہ ماں کی گود میں بھی
مزے جو نیند کے بستر پہ مصطفےٰ کے ملے

سلام "اسوۂ شبیر" کے دو اشعار ملاحظہ ہوں

پاؤں عابد کا نئی راہ کی تعمیر میں ہے
پاؤں وہ پاؤں جو الجھا ہوا زنجیر میں ہے
کچھ خبر بھی ہے تجھے قوم بنانے والے
کتنا معصوم لہو قوم کی تعمیر میں ہے

سلام "میدان عمل" میں مسلمانوں کو عمل کی ترغیب دیتے ہیں

؎ آسان ہے قربانی و ایثار پہ تقریر
میدانِ عمل کچھ سرِ منبر نہیں ہوتا

سلام "ولولۂ انقلاب" میں انقلاب لانے کے لئے مسلمانوں میں ولولہ اور جوش پیدا کرتے ہیں۔

؎ یہ اپنی جان دیکے بچاتے نہ کس طرح
اسلام کس سنی میں بقا اگر شباب میں
تا شام روتے روتے عابد چلے گئے
کانٹے تھے پھول ولولۂ انقلاب میں
تحقیق کا جنون ہے فکر عمل نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو کرب و بلا کی کتاب میں

نجم کے جملہ سلام پیش کرنا تو ناممکن سی بات ہے لیکن تقریباً سلاموں کے دو یا تین اشعار ہیں سلام "فتح عظیم" کے چار اشعار ملاحظہ ہوں

؎ یہ عزم یہ تحمل یہ قوتِ ارادی وہ آخری سپاہی جھولے سے لیکے آنا
عہدِ یزیدیت کی بنیاد ہل رہی تھی صلِ علےٰ وہ تیرا نیزہ پہ لب ہلانا
خیبر کا در اٹھانا بابائی فتح مندی فتح عظیم تیری لاشِ پسر اٹھانا
اب مانتی ہے دنیا تیرے پیام "حق" کو جب مانتے کے دن تھے دنیا نے جب نہ مانا

میر انیس کا شعر

بھٹک کے راہ سے پیچھے نہیں پھرا کرتے
اٹھو انیس اٹھو کاروان روانہ ہوا۔

اس خیال کو نجم اس طرح پیش کرتے ہیں

؎ اے نجم بیٹھنے ہو اب کیا محفل سے محفل کر
آثار کہہ رہے ہیں اٹھنے کا ہے زمانہ

سلام "پیام حریت" میں آرزو کرتے ہیں

؎ وہ بھی دن آئیں دل ملت سے آئے یہ صدا
نوجواں آمادۂ تقلید اکبر ہو گئے

اپنے جدید طرز سلام سے متعلق "بلندئ ہمت" میں لکھتے ہیں

؎ شعر و سخن میں نجم یہ ہیں بے نیازیاں
سبھا ہوں اجتہاد کی قوت لئے ہوئے

سلام "تکرار تجلی" میں لکھتے ہیں

؎ بے حب شہ مردان تو شیق نہیں ہوتی
یوں نام لکھا لیجے اسلام کے لشکر میں
اشک غم سرور کے چھینٹوں سے فنا کر دو
طوفاں ہے سیاست کے بے فیض سمندر میں.

قبل ازیں سلام لکھنے کے مقاصد میں یہ بھی ایک مقصد شامل تھا کہ سلام حصول ثواب کی خاطر لکھے جاتے تھے۔ لیکن نجم کا انداز کچھ اور ہی ہے "صراط حیدر" کے مقطع میں لکھتے ہیں

؎ صدا میں خلد وہ دیں گے تو نجم کہہ دیں گے
نثار سے نعلین قدم پر نثار کرتے ہیں)۔

سرزمین کربلا کو جنت ہر اس طرح ترجیح دیتے ہیں

؎ ذکر جنت کا سنا ہے اس سے آگے کیا کہوں
اے مہر دیکھی ہوئی جنت زمین کربلا

نجم کے سلام طرز جدید پر مبنی رہنے کے ساتھ ہی رثائی، منقبتی و نعتیہ انداز بھی رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی انیس کی طرح غزل کے انداز کی بھی ترجمانی کرتے ہیں

؎ اضطراب معنوی دے کر بنایا دل کو دل
زندگی کو زندگی انساں کو انساں کر دیا۔

چاہے کوئی بھی صنف ہو نجم نے اسی مقصد کے تحت اپنا قلم اٹھایا جس کو اپنی رباعی میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

؎ شبیر کا درد دل سنانا ہے تجھے — سوتی ہوئی دنیا کو جگانا ہے تجھے
تو آپ ہی انسان ابھی تک نہ بنا — انسان کو انسان بنانا ہے تجھے

اپنے اسی مقصد کے تحت پیغام دیتے ہیں۔

منعم ہے تو یہ آتش افلاس بجھا — اٹھ اپنی غریب قوم کی پیاس بجھا
تو شمع جلاتا ہے عزاخانوں میں — للہ نہ اپنی شمع احساس بجھا

بیسویں صدی میں سلام کا جو روایتی انداز تھا اس سے بغاوت اس طرح بھی ہوئی ہے کہ قبل ازیں سلام کا ہر شعر غزل کی طرح منفرد معنی رکھتا تھا استعارہ مربوط نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن نجم نے اپنے ہر سلام میں تخلیقی واقعات

کو مخصوص انداز سے پیش کیا ہے۔

"النجم" میں ڈاکٹر سید علی مومن کا شاعر اہلبیت اور ان کے پیغامات" کے عنوان سے مضمون ملتا ہے جس میں وہ نجم کی سلام گوئی سے متعلق لکھتے ہیں۔

"خصوصاً سلام اور قطعات کی وادی میں جو لب و لہجہ اور رنگارنگی، جدت، ان کے تخیل نے پیش کی ہے۔ اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ سلاموں میں ادب، پیام، زبان بیان اور زندگی کی توانائیاں خوب ابھری ہوئی ملتی ہیں ہوتی ہے اور دلنشیں الفاظ میں ابھرنے والے احساسات کی تصویریں پیش کرکے عقیدت کا شاعرانہ جلال پیدا کیا ہے اور انداز بیان کو غیر معمولی وقار بخشا ہے"[1]

بے شک یہ تمام خوبیاں نجم کے سلام میں موجود ہیں جسکی بناء پر ان کے سلام سلام کے روایتی انداز و مقاصد سے بغاوت کرتے ہیں۔ لہذا وہ طرز جدید کے سلام گو شعراء میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اور ان کا کلام ان تمام خوبیوں کا حامل رہنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے اس لئے کہ نجم پیدائشی شخص نہیں جنھوں نے میدان سخن میں قدم رکھا بلکہ ان کے آباء و اجداد بھی اس میدان سخن سے وابستگی رکھتے تھے۔ چنانچہ نجم لکھتے ہیں

؎ میرے آبا کا شرف ہے میری فطرت کا خمیر
نجم صدیوں میں ہے فخر مدح آل عبا

---

[1] النجم مضمون مشاعر اہلبیت اور ان کے پیغامات از ڈاکٹر سید علی مومن ص ۳۸

ایک اور شعر میں میر انیس کی طرح اپنی پشت ہا پشت سے شاعر اہلبیت ہونے پر یوں فخر کرتے ہیں۔

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عز و شرف
نجم فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفٰے[1]

ایک اور مقام پر مدح آل پیغمبر کا یہ سلسلہ قائم رہنے پر اظہار مسرت کرتے ہیں اور روضۂ اقدس میں پہنچ کر اپنی قلبی کیفیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں

سبھی ہیں آپ کے شاعر فصیح تا بہ سہیل[1]
ثناء کا سلسلۂ استوار لایا ہوں
جو مدح کی ہو کسی غیر کی زباں جل جائے
خلوص فکر کے پھولوں کے ہار لایا ہوں

دوسرے شعر سے نجم کی خود داری کا اظہار ہوتا ہے کہ ہر سُخن دربار شجیع سے وابستگی کے باوجود سوائے آل محمدؐ کے کسی کی مدح نہ کی

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی علامہ نجم کی موت پر پیام تعزیت میں ان کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں

"جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں انکے اشعار کا لوہا مانتا تھا اور میرے نزدیک مرثیے اور منقبت میں انہیں وہ بلند مقام حاصل تھا جس کی نظیر نہیں مل سکتی"[2]

---

[1] فرزند نجم آفندی

[2] الفرقان پیغام تعزیت از جوش ملیح آبادی ص ۴۱

خود نجم کو بھی اپنی تبلیغی شاعری کی تاثیر کا احساس تھا۔ اسی لئے کہتے ہیں

تقلید میری ہوتی ہے اہل سخن میں نجم
چھایا ہوا دلوں پہ یہ رنگ کلام ہے

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ دور جدید کے مرثیہ گو شعراء میں جوش کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید اختر انیس و دبیر کے بعد کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں

"پیارے صاحب رشید ہوں یا دلگداختہ صاحب عروج عارف ہوں یا وحید، اپنی قادر الکلامی کے باوجود سب مرثیے کے روایتی حصار سے باہر نہیں نکلے اس حصار کو بیسویں صدی میں جوش ملیح آبادی نے توڑا۔ "شعلہ و شبنم" میں ان کے چند مختصر مراثی اس بات کا ثبوت ہیں کہ مقدس کی پابندی کرتے ہوئے بھی شہادت کربلا کے موضوع پر نئے انداز سے شعر کیا جا سکتا ہے" [1]

ساتھ ہی سلام نگاری میں بھی جوش ملیح آبادی نے طرز جدید اپنایا ہے۔

---

[1] العلم مرثیہ و سلام نمبر مضمون جدید مرثیے کی روایت و اسالیب از ڈاکٹر وحید اختر صفحہ

جوشؔ ملیح آبادی :۔

شبیر حسن خاں نام اور جوشؔ تخلص کرتے تھے

۱۸۹۶ء میں ملیح آباد ضلع لکھنؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ شبیر احمد خاں کے لڑکے تھے جن کا سلسلہ نواب صمام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا سے ملتا ہے۔ جن کا شمار شاگردانِ ناسخ میں ہوتا ہے۔ گویا کی سلام گوئی کا تذکرہ شاگردانِ ناسخ کے تحت پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ جوشؔ کو بھی ذوقِ شاعری ورثے میں ملا۔ دادا احمد خاں احمدؔ خود والد دونوں بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جوشؔ کی دادی بھی مرزا غالب کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ شاعری سے خصوصی شغف لازمی امر تھا۔ جوشؔ کی والدہ بھی اعلیٰ ذوقِ سخن رکھتی تھیں۔ ان حالات میں جوشؔ کا شاعری سے دلچسپی نہ رکھنا ناممکن سی بات تھی۔

جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ماں اور دادی کا بڑا حصہ ہے۔ بعد ازاں لکھنؤ کے مختلف اسکولوں سے ہائی اسکول پاس کیا اور ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ گئے جہاں بی۔ اے۔ او کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں آگرہ گئے اور وہاں سینٹ کیمرج تک تعلیم حاصل کی ۱۹۱۸ء میں شانتی نکیتن گئے اور وہاں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ جوشؔ ۱۹۲۵ء میں حیدر آباد دکن آئے اور تقریباً دس سال تک دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ملازم رہے۔

۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء ماہ نامہ "آج کل" دہلی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ۱۹۵۵ء میں پاکستان چلے گئے اور وہیں پر مستقلاً سکونت اختیار کی۔ وہاں ترقی اردو بورڈ کے قیام میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ساتھ ہی مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض بھی جوش نے انجام دیئے ۱۹۸۱ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

نجم آفندی کی طرح جوش کے ہاں بھی شاعری تین پشتوں سے چلی آرہی تھی اور جوش چوتھی پشت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ نو برس کی عمر سے شاعری کا آغاز ہوا جس پر جوش مخزنیہ انداز میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

؎ شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فن خاندانی ہے

یہ جوش کا پہلا شعر تھا۔ ابتداً صنف غزل پر طبع آزمائی کرتے رہے بعد ازاں صنف نظم پر اپنے قلم کو آزمایا۔ پہلی نظم "ہلال محرم" لکھی جس سے جوش کی کربلا والوں سے عقیدت جھلکتی ہے۔

کربلا والوں سے عقیدت کا سبب گھر کا ماحول ہے۔ اگرچہ رثائی شاعری کا سلسلہ پشتینی تھا لیکن جوش کی دادی ہرمزی خانم نے، جو شیعیت کی پیرو تھیں، گھر پر امام باڑہ تعمیر کروایا۔ چنانچہ باقاعدہ عزاداری کا آغاز ہوا اور جوش بھی ان مراسم عزاداری میں صدق دل سے حصہ لیتے

علاوہ ازیں گھر سے باہر کا ماحول بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔
مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھایا کرتے
پیارے صاحب رشید کی صحبت بھی رہا کرتی۔ اس کے علاوہ
مرزا محمد ہادی رسوا (صاحب امراؤ جان ادا) سے عربی و فارسی کی تعلیم
حاصل کی۔ ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے بھی جوش کے عقائد
پر کافی اثر ڈالا۔ ڈاکٹر صفدر حسین اپنی تصنیف "رزم نگاران کربلا"
میں ایک واقعہ خود جوش کی "سوانح" یادوں کی برات" کے حوالے
سے بیان کرتے ہیں۔

"اس ماحول کے پروردہ جوش کو خواب میں
جناب رسول خدا اور حضرت علی کی زیارت کا
شرف بھی حاصل ہوا۔ جس نے ان کے جذبۂ ولائے اہلبیت
میں اور زیادہ تڑپ پیدا کر دی"[1]

عزیز لکھنوی کی شاگردی کا سلسلہ چھ یا سات سال سے زیادہ قائم
نہ رہا۔ ۱۹۱۶ء میں والد کے انتقال کے بعد جوش خود مختار زندگی گزارنے
لگے۔ بعد ازاں جوش احمد آباد آئے اور کانگریس کے جلسوں میں شرکت
کی جہاں ان کی ملاقات گاندھی جی، مولانا آزاد، مولانا حسرت موہانی
محمد علی جوہر، شوکت علی اور جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ کانگریس کے
جلسوں میں حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھ کر جوش میں بھی ولولہ اور جوش
پیدا ہوا۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی بے انتہا متاثر رہے۔ چنانچہ جوش

---

[1] رزم نگاران کربلا از ڈاکٹر صفدر حسین، ص ۲۶۱

نے بھی تحریک آزادی میں اپنے قلم کے ذریعے حصہ لیا۔ اور محمد علی جوہر سے زیادہ اثر قبول کیا جس کا اندازہ ڈاکٹر صفدر حسین کے اس بیان سے ہوتا ہے

"جب ان کی ملاقات ملک کے حریت پسند رہنماؤں سے ہوگئی تو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کرکے اپنی نظم نگاری میں سیاسی آب و رنگ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ مولانا محمد علی جوہر اپنی سیاسی جدوجہد میں امام حسینؑ کو اپنا قائد فکر و نظر اور دنیائے اسلام کا منفرد ہیرو سمجھتے تھے اور یہ موضوع جوشؔ کے ماحول عقائد اور فکری نہج سے بھی قریبی مناسبت رکھتا تھا"[1]

چنانچہ جوشؔ نے بھی حضرت علیؑ اور امام حسین علیہ السلام کو اپنی شاعری کے لئے مثالی کردار بنایا۔ تاکہ مایوس و خستہ جگر ناامید اور ہراساں مسلمانوں میں دوبارہ عزم و استقلال، جوش و ولولہ پیدا کیا جائے۔ جس سے وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ پا سکیں۔ لاشعور قوم میں دوبارہ شعور کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ گمنامی کے بھنور سے نکل سکیں جس کے لئے آل پیغمبرؐ کی مثال سے بڑھ کر کوئی اور مثال نہ تھی۔ لہذا ۱۹۱۸ء میں جوشؔ نے پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" لکھا۔ اس سلسلے میں ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں۔

---

[1] رزم نگاران کربلا از ڈاکٹر صفدر حسین ص ۲۶۹، ۲۷۰

"یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں خلافت اور
عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ آزادی کی جنگ
میں بدیسی سامراج کے خلاف انھوں نے اپنی
شاعری سے بھرپور کام لیا اور اس سلسلے میں واقعہ کربلا
کے علائم اور رموز استعمال کئے۔ آزادی کی جدوجہد کو
جوش نے تازہ کربلا کا نام دیا اور اس کی کامیابی کے لئے
عزم حسینؑ کی طلب کی"[1]

جوش کے مرثیے رثائیہ نہیں بلکہ رزمیہ انداز رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
بعض نقاد انھیں مرثیہ نہیں بلکہ مسدس کا نام دیتے ہیں جس طرح سے
مسدس حالی بھی قوم کو بیدار کرنے اور ان میں سوئے ہوئے احساس کو جگانے
کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ حالی نے اپنے مسدس میں واقعات کربلا اور
شہادت کو پیش نہیں کیا بلکہ رسالت مآبؐ سے پہلے دور جہالت اور
رسالت مآبؐ کے ظہور یعنی دور عروج اور رسالت مآبؐ کے بعد کے
دور یعنی زوال کو پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ نظم حالی نے مسدس کی ہیئت
میں لکھی ہے لہذا مسدس حالی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن جوش
نے اپنی ان نظموں میں واقعات کربلا کو پیش کرتے ہوئے اپنی قوم
میں وہی عزم و استقلال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مایوس و ہراساں
قوم میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ تو ایسی نظموں کو صرف مسدس

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں از ضمیر اختر نقوی ص ۱۱۱

کہہ کر ٹال دینا ادبی بد دیانتی ہے۔ جبکہ جوش قوم کے شعور کو اس طرح جھنجوڑ رہے ہیں۔

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ　　اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر جھپٹ کر اٹھ　　تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر شخص حسینؑ ابن علیؑ ہو۔

مرثیہ "حسین اور انقلاب" جوش کا مشہور مرثیہ ہے۔ یہ ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا جبکہ تحریک جنگ آزادی اپنی پوری آب و تاب پر تھی۔ اس مرثیے کو سننے کے لئے لکھنؤ کے تمام باذوق لوگ ٹوٹ پڑے۔ اس طرح اس مرثیے نے کافی مقبولیت حاصل کی۔

جوش نے عصری تقاضوں اور فکری موضوعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی۔ ان سے پہلے کسی اور کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ جس طرح ابتدائی دور میں "ادب برائے ادب" کا نظریہ رہا لیکن بعد میں "ادب برائے زندگی" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ بالکل اسی طرح مرثیے میں بھی "مرثیہ برائے رثا" کا رجحان ملتا ہے لیکن جوش نے عصری تقاضوں کے مطابق "مرثیہ برائے اصلاح قوم" کے رجحان کو پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مرثیہ نگاری میں جوش کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ بعد کے لکھنے والے مرثیہ نگاروں نے جوش کے اسی رجحان کو پیش نظر رکھا۔

پیش نظر مقالہ صنفِ مرثیہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ صنفِ سلام کا احاطہ کرتا ہے لیکن جوشؔ کی سلام گوئی تک پہنچنے کے لئے مرثیہ نگاری کو پیش کرنا اس لئے ضروری تھا کہ جوشؔ کی رثائی شاعری کا آغاز ہی صنفِ مرثیہ سے ہوا۔ اور جن وجوہات کی بناء پر صنفِ مرثیہ کو سنبار رنگ و آہنگ دیا وہی وجوہات اور اسباب طرزِ جدید کی سلام گوئی کا باعث ہیں جوشؔ نے اپنے سراپا میں بھی سلام عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک مرثیے کے اختتام پر شہید اعظم امام حسین علیہ السلام کو اس طرح سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اے ذوالفقار حیدرِ کرار السلام　　اے جانشینِ احمدِ مختار السلام
اے بے نیازِ اندک و بسیار السلام　　اے محورِ ثوابت و سیار السلام
اے بے مثال پختگیٔ ہمت السلام
اے آدمی کے ناز الوہیت السلام
اے ربِ افتخار اب و عبد سلام لے　　"فخار سازِ ابیض و اسود سلام لے
اے ذی حیاتِ مبزو معبد سلام لے　　اے عارفِ ضمیرِ محمدؐ سلام لے
ناموسِ انبیاء کے نگہبان السلام
اے رحلِ کائنات کے قرآن السلام

مرثیہ "حسین اور انقلاب" میں چند رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ مندرجہ رباعی زبان زدِ خاص و عام ہے

؎ کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ
عرشِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اس رباعی میں جوشؔ شہید اعظم امام حسین علیہ السلام کی عظمت کو صرف شیعہ قوم تک محدود نہیں بلکہ سارے اقوام میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انسان کا ضمیر جب بیدار ہوگا تمام انسان امام حسینؑ کی عظمت کا اقرار کریں گے اور تمام قومیں حسینؑ کو اپنانے کا دعویٰ کریں گی ایک سلام جس میں جوشؔ امام حسینؑ اور اہلبیتِ پاک کی عظمت و بزرگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی ہر سانس کو مشیتِ الٰہی کے عین مطابق اور انسانیت کے لئے حاصلِ عبادت قرار دیتے ہیں جو حقیقت سے بعید نہیں

سلام

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ — دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کیسا
حشر تک زندہ ہے تیرا نام اے ابنِ رسولؐ — کر چکا ہے تو وہ احسان نوعِ انسانی کے ساتھ
اُن کے آگے صولتِ دنیا کا ذکر اُو ابنِ سعد — کھیلتی ہے جنکی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ
باندھتی ہو کیا ہوا اے اہرمن کی آندھیو — کھیلنا آساں نہیں ہے شمعِ یزدانی کے ساتھ
ہمتِ معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر — یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ
آنکھ میں آنسو ہوں سینوں میں شرارِ زندگی — موجۂ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی — ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ
جوشؔ ہم ادنیٰ غلامانِ علیؑ مرتضیٰ — تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے

جوش نے اکثر مراثی میں سلامِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ بھی سلام پیش کرنے کا ایک نیا انداز ہے

؎ ہاں اے حسین تشنہ و رنج و بحور السلام — اے مہمان عرصۂ بے نور السلام
اے شمع حلقۂ شب عاشور السلام — اے سینۂ حیات کے ناسور السلام
اے ساحل فراءت کے پیاسے ترے نثار
اے آخری نبیؐ کے نواسے ترے نثار

ایک مرثیہ جو "پانی" کے عنوان سے ملتا ہے جو ۵۹ بند پر مشتمل ہے جس کے ۹ بند میں جوش شہید اعظم کے مختلف اوصافِ حمیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے انھیں سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

؎ اے زخم قلب خیر کے مرہم تجھے سلام — اے ناصر پیمبر اعظم تجھے سلام
ہاں اے رسولِ دینِ محرم تجھے سلام — اے حجت شرافتِ آدم تجھے سلام
اے تاجدار ملکِ تحمل سلام لے
اے فخر کے عظیم تموّل سلام لے
اے اقتدار صبر فراواں تجھے سلام — طوفاں شکار کشتیٔ عرفاں تجھے سلام
اے آبروئے چشمۂ حیواں تجھے سلام — اے کردگار عظمت انساں تجھے سلام
ہاں اے گلوئے موت کے خنجر سلام لے
اے پختگیٔ فکرِ پیمبر سلام لے

جوشؔ کے سلام منقبتی انداز رکھتے ہیں جس سے وہ شہید اعظم حضرت امام حسین علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ، عبادت، مشیت الٰہی کی پابندی، معرکہ حق و باطل میں حق کی نمائندگی اور باطل کے مقابلے میں سر جھکانے پر سر کٹانے کو فوقیت دیتے ہیں۔ حق و صداقت پر مبنی یہ پیغام جوشؔ اپنی قوم کو دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ مایوسی کے اس گہرے سمندر سے نکل سکے۔ اس قوم میں سیاسی شعور پیدا ہو اور وہ ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر اپنی کمر باندھ کر تیار ہو جائیں۔ وہ انگریز جیسی فاسق و فاجر قوم کی غلامی میں نہ رہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قوم کا ایک ایک فرد اپنے سینے میں یہی جذبات رکھتا ہو۔

یقیناً نجم ہو کہ جوشؔ ان کے کلام نے قوم کو بہت متاثر کیا۔ اور انھوں نے جس مقصد کے تحت مرثیے ہوں یا سلام لکھے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین "رزم نگاران کربلا" جوشؔ کے بارے انداز فکر سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"اسلامی ادب میں جوشؔ کا یہ فکری ارتقاء قدم بہ قدم بڑھا اور پندرہ بیس سال کے عرصے میں متعدد قومی نظموں کے ذریعہ اس نقطۂ نظر کی وضاحت ہوئی مدعا یہ کہ جوشؔ کی بعض مشہور نظموں مثلاً ذکر سے خطاب اے مرتضیٰ

متولیانِ وقف حسین آباد، آنسو اور تلوار، سوگوارانِ حسین
سے خطاب اے مومنانِ لکھنؤ وغیرہ میں غیرتِ قومی
جذبہ سرفروشی، عزم و ہمت اور اصلاحِ احوال
کا جو درس دیا گیا تھا اس نے بھی اردو مرثیے کے لئے
ایک نئے افق کی نشاندہی کی چنانچہ اب "سلام"
کے اشعار بھی اس انداز سے لکھے جانے لگے۔" ؎۱

سلام

کر چکا سیرِ اصل مرکز ہر اب آنا چاہیئے — اس زمیں پر اک نئی بستی بسانا چاہیئے
پڑ چکے ہیں سینکڑوں روحِ شہادت پر حجاب — مومنو اب ان حجابوں کو اٹھانا چاہیئے
یہ جھجک اچھی نہیں اے سوگوارانِ حسینؑ — باندھ کر سر سے کفن میداں میں آنا چاہیئے
آفریں اے ہمتِ مردانۂ ابنِ رسول — صاحبِ غیرت کو یونہیں موت آنا چاہیئے
کچھ سنا کیا کہہ رہا ہے جوشؔ اکبر کا شباب — مینھ میں تیروں کی جوانی کو نہانا چاہیئے

لہٰذا مندرجہ سلام قوم کے نوجوانوں میں احساسِ بیداری، جوش و جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اشعار کو پڑھنے سے ہی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سلام کن حالات اور کس عہد میں لکھا گیا ہے

؎ آفریں اے ہمتِ مردانۂ ابنِ رسولؐ
صاحبِ غیرت کو یونہی موت آنا چاہیئے۔

مندرجہ شعر میں جوش قوم کی غیرت اور ہمت کو للکار رہے ہیں۔ اور واضح طور پر یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کی غلامی میں رہ کر زندہ رہنا گویا شرمناک زندگی گزارنا ہے۔ اس کے برخلاف قوم کا ہر فرد سر سے کفن باندھ کر ہمت مردانہ اور عزم حسینی لیکر کھڑا ہو جائے تاکہ وہ غلامی کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکے۔ اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائے چاہے اس کے لئے اُسے اپنی جان کی بازی لگانا کیوں نہ پڑے۔

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے" جس کو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کیا ہے اس میں کل نو مرثیے ملتے ہیں۔ تقریباً ہر مرثیہ سے قبل سلام ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے آخری صفحات پر "جوش ملیح آبادی کے سلام" کے عنوان سے کل پانچ سلام ملتے ہیں۔ تمام سلاموں کو پیش کرنا مقالے کی طوالت کا باعث ہوگا۔ لہذا کچھ سلام بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے جوش کے انداز سلام اور مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ جو سلام کے روایتی انداز سے بالکل ہی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے

سلام

طبع میں کیا تیغ براں میں روانی چاہیئے
گل فشانی تا کجا، اب خوں فشانی چاہیئے

لسبتہ زنجیر محکومی خبر بھی ہے تجھے
پھر ومہ پر تجھکو عزم حکمرانی چاہیئے

مرقد شہزادۂ اکبر سے آتی ہے صدا
حق پہ جو مٹ جائے ایسی نوجوانی چاہیئے

عمر فانی سے تو ہر گب کاہ تک ہے بہرہ مند
مرد کو ذوق حیات جاودانی چاہیئے

کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کیلئے
اے عزیزو دین کی کھیتی کو پانی چاہیئے

جن کے سینوں میں ہو سوز تشنگانِ کربلا
ان جواں مردوں کی تلواروں میں پانی چاہیئے

جوشؔ ! ذکرِ عبرادت مولا پہ شیوں کے عوض
رُخ پہ شانِ فخر و نازِ کامرانی چاہیئے ۔

مندرجہ سلام میں بھی جوشؔ قوم کو صدائے حق بلند کرنے کے لئے للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم کے نوجوانوں میں حق پر مر مٹنے کا جوش و جذبہ چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی محقر سی زندگی کو غلامی میں گزار دینا مردِ مومن کا نصب العین نہیں بلکہ ایسے کارنامے انجام دے جس سے اس کی زندگی حیاتِ جاوید بن جائے ۔

اس سلام کا مقطع سلام کے روایتی انداز سے بالکل ہی بغاوت کرتا ہے کیونکہ ۱۹ویں صدی کے آخر تک تو سلام میں رثائی پہلو بھی ملتا ہے جہاں مقدر یقیناً رونا اور رولانا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ فرد اسی مقصد کے تحت تو سلام نہیں لکھے جاتے لیکن دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کی بھی حیثیت ناگزیر ہوتی ہے ۔ تاہم جوشؔ کے ہاں یہ پہلو بالکل ہی نہیں ملتا اور اس کا ملنا تقاضا ناممکن ہے ۔ مراثی میں ہی بین نہیں ملتے تو سلام میں رثائی پہلو کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جس کی باقاعدہ وضاحت جوشؔ یوں کرتے ہیں ۔

۹ جوشؔ ! ذکرِ عبرادتِ مولا پہ شیوں کے عوض
رُخ پہ شانِ فخر و نازِ کامرانی چاہیئے

جدید طرز زیر مبنی سلاموں کے ساتھ جوش کے ہاں خالص منقبتی سلام بھی ملتے ہیں۔

سلام

حسین ابن علی دنیا کو حیراں کر دیا تو نے — سراب تشنگی کو آب حیواں کر دیا تو نے
نظر ڈالی تو ذرّوں کو جواہر میں بدل ڈالا — قدم رکھا تو شعلوں کو گلستاں کر دیا تو نے
رہے گا یہ ترا احساں سر کار مشیت پر — کہ اے ابن علی انساں کو انساں کر دیا تو نے
بنا کر بات پیغمبر کو بھی پیغمبری بخشی — جھڑک کر خون کو پھر قرآں کو قرآں کر دیا تو نے

نظر اٹھتی ہے موئے جوش تو حیرت یہ ہوتی ہے
کہ اس کافر کو اے مولا مسلماں کر دیا تو نے

نجم آفندی کی طرح جوش کا سلام عنوان کے تحت بھی ملتا ہے "سمع ہدایت" کا مطلع اور آخری شعر ملاحظہ ہو۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقص بتان آذری

اٹھ کے ترے دیار میں ہر جبیں کفر کھل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحن حرم میں ابتری

جوش کے کسی سلام کا بھی آغاز لفظ سلام، سلامی یا تحیہ سے نہیں ہوتا طرز جدید کی سلام نگاری میں نجم اور جوش کے معاصر شعراء جعفری نے ان کے طرز سلام کو اپنایا ان میں آل رضا جمیل مظہری، احسان دانش اور ماہر القادری سر فہرست نظر آتے ہیں لہذا ان تمام شعراء کی سلام نگاری کا جائزہ بیسویں صدی کے آئینے میں لینا ضروری ہے

سید آل رضا :۔

سید آل رضا نام اور رضا تخلص کرتے تھے ۱۸۹۶ء میں ضلع اناؤ یوپی میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن سیتا پور تھا۔ یہ شاہ ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آئے اور قصبۂ موہان ضلع اناؤ میں سکونت اختیار کی

سید آل رضا سید محمد رضا کے لڑکے تھے جو ابتدا میں منصفی اور صدر اعلیٰ کے عہدے پر مختلف اضلاع پر متعین رہے۔ بعد ازاں اپنے اپنے عہدے سے ترقی کرکے اودھ چیف کورٹ کی صدارت اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے اور خان بہادر جسٹس سید محمد رضا کہلائے۔ ۱۹۲۸ء میں کورٹ کے اولین پانچ ججوں میں ان کا شمار ہونے لگا ۱۹۳۴ء میں مزید ترقی کی اور سینئر جج کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور کچھ عرصہ بعد اپنی مختصر سی زندگی سے بھی سبکدوش ہوئے۔

سید محمد رضا اپنی ملازمت کے دوران چونکہ کسی ایک جگہ متعین نہ رہے لہذا آل رضا بھی مختلف مقامات پر اپنے والد کے ساتھ رہا کرتے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی ۱۹۰۸ء میں سیتا پور ہائی اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۱۲ء میں انٹرنس پاس کرکے لکھنؤ آئے اور کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۱۶ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے ۱۹۱۸ء میں الہ آباد اسکول میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۰ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی لکھنؤ میں پیشۂ وکالت کا آغاز کیا لیکن ۱۹۲۱ء میں پرتاب گڑھ چلے گئے جہاں سات سال یعنی ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۷ء پریکٹس کرتے رہے۔ پھر لکھنؤ چلے آئے

اور یہاں سکونت اختیار کی اور اپنے مشغلے کو جاری رکھا۔ لیکن ملک کی تقسیم کے بعد اپنے بھائیوں کے بے حد اصرار پر پاکستان ہجرت کر گئے۔ جہاں سے ۲۷ مارچ ۱۹۷۸ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔

رضا نے ستائیس برس کی عمر یعنی ۱۹۲۳ء سے میدان سخن میں قدم رکھا اور صنف غزل سے شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ یہ پرتاب گڑھ میں مقیم تھے بذریعہ خط و کتابت آرزو لکھنوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ بہیثت شاعر پرتاب گڑھ ہی میں مقبولیت حاصل کی۔

چھ سال کے قیام کے بعد جب پرتاب گڑھ سے لکھنؤ آئے تو یہاں بھی شاعری کی محفلیں گرم تھیں۔ آل رضا بھی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ چنانچہ لکھنؤ کی قدیم شعری روایات کے ساتھ ساتھ جدید افکار بھی ان کی شاعری میں داخل ہوئے

چونکہ شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا تھا۔ لہذا غزل کا پہلا مجموعہ "نوائے رضا" ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اور دوسرا مجموعہ غزل معلی ۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ بعد ازاں انھوں نے اپنی تمام تر توجہ صنف مرثیہ پر مرکوز کر دی۔ ۱۹۳۹ء سے مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔

پہلا مرثیہ بیتر بند پر مشتمل ہے آل رضا نے کل بیس مرثیے کہے اور تقریباً تمام مرثیے جو شش کی طرح عنوانات کے تحت ملتے ہیں مرثیہ گوئی کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ دوسرا مرثیہ جس کا مطلع

ہے قافلہ آل محمد کا لٹوٹے سلام چلا

سب سے زیادہ طویل یعنی ۱۷۰ بند پر مشتمل ہے۔ ان کے مراثی لکھنؤ کے "محرم نمبر"

میں سنائع ہوتے رہے ہیں۔ آلِ رضا کا ایک شعر جو کافی مقبولیت رکھتا ہے اور حساس دلوں کے تاروں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے، زبان زدِ خاص وعام ہے

سو کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور بھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

مرثیہ گوئی کے آغاز میں یہ شعر کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مرثیہ گوئی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جنوری ۱۹۳۹ء کو محرم کی چاند رات ہی سے برسات کا آغاز ہوا جو بے فصل تھی۔ جس پر آلِ رضا نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔ جو مرثیہ گوئی کے سلسلے کو برقرار رکھنے کا باعث ہوا۔ جو عام طور پر آلِ رضا کے مراثی مدس کے نام سے مقبول ہوئے۔ یہ مرثیے مدس کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں یہ بحث سرِدست نظرِ مقالے کے لئے بعید از موضوع ثابت نہیں ہوگی کیونکہ صنفِ سلام میں بھی آلِ رضا کے وہی نظریات ملتے ہیں جن کے تحت انھوں نے اپنے مدس لکھے۔ مرثیے اور مدس پر تفصیلی بحث کے لئے اپنے ایم۔فل کے مقالے "حیدرآباد میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد" کے چند سطور درج کئے جاتے ہیں۔

"یہ درست ہے کہ ان میں مرثیوں کا مادہ انداز نہیں ملتا جو روایتی ہے بیشتر عناصر کی جگہ مقصدیت غالب رہتی ہے لیکن مدس کوئی صنف نہیں ہے بلکہ معروضی ہیئت کا نام ہے جبکہ مرثیہ ایک صنف ہے جس کی موضوعی اور معروضی دونوں ہیئت ہوتی ہیں"[1]

مقالہ
[1] حیدرآباد میں اردو مرثیہ، آزادی کے بعد از سیدہ زہرا۔

خود آلِ رضا نے مرثیے اور مسدس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے

ہے اس جگہ مقتضا بیانِ درد بھی ہو　　جہاں ہے نعرۂ حیدرؑ فغانِ درد بھی ہو

جہاں ہے فخر کی باتیں زبانِ درد بھی ہو　　جو ہے حدیثِ وفا داستانِ درد بھی ہو

بیان یوں تو مسدس میں کیا نہیں ہوتا۔

جہاں یہ درد نہ ہو مرثیہ نہیں ہوتا۔

آلِ رضا کی مرثیہ گوئی پر روشنی ڈالنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ ان کی رثائی شاعری کا آغاز صنفِ مرثیہ ہی سے ہوتا ہے اور ان کے زیادہ تر مراثی آزادی کے بعد ملتے ہیں۔ لہٰذا اس مخصوص ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے طرزِ جدید کے سلام گو شعراء آزادی سے قبل تو شہید المظلوم امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و انصار کے واقعاتِ شہادت اور جنگ پیش کر کے مایوس اور پست ہمت مسلمانوں کے حوصلے بڑھاتے۔ عزمِ حسینی سے سبق سیکھنے کی تاکید کرتے حق کے لئے آواز بلند کرنے کی نصیحت کرتے غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے کسی کے آگے سر کو جھکانے کی نہیں بلکہ سر کٹانے کی تعلیم دیتے اس طرح قوم کے حوصلے بلند کئے۔

ادبی تاریخ کے اس پس منظر میں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا المیہ اور اس کے اثرات نے ان جدید رجحان کو مزید تقویت بخشی کیونکہ مہاجرت غریب الوطنی اور ہندوستان میں مظلومیت کے احساس کے زخم کا مرہم اگر کوئی واقعہ ہو سکتا تھا تو وہ سوائے واقعۂ کربلا کے کوئی دوسرا واقعہ نہ تھا۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے کسی بھی علاقے یا پاکستان میں جتنے بھی مراثی لکھے گئے ان میں مندرجہ ذیل احساسات ملتے ہیں۔

جدید رجحان میں فلسفیانہ مسائل کو بھی جگہ دی گئی۔ اب شعراء ان گوشوں کو بھی سامنے لانا چاہتے تھے جن میں ظلم و استبداد سے ٹکرانے کا حوصلہ سیاست کی فریب کاری ضمیر کی خرید و فروخت، فکر و نظر پر اقتدار کے پہرے اور اس طرح کے موضوعات تھے۔ عصری حیثیت اور درسِ عمل وغیرہ زیادہ نمایاں ہے کہ واقعاتِ کربلا کو مشعلِ راہ بنا کر کس طرح ظلمتوں میں چراغ روشن کئے جا سکتے ہیں اور کس طرح اسوۂ حسینی پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

سلام

حسینی صف سے کیا تنویر خونِ ہاشمی نکلی
کبھی شکلِ نبیؐ نکلی کبھی شکلِ علی نکلی

دعائیں دے زمانہ امتزاجِ بوترابی کو
درِ خیبر شکن نانِ جویں کتنی قوی نکلی

یقیں محکم ہے آلِ مصطفےٰؐ کی ناخدائی کا
یہ وہ کشتی نہیں ہے جو کبھی ڈوبی کبھی نکلی

بڑے جلوے دکھائے تابشِ خونِ محمدؐ نے
سیاہی جس جگہ چھائی وہیں سے روشنی نکلی

کیا وہ معرکہ سر ہمتِ شاہِ شہیداں نے
مصیبت عارضی نکلی قیادت دائمی نکلی

افق سے کربلا کے ناصرانِ شاہ یوں چمکے
کہ ہر دم اک نئی طرزِ حسین ابنِ علی نکلی

جہاں تک انفرادی عمرِ فانی کھینچ لائے تھے
وہیں سے اجتماعِ زندگی ہی زندگی نکلی

مسلمانوں نے دلبندِ نبیؐ کو یوں کیا گھائل
دلِ اسلام سے اب تک نہ برچھی کی انی نکلی

چھڑائی جا رہی ہے لاش سے بابا کے وہ بچی
ابھی سلتے ہوئے خیمے سے جو سہمی ہوئی نکلی

رضاؔ کچھ داغِ ماتم لے کے ہم بھی کربلا پہنچے
ارے ان ملگجے پھولوں میں کتنی تازگی نکلی

ایک اور سلام عنوان کے تحت ملتا ہے

سلام تعلیم حسینی

کربلا والے نہیں کرب و بلا آج بھی ہے — مرنا آتا ہو تو جینے کا مزہ آج بھی ہے

مشہد شاہ شہیداں نے سجائے سجدے — کربلا کعبۂ تسلیم و رضا آج بھی ہے

روح تعلیم حسینی نے بنائے انساں — جو ملا حُر کو وہی حسن عطا آج بھی ہے

حق پہ جینے کے لئے صدق پہ مرنے کیلئے — سامنے زندگیٔ آل عبا آج بھی ہے

مشکلیں ہم نے بڑھالیں کہ مسلماں نہ رہے — ورنہ اسلام بڑا عقدہ کشا آج بھی ہے

زندگی وہ کہ جسے موت کبھی چھو نہ سکے — کون لیتا ہے؟ شہادت کا صلا آج بھی ہے

کچھ تو آثار ہدایت کے نظر آتے ہیں — کم نہیں یہ بھی کہ قدر شہدا آج بھی ہے

اتنا پُر زور اٹھا شاہِ شہیداں کا قدم — رہ گیا بن کے جو نقش کفِ پا آج بھی ہے

لے گئے حسنی بلندی پہ شہادت کو حسینؑ — وہی معراج شہادت کا خدا آج بھی ہے

کچھ تعلق ہے رضا آل محمد سے ہمیں — لوگ جلتے ہیں تو کیا! کل جو ہوا آج بھی ہے

مندرجہ سلام چونکہ تعلیم حسینی کے نام سے ملتا ہے لہذا اس سلام میں آل رضا تعلیم حسینی کو عام کرنا چاہتے ہیں لکھتے ہیں کہ کربلا والے آج موجود نہیں لیکن کرب اور بلا دونوں بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ اور جینے کا مزہ اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ راہِ حق میں جان قربان کرنے کا جذبہ انسان میں موجود ہو۔ آل محمدؐ کی زندگی آج کے انسان کے لئے مشعل راہ سے کم نہیں آل رضا قوم کے جوش جذبہ اور ولولے کو للکار کر کہہ رہے ہیں۔

زندگی وہ کہ جسے موت کبھی چھو نہ سکے
کون لیتا ہے؟ شہادت کا صلا آج بھی ہے

آلِ محمدؐ کی ہستیاں آج کے انسان کے لئے مینارۂ نور اور مینارۂ ہدایت ثابت ہوتی ہیں۔ امام حسینؑ نے مرتبۂ شہادت کو جو بلندی اور شہادت عطا کی تھی۔ عصرِ حاضر میں بھی شہادت اسی درجے پر فائز ہے لیکن انسانوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ وہ سچے مسلمان نہ رہے جو شہادت کے اس بلند درجے کو پا سکے اتنی چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود آج بھی واقعہ کربلا کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سلام کو پڑھنے کے بعد ایک مبہم سا خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آلِ رضا بھی جوش کی طرح عصرِ حاضر کے ناموافق حالات کو ایک تازہ کربلا کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں وہ جاں نثاروں کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اک اور سلام "سلامِ آخر" کے عنوان سے ملتا ہے جس کو پڑھ کر دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں جس میں شہدائے کربلا کے علاوہ اہلِ حرم پر گزرے ہوئے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ان پر منفرانہ سلام بھیجا گیا ہے جو شامِ غریباں کی بڑے موثر انداز میں عکاسی کرتا ہے۔ یہ سلام شامِ غریباں کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ نجم آفندی کے سلاموں کی طرح اس سلام کا ہر شعر منفرد معنی نہیں رکھتا بلکہ دو دو یا تین، تین اشعار میں رضا نے مسلسل مضمون باندھا ہے مثنوی کے انداز میں لکھا گیا ہے لیکن آلِ رضا نے اس میں سلام عقیدت پیش کیا ہے لہذا یہ سلام ہی قرار پائے گا۔

سلام آخر

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا — غریب دیتے ہیں پرسہ تمہارے پیاروں کا
سلام ان پہ جھکیں سر تو کھائے جاتی ہے — کٹے سروں پہ اسیری کی خاک آتی ہے
سلام ان پہ جو زینت کشِ اسل ہے — مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
سلام بھیجتے ہیں اپنی شاہزادی پر — کہ جس کو سونپ گئے مرتے وقت گلسرور
مسافرت میں بے بسی یہ دکھلائی — نثار کر دیے بے بس نہ بچ سکا بھائی
اسیر ہو کے جسے شامیوں کے نرغے میں — حسینیت ہے سکھاتا علی کے لہجے میں
سکینہ بی بی تمہارے غلام حاضر ہیں — بجھے جو پیاس تو اشکوں کے جام حاضر ہیں
یہ سن یہ حشر یہ صدمے نئے نئے بی بی — کہاں یہ سہمی ہو خیمے تو جل گئے بی بی
پہاڑ رات بڑی دیر ہے سویرے میں — کہاں ہو شام غریباں کے گھپ اندھیرے میں
زمین گرم، یتیمی کی سختیاں بی بی! — وہ سینہ جس پہ کہ سوتی تھیں اب کہاں بی بی
جناب مادر بے شیر کو بھی سب کا سلام — عجیب وقت ہے کیا دیں تسلیوں کا پیام
ابھی کلیجے میں اک آگ سی لگی ہوگی! — ابھی تو گود کی گرمی نہ کم ہوئی ہوگی
نہیں اندھیرے میں کچھ سوجھتا کہاں ڈھونڈیں — تمہارا چاند کہاں چھپ گیا کہاں ڈھونڈیں
نہ اس طرح کوئی کھیتی ہری بھری اجڑی — تمہاری مانگ نہیں اجڑی ہے کوکھ بھی اجڑی
نہیں لعینوں میں انساں کوئی خدا حافظ — درندے اور یہ بے دار تی خدا حافظ
شریک حق درود سلام پیغمبر — سلام سید لولاک کے لئے گوہر
سلام محسن اسلام بانی حق کو — سلام تم پہ شہیدوں کے بے کفن لاشو
سلام تم پہ رسول و بتول کے پیارو — سلام فخر شہادت کے گرد سیارو

بچے تو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم کا برس ہے
جو چل بسے تو یہ اپنا سلام آخر ہے

بجم آفندی اور جوش ملیح آبادی کے بعد سلام نگاروں کا جو ایک بیت بڑا گروہ پیدا ہو گیا ان میں جمیل مظہری کا بھی شمار ہوتا ہے۔

مظہر امام اپنی تصنیف "جمیل مظہری" میں آپ کی نظم نگاری سے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

"جمیل مظہری کا شمار اردو نظم کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اقبال کے بعد اردو نظم نگاری کے افق پر جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری اختر شیرانی، احسان، ساغر نظامی، روش صدیقی وغیرہ نے اپنی روشنی بکھیری یہ سب جمیل مظہری کے ہم عصر ہیں اور وہ ان اکابر کی صف میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ اپنی فکری صلابت اور فنی پختگی کے اعتبار سے اپنے کئی ہم عصروں میں ممتاز ہیں"[1]

شاعری پر تبصرہ کرنے سے قبل حیات کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

جمیل مظہری :-

سید کاظم علی نام اور جمیل تخلص کرتے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ مظہری استعمال کرنے کی وجہ کچھ خاص نہیں بلکہ دادا سید مظہر حسین مرحوم کے نام کی مناسبت سے مظہری کہلانے لگے آبا و اجداد کا وطن غازی پور (یوپی) تھا۔ لیکن بسلسلۂ معاش

---

[1] جمیل مظہری از مظہر امام ص ۲۷

جد اعلیٰ مولانا سید ریاض الحسن عظیم آباد چلے گئے تھے۔ سید مظہر حسین انھیں کے صاحبزادے تھے جن کی تعلیم و تربیت پٹنہ (عظیم آباد) لکھنو اور میڈابُرج (کلکتہ) میں ہوئی۔ پٹنہ میں سناد عظیم آبادی ان کے ہم جماعت تھے لہذا یہ اپنی تعلیمی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کی بناء پر ریاست حسین آباد کے مدار المہام ہوئے۔

سید مظہر حسین ذوق سخن بھی رکھتے تھے۔ مرزا دبیر سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے۔ جن میں سے ایک خورشید حسین تھے یہی جمیل مظہری کے والد تھے۔ والد بھی شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ خورشید تخلص کیا کرتے تھے۔ چونکہ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا فکر معاش سے بالکل ہی آزاد پر سکون زندگی بسر کیا کرتے تھے لیکن عربی فارسی اور اردو کی بے پناہ قابلیت رکھتے تھے۔ لہذا برادر نسبتی خان بہادر سید احمد علی خان علیم کے مشورے پر محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ عربی، فارسی اور اردو کے استاد کی جگہ قبول کی۔ اسی ملازمت کی خاطر پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ اسی ملازمت کے سلسلے میں موتی ہاری ضلع اور بالآخر مظفر پور میں سکونت اختیار کی۔

جمیل مظہری کے نانھیال کے مکان واقع محل بورہ عظیم آباد میں ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے لیکن اسکول میں داخلے کے سلسلے میں سہولت کی خاطر ان کی سن پیدائش ۱۹۰۵ء لکھائی گئی۔ جو ایک اعتبار سے عام ہو گئی۔

"کاظم علی" ان کا تاریخی نام ہے جس سے ان کا سن ولادت ۱۳۲۱ھ نکلتا ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل سے ہونے کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔

ابتدائی تعلیم حسین آباد اور مظفر پور کے مدارس میں پائی جو کہ اطمینان بخش نہیں تھی۔ بعد ازاں والد خورشید حسین کی ملازمت کے دوران پٹنہ اور موتی ہاری ضلع کے مدارس میں بھی تعلیم پائی۔ بالآخر تالتلہ ہائی اسکول کلکتہ سے میٹرک کا امتحان ۱۹۲۲ء میں درجۂ اول میں کامیاب لیا۔ کالج کی تعلیم بھی کلکتہ ہی میں پائی ۱۹۲۵ء میں آئی۔ اے کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ اور بی۔ اے میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں بنگ پاس کالج کلکتہ سے بی۔ اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ اور کلکتہ یونیورسٹی ہی میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ جس میں ان کا موضوع فارسی ادبیات اور تاریخ اسلام تھا۔ لیکن ناسازی طبع کی بناء پر ۱۹۳۱ء میں درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔

ذوق شاعری ورثے میں ملا تھا۔ دادا چونکہ دبیر کے شاگرد تھے یہی وجہ تھی کہ مرثیے سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔ نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں بھی شعر کہتے۔ چنانچہ جمیل کے والد بھی ابتدائی عمر ہی سے میر انیس کے سلام اور مرثیے منبر پر پڑھتے جس سے ان کے ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں والد کی کہی ہوئی غزلیں بھی مشاعرے میں پڑھنے لگے۔ آہستہ آہستہ والد کی کہی ہوئی غزلوں میں

اپنے دو چار شعر کا اضافہ کرنے لگے اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔
قیام کلکتہ کے دوران ہی جمیل کی شاعری پروان چڑھی۔ جمیل نے
رضا علی وحشت کو اپنا استاد تسلیم کیا جو کلکتہ کالج میں دوران تعلیم
ان کے اردو کے استاد تھے۔ ان ہی کو اپنا استادِ سخن منتخب کی خواہش
کا اظہار خود جمیل نے اس طرح کیا ہے۔

؎ پیچیدہ رسم و راہِ سخن دیکھ کر جمیل
مدت سے آرزو تھی کوئی راہبر ملے
وحشت بھی ہے طریقۂ غالب پہ گامزن
یعنی جنابِ خضر تجھے ہم سفر ملے

تلمیذ کا یہ سلسلہ کچھ عرصے تک چلتا رہا لیکن بعد میں استاد
رضا علی وحشت نے ہی انھیں فارغ الاصلاح قرار دیا۔

جمیل مظہری شاعر کے علاوہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے
ہیں۔ مختلف نثری مضامین رسالہ "حور" "بہار نمبر" میں شائع ہوا کرتے تھے
علاوہ ازیں تصانیف کے دیباچے اور مقدمے بھی لکھا کرتے۔ بحیثیت افسانہ نگار
بھی وہ شہرت رکھتے ہیں۔ سب سے مشہور افسانہ "قرض کی قربان گاہ پر"
ہے جو دو قطعوں پر مشتمل ہے۔ جو بعد میں "شکست و فتح" کے عنوان سے
کتاب کی شکل میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے
تھے چنانچہ اخبار "البند" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔
اخبار "البند" کے بند ہو جانے پر اخبار "عصرِ جدید" میں کالم نویس کی

حیثت سے مشہور ہوئے۔ ان کا قالم "مہملات" کے نام سے شائع ہوتا۔ جو بے انتہا دلچسپ ہوتا۔ جسے ان کے استاد رضا علی وحشت بھی بصد شوق پڑھا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اور کئی اخبار روزآنہ اور ہفتہ وار بھی لکھتے رہے۔ صحافیانہ تحریریں بھی مختلف عنوانات سے شائع ہوتی رہیں۔

۱۹۳۵ء میں کلکتہ میں اردو لٹریری کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میں جمیل مظہری نے مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثت سے فرائض انجام دیئے۔ جس میں ان کا استقبالیہ خطبہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ابھی اردو میں ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس سے قبل ہی جمیل مظہری کے نئے افکار و خیالات پر مبنی خطبہ جس میں انھوں نے "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کے پہلو کو واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ تصور کی جاتی ہے۔ مظہر امام اپنی تصنیف "جمیل مظہری" میں اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ۔

"خطبہ ختم ہونے پر مولانا شوکت علی نے جمیل مظہری کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ خواجہ حسن نظامی نے بڑھ کر اجلاس پر جوش الفاظ میں اس خطبے کی تعریف کی۔ حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں خطبے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جمیل مظہری کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا"[1]

---

[1] جمیل مظہری از مظہر امام ص ۱۷

جمیلؔ ہمہ جہتی صلاحیت رکھتے تھے کانگریس جماعت سے بھی وابستہ تھے لہذا ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے تحت جب سب کو گرفتار کیا جارہا تھا تو گاندھی کے ساتھ یہ بھی گرفتار ہوئے اور دو ماہ بعد چھوڑ دیے گئے اس کے علاوہ جمیل مظہری فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ جہاں وہ فلمی گیت اور مکالمے لکھا کرتے تھے آخر میں محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوئے پٹنہ کالج میں شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء پٹنہ میں اسی سرکاری ملازمت پر فائز رہے اسی ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں شعبہ اردو کے لئے منتخب کیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمشن اسکیم سے رجسٹرڈ فیلوشپ ملی جس سے یہ ۱۹۶۹ء تک فیض یاب ہوتے رہے پھر خصوصی لکچرر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں درس دیتے رہے۔ خرابی صحت کے باعث ۱۹۷۴ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور ۱۹۸۰ء کو اس دار فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

جمیل مظہری نے اپنی کئی تصانیف چھوڑی ہیں جس میں نثر و نظم دونوں شامل ہیں۔ پہلی نثری تصنیف ۱۹۵۰ء میں اور شعری مجموعہ ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آچکا تھا۔
"عرفان جمیل" سلام، مراثی اور قصائد کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر صفدر حسین نے مرتب کیا۔

علاوہ ازیں جمیل مظہری کے مرثیے ہلال نے بھی مرتب کئے۔ جمیل کے مرثیوں سے متعلق مظہر امام تحریر کرتے ہیں

"ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے میں جدید سیاسی شعور، عصری حسیت، فلسفیانہ رنگ و آہنگ اور تحلیل نفسی کے جدید عناصر شامل کئے" [1]

مندرجہ بالا اقتباس اس لئے قلمبند کیا گیا کہ ان عناصر کا اطلاق صنف سلام پر بھی ہوتا ہے جس میں جمیل نے آل رضا اور جوش کی طرح لوحوں اور بین پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ شہدائے کربلا کی ایثار و قربانی کے جذبے کو پیش کیا۔ حق و صداقت کے اصولوں کے آگے جان کی بازی لگا دینے کے جذبے کو اپنے سلاموں میں پیش کرتے ہیں۔

مندرجہ سلام خالص منقبتی انداز رکھتا ہے جس میں یہ سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کے قدم نہیں پہنچے۔ وہاں بیدار آنے کا بھی تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا غم حسین کو انسانیت کی معراج قرار دیتے ہیں اور اس غم کو ہر غم کا مداوا قرار دیتے ہیں۔

سلام

ہوائیں نالہ کش نہ ہوں گلوں کی آنکھ نم نہ ہو — وہاں بیدار آئے کیا جہاں ترا قدم نہ ہو۔
حسینؑ ہی حسینؑ ہیں حرم سے تا بہ کربلا — نہیں تو کربلا نہ ہو عرب نہ ہو عجم نہ ہو

---

[1] جمیل مظہری از مظہر امام ص ۷۳

وہ دل ہے جس میں عشق ہو دلِ حسینؑ کی قسم — سرِ حسینؑ کی قسم وہی ہے سر جو خم نہ ہو
نبیؐ کے دل کا چین بھی علی کا نورِ عین بھی — نگاہِ دہر میں بھلا حسین محترم نہ ہو
بشر وہ شر ہے سر بہ سر کہے گا کون ایسے بشر — شہادتِ حسین پر بھی آنکھ جس کی نم نہ ہو
یہ دردِ جانِ جاں رہے سدا یونہی جواں رہے — خدا کرے کہ دردِ دل تمام عمر کم نہ ہو
یہ آئی عرش سے ندا کہ اے بلاکشِ وفا — غمِ حسینؑ کے سوا جہاں میں تجھ کو غم نہ ہو

جمیل مظہری کے اندازِ بیان سے متعلق حقیقت تو یہ ہے کہ مراثی میں میر انیس کے اندازِ فکر اور آہنگ سے زیادہ غالب کا اندازِ فکر اور آہنگ پایا جاتا ہے کیونکہ جمیل کی والدہ غالب کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جمیل مظہری کے مراثی جوش سے بھی زیادہ متاثر کن ثابت ہوئے بہر حال مظہر امام لکھتے ہیں۔

"مرثیے میں جمیل مظہری کی آواز اس دور کی سب سے نمایاں آواز ہے انھوں نے سانحہ کربلا کو کسی مسلک اور عقیدے سے وابستہ نہیں کیا اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ایسے غیر ضروری مکالمے اور غلو سے پاک رکھا انسانی نفسیات کی مصوری کردار نگاری میں جزئیات پر نظر، بیانِ واقعہ میں احساس کی شدت مظاہرِ حیات کے اسرار اور رموز پر معنی خیز

تبصرے، بیسویں صدی کی اقلیت پسندی کا زائیدہ

جدید طرز احساس، بیان کی سادگی اور نزاکت

جمیل مظہری کے مرثیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں [1]

جمیل مظہری کے شعری مجموعے "عرفانِ جمیل" کے مکمل دو ایڈیشن ہیں۔
جن میں سے ایک مراثی اور قصائد پر مشتمل ہے اور دوسرا، مراثی، قصائد
اور سلام پر مشتمل ہے یہ ۱۹۶۹ء میں بارگاہِ ادب لاہور سے شائع ہوا ہے
اسی ایڈیشن میں مراثی سے قبل دو سلام ملتے ہیں۔

مرثیہ ۔ کھولا عروسِ شب نے جو زلفِ دراز کو

اس سے قبل مندرجہ سلام ملتا ہے

سلام

حیف وہ آنکھ جو فیاض ذرا بھی نہ ہوئی ۔ گہر افشاں بمزارِ شہدا بھی نہ ہوئی

اللہ اللہ خمِ غازی کی چمکتی تلوار فرس الیاکہ حریف اس کی صدا بھی نہ ہوئی

غش سے چونکے جو دمِ ظہر تو عابد نے کہا قافلہ بڑھ گیا آوازِ درا بھی نہ ہوئی

حاصلِ طاقتِ کونین ہے بیشک وہ نماز جو ادا بھی نہ ہوئی اور قضا بھی نہ ہوئی

آپ کی روح پہ یا حضرتِ زینبؑ ہو سلام بیکسی آپ کی ممنونِ ردا بھی نہ ہوئی

حیف اس قوم پہ غافل جو رہی حق سے جمیل
قتلِ مظلوم سے بیداد ذرا بھی نہ ہوئی ۔ [2]

---

[1] جمیل مظہری از مظہر امام

[2] عروسِ ادب جمیل از جمیل مظہری ص ۶۲

مندرجہ سلام غزل کی ہیئت میں ہے اور ثنائی و منقبتی انداز رکھتا ہے ایک اور سلام جو مرثیہ شام غریباں سے قبل ملتا ہے اس میں شاعر امام مظلوم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ نواسۂ رسول ہونے کی بنا پر امام مظلوم کو دنیا نے پہچانا لیکن پہچاننے کا حق ادا نہیں کیا۔

سلام

تجھے مظلوم ہر بینا و نابینا نے پہچانا — جو تھا پہچاننے کا حق وہ کب دنیا نے پہچانا

مفادوں کا تکدر تھا مخالف ساری امت سے — مگر تیور کو اس کے سید بطحا نے پہچانا

امام کی جو منزل تھی سمجھ میں آگئی سب کے — شہادت کا جو مقصد تھا وہ کب دنیا نے پہچانا

سنا تکبیر کا غل سر سے سنانے تک ڈھلک آئی — ہوا کارِ رفع ردائے ثانیٔ زہرا نے پہچانا

ادائے فرض پر دیتے ہو تم بھی تہنیت اصغر — تمہارے اس تبسم کو لب دریا نے پہچانا

جب اس کی منفعل آنکھیں بھی تم تک آ نہیں سکتی
جمیل اللہ اکبر تک مجھے دنیا نے پہچانا [1]

دورِ جدید کے سلام گو شعراء کی فہرست اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک اس میں احسان دانش اور ماہر القادری کا تذکرہ نہ ہو۔

احسان دانش چونکہ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا منیر احمد منیر نقوی کی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" میں لاہور میں مرثیہ نگاری اور عزاداری کے تحت لکھتے ہیں۔

---

[1] عرفان جمیل از جمیل مظہری ص ۱۲۱

"لاہور میں عزاداری کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری
سلام و قصیدہ نگاری کو بھی فروغ ~~فروغ~~ ہوا" [1]

آگے شعراء سے متعلق لکھتے ہیں

"لاہور کے شعراء نے بے شمار سلام اور نظمیں
امام حسین کی شان میں لکھی ہیں۔ لیکن وہ ہمارے
موضوع سے الگ ہیں۔ ایسی موضوع پر ایک الگ
کتاب کی ضرورت ہے۔ لاہور کے ممتاز شاعروں
میں احسان دانش، احمد ندیم قاسمی اور
قتیل شفائی نے بہت سے سلام امام حسینؑ
کے حضور میں پیش کئے ہیں" [2]

احسان دانش :-

احسان الحق نام احسان دانش کے نام سے شہرت پانے کا سبب یہ تھا کہ قاضی دانش علی کے لڑکے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں ضلع مظفر نگر میں بمقام کاندھلہ پیدا ہوئے۔ باغپت ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا کشمکش زندگی میں مبتلا رہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم بھی مکمل نہ ہو سکی۔ مصائب و آلام اور معاشی حالات کی ابتری کے باعث زندگی سے مایوس نہ ہوئے بلکہ جدوجہد زندگی میں اسطرح مصروف ہوئے کہ اپنے سخت ترین اور کڑے تجربات کا اپنے کلام کو ترجمان بنایا۔ غریب اور مزدور پیشہ طبقات کی کیفیت کو بڑے موثر اور عبرتناک

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں از ضمیر اختر نقوی ص ۴۵۹
[2] " " " " "

انداز میں بیان کیا ہے۔ واقعات چونکہ حقیقت پر مبنی ہیں لہذا کلام میں مبالغہ آرائی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

احسان کی شاعری کا آغاز سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکات کے وقت ہوا۔ اور ان ہی حالات میں ان کی شاعری پروان چڑھی۔

نئی شعری اور ادبی تحریکات کو مقبول بنانے میں احسان دانش نے بھی حصہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود ہیئت کے اعتبار سے شاعری کی جدید صنف "آزاد نظم" میں ان کا کلام نہیں ملتا۔ وہی قدیم دبستان کی پیروی کرتے ہیں

احسان کی شاعری نہ صرف آپ بیتی ہے بلکہ جگ بیتی بھی۔ انقلاب پسند شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں عوامی شاعر بھی کہا جا سکتا ہے عوامی شاعر کے نام کے ساتھ ہی نظیر اکبر آبادی کا تصور ذہن پر ابھرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر گزرے ہیں۔ لیکن وہ انقلاب پسند نہ تھے۔ احسان دانش پہلے عوامی شاعر ہیں جن کے کلام میں انقلابی رنگ ملتا ہے

احسان کے مجموعے "نوائے کارگر" "چراغاں" "آتشِ خاموش" اور "جادۂ نو" کے عنوان سے ملتے ہیں۔ مجموعہ "جادہ نو" میں مکتبہ دانش کا بیان ہے

"احسان وہی شاعری کرتا ہے جس کی ملک اور قوم کو ضرورت ہے اس کے کلام کی داد تھرتھراتے ہونٹوں ہر مستی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آوازوں سے ملتی ہے"[1]

---

[1] جادۂ نو احسان دانش (بیان) مکتبہ دانش لاہور ص ا

عظیم الحق جنیدی احسان دانش کی کم علمی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"تعلیم کی کمی نے ان کے خیالات میں بلندی اور
گہرائی نہیں پیدا ہونے دی"[1]

جبکہ "جادہ نو" میں "پیمانۂ ادب" کے عنوان سے احسان کی شاعری کی خصوصیات بتلاتے ہوئے سید مسیح الحسن بقاء نقوی رکن انجمن تعمیر ادب لاہور ۱۹۴۰ء میں لکھتے ہیں۔

"وہی شاعر مخلص، راست گو، خوددار اور
بے نیاز ہوتا ہے اور اس کی شاعری کی بنیاد
آمد سے اٹھتی ہے اور کسبی یا پیشہ ور شاعر خود
کتنا ہی لکھا پڑھا کیوں نہ ہو ضمیر فروش، خوشامدی
کینہ پرور اور خود نما ہوتا ہے"[2]

راقمۃ الحروف کے ہاں مسیح الحسین بقاء کا یہ نظریہ صد فی صد سچائی پر مشتمل نہیں کیونکہ مخلص اور پیشہ ور شاعر کا تقابل تو اپنی جگہ حق بجانب ہے لیکن تعلیم یافتہ شاعر کا ضمیر فروش، خوشامدی، کینہ پرور اور خود نما ہونا نامکمل سی بات ہے۔ یہ گویا علم کی توہین ہے تعلیم یافتہ پیشہ ور شاعر میں بیک وقت ان تمام برائیوں کا پایا جانا ناممکن ہے۔

دور جدید کے شاعر ہونے کے سبب احسان کے سلام میں بھی وہ روایتی انداز نہیں ملتا بلکہ یہ مجاہد کربلا حضرت امام حسینؑ کے جذبۂ شوق شہادت

---

[1] اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ص ۱۵۲

[2] جادۂ نو (مقدمہ) — سید مسیح الحسن بقانقوی — ص ۱۱